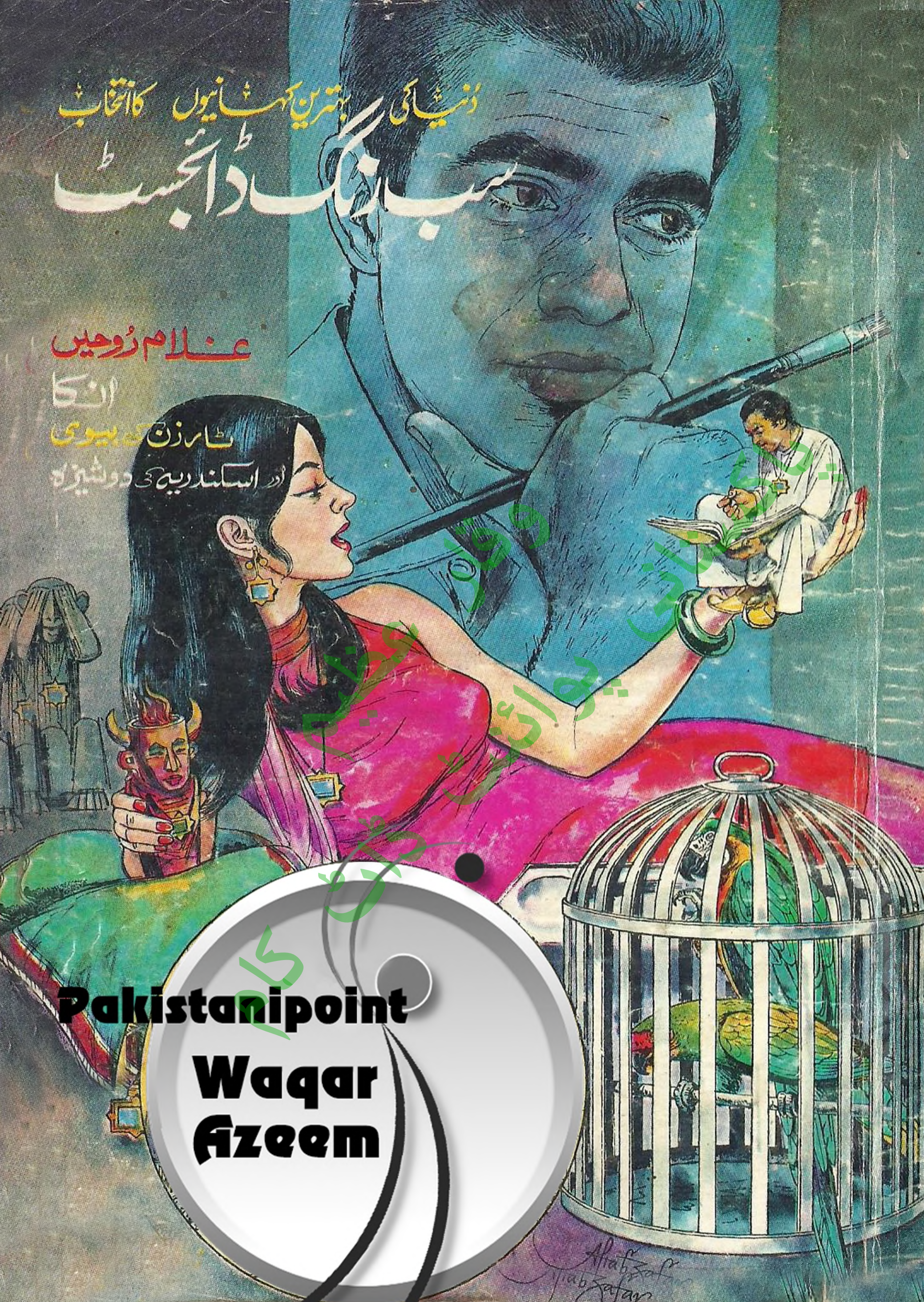


دنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب
سب رنگ ڈائجسٹ
غلام روحیں
انکا
ٹارزن کی بیوی
اور اسکندریہ کی دوشیزہ
Pakistanipoint
Waqar
Azeem

سفید سیاہ





اس ماہ کی خاص کہانی
جو اعلیٰ درجے کی کہانیاں پڑھنے کا فن جانتے ہیں کچھ وہی اسے محسوس کرسکیں گے۔
سب سے مشکل کام
تفسیر فاروقی

شمارہ : ۸ قیمت فی پرچا : ۱/۷۵ روپے
جلد : ۲ زرسالانہ : پندرہ روپے
اگست ۱۹۷۱ء

سرورق : پاکستان آرٹ انسٹیٹیوٹ

پبلشر شکیل عادل زادہ نے قاسم نورانی کے اہتمام میں پاکستان ہیرالڈ پریس میکلوڈ روڈ کراچی سے چھپوا کر ۵-سی ۱۳/۴ ناظم آباد کراچی ۱۸ سے شائع کیا

ایلیٹ پبلشرز لمیٹڈ
سرورق : ایس۔آئی۔ٹی۔ای کراچی

بزنس ایڈریس : ۴۷-۴۸ پریس چیمبرز آئی۔آئی چندریگر روڈ۔ کراچی فون ۲۲۵۸۴۴

ذیلی دفاتر : لطیف ہاؤس۔ کرشن پورہ۔ پشاور



ہر دن نیا دن ہوتا ہے اور مادی ارتقا کے لحاظ سے ہر نیا دن بدلا ہوا دن ہوتا ہے۔ جو کل تھا وہ کل نہیں ہوگا۔ جو آج ہے وہ بس آج کے لئے ہے۔ اب ہر لمحہ نئی فضا میں سانس لیتا ہے۔ سکون و سکوت کے دن ہزاروں سال پہلے ہم سے جُدا ہو گئے تھے اور پتا نہیں کہ جمود و تعطّل کا یہ زمانہ کتنے قرنوں کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ جو تخمینے لگائے گئے ہیں ان کی سند نامعتبر ہے مگر جب سے انسانوں نے خود کو زندہ رکھنے اور زیادہ محفوظ رہنے کا کوئی راز اتفاقی طور پر پا لیا اس وقت سے ہر دن بدلا ہوا دن ہونے لگا ــــــ اور پھر انسانوں نے اپنا حُلیہ بھی تیزی سے بدلنا شروع کر دیا یا وہ تغیر پر مجبور کر دیئے گئے۔ وہ راز حرکت کا پیش خیمہ بنا اور حرکت سببِ تغیر ٹھہری۔ اور تغیر کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب حرکت کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے ــــــ اور تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

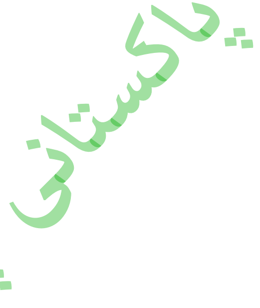
کون اسے روک سکتا ہے اور کون ہے جو تبدیل ہونے کے لازمی عمل سے رُوگردانی کر سکے ــــــ انسان خود کیا ہے؟ اگر اس سے لباس، اشیاء، مکان اور ہتھیار چھین لئے جائیں تو اسے دوسری انواع سے ممتاز کرنا مشکل ہو جائیگا۔ ہر شخص اپنے عہد سے عبارت ہے۔ ہر شخص اپنے دَور میں سانس لیتا ہے ــــــ عہد آگے بڑھ جائے گا تو انسانوں کو اس کے ساتھ قدم ملانا ہوگا۔ جو لوگ اس کارواں کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہوں گے وہ مر جائیں گے ــــــ ہر وہ تہذیب جو خود میں رَچ بس گئی ہو۔ اس کی عظمتیں بعد کو کہانیوں کی شکل میں بیان ہوتی ہیں۔ تہذیب کے شدید رچاؤ کا عمل سماجی حرکت پذیری میں رخنے ڈالتا ہے۔ جو لوگ اپنے سماجی خول میں سرمست و شاداں رہے اور اپنی قدروں کے نشے میں مبتلا ہو گئے ــــــ وہ کھنڈروں میں بدل گئے اور شکستہ ایوانوں میں آنے والی نسلوں نے ان کی عظمت کو زیرِ لب مسکراتے ہوئے تلاش کیا۔

ان قدروں پر اصرار کیوں۔ جنکی سرشت بدل جانا ہے اور جن کے جبر سے مَفر ممکن نہیں۔ قدروں کی خُو میں روز بہ روز ہرجائی پن بڑھ رہا ہے اور یوں بھی اُنکے خمیر میں بے وفائی ہے ــــــ کہ وہ اپنے خارج کے اشاروں سے مشروط ہیں۔ اُن سے محبتیں اور عقیدتیں کرتے رہیے گا تو دوسرے آگے نکل جائیں گے۔ سب کچھ تبدیل ہوا جاتا ہے۔ اس پر آہیں بھرنے اور گریہ کرنے سے اُن منطقی مراحل کو متاثر کرنا ممکن نہیں، جو نئے دَور کا لازمہ ہیں۔

ہر نئی دریافت اور ہر نئی ایجاد قدروں کے ایک مربوط سلسلے پر اثر انداز ہوتی ہے اور اسے توڑ مروڑ کر رکھ دیتی ہے۔ گھر میں پو نئی تصویروں کا اہتمام ہو جاتے تو ایک سلسلۂ اقدار اس سے متاثر ہوتا ہے۔ جو باتیں کبھی نہ سُنی گئیں اور کبھی نہ دیکھی گئیں وہ ہماری بصارت کو گناہگار کرتی ہیں، ہمارا خون جلاتی ہیں اور ہمیں عذاب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ ہو سکے تو ان ایجادوں کا داخلہ اپنے گھر میں بند کر دیجیے مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ اب آپ کو بہر طور اپنے گروہ سے علیحدہ رہنا ہے اور یہ کام مِن حیث المجموع کوئی قوم کرے تو اسے دوسری قوم سے جُدا رہنا ہے۔

کیا ہر نئی قدر بُرائی کی طرف لے جاتی ہے؟ کیا جو ہے اُسے وہیں ٹھہر جانا چاہیئے؟ تیز رفتاری اور حرکت کا یہ عمل انسانوں کو محض نقصان پہنچانے کے لئے ہے؟ ان سوالوں کا جواب اگر اثبات میں ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ قوتِ تغیّر بے لگام ہو گئی ہے۔ کوئی دلیل اس کے آڑے نہیں آسکتی۔ اس طوفان کو روکنا مشکل ہے اور ہم فکر کے اس انداز ہی کے خلاف ہیں۔ ہم حرکتوں کے ساتھ حرکت کرنے اور حیات کے بڑھتے ہوئے کارواں سے قدم ملانے میں پناہ اور آسودگی محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد لباس کی کوئی مخصوص وضع قطع اختیار کئے ہوئے تھے۔ تو ہوں گے، وہ لوگ تو مر گئے اور اُن کے ساتھ اُن کا عہد بھی مر گیا ــــــ کون سا عہد درست تھا اور کون راستی پر تھا۔ کل اچھا تھا آج بُرا ہے، آج اچھا ہے کل بُرا تھا اس پر غور کرنے کی مُہلت کسے ہے۔ ارتقا کے معنی اچھائی یا برائی کی سمت آگے بڑھنے کے نہیں۔ ترقی کا اصل مفہوم کیا ہے؟ کسی کو نہیں معلوم۔ اشیاء و افکار میں اضافہ ترقی ہے، یہ اضافہ انسانوں کی تن آسانی اور آسودگی کے لئے ہے تو نئی بات، نئے لہجے، نئے اطوار اور نئی قدروں کے سلسلے میں اکراہ بے معنی ہے اور نقصان دہ ہے۔

جو ہم نے نہیں سیکھا وہ سیکھنا چاہیئے۔ جو ہم نے نہیں جانا اُسے جاننا چاہیئے۔ عزّت و عظمت کے ساتھ رہنا ہے تو اس دور میں عزّت و عظمت کے تمام اسباب کے ساتھ رہنا ہوگا۔ نئے دور کے ساتھ رہنا ہوگا۔ لباس میں ترمیم بھی ہوگی اور عادتیں بھی بدلنا پڑیں گی۔ رویّوں پر سوچنا ہوگا۔ اجنبی قدروں کو گلے لگانا اور قدیم روایتوں کو دُھتکار کر خود سے علیحدہ کرنا ہوگا۔ جدید وضع اختیار کر کے اندر کا فرد نہیں بدلتا اور بدلتا ہے تو سب کو بدل جانا چاہیئے۔ وہ لوگ جنہیں تغیر قبول نہیں وہی اس عدمِ توازن اور کشمکش کا سبب بنتے ہیں اگر وہ کسی امتناع اور جھجک کے بغیر نئی فضا کا خیر مقدم کریں تو پھر ایک بدلا ہوا ــــــ ہمہ سمت بدلا ہوا سماج وجود میں آجائے گا۔ پھر نہ کوئی ثقافتی خلیج پیدا ہوگی اور نہ اُس کے اعصابی امراض پھیل پائیں گے۔ آنے والا زمانہ ہر لمحہ بدلتی ہوئی ــــــ اجنبی قدروں کا زمانہ ہوگا۔ جس نے ترمیم نہیں کی اور اپنے ارد گرد دیوار تعمیر کر لی وہ محفوظ چار دیواری خود اس کے لئے زندان بن جائے گی۔



ذاتی صفحہ

تیس دن کی دُوری ختم ہوئی۔

اب مجھے اپنے قریب محسوس کیجئے۔ میرے اوپر جو گزری۔ اس کا احوال سُنئے۔ یہ آپ کے نام میرا بیسواں محبت نامہ ہے۔ عشق کا مل میں بیس کیا، ان گنت محبت ناموں اور امتحانوں کی ضرورت پڑتی ہے مگر ساری بات شدتِ احساس کی ہے۔ یہ اُسی شدت کا کرشمہ ہے کہ میں نے بیس ماہ میں اپنے اردگرد پروانوں کا ایک ہجوم اکٹھا کر لیا۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہوں گا۔ میری بات کی صداقت میں وہ ڈرائنگ روم، وہ بسیں، وہ بازار اور وہ گلیاں ہیں جہاں سب رنگ کا جلوہ عام ہے۔ بیس مہینوں میں کیا انقلاب آیا۔ میرے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا۔ کہاں کہاں میں رُسوا نہ ہوا۔ لوگ میرا انتظار کرتے ہیں۔ میں کہ جو سب رنگ ہوں۔ میں کہ جو ایک محبوبہ ہوں۔ جس کی محبتیں سب کے لئے ہیں اور جو محبت میں اشتراک کی قائل ہے۔ ایک صاحب نے مس سب رنگ شکیل عادل زادہ کے نام سے ایک دلچسپ خط لکھا ہے۔ اب بتایئے۔ میرے اندر محبوبیت کیوں نہ پیدا ہو اور میں اپنے اس خوبصورت جذبے کی سیرابی کے لئے اپنے اندر اور کشش اور دلکشیاں سمونے کی جستجو کیسے نہ کروں۔ قربتیں میری داد ہیں اور قربتوں کا بے پناہ اظہار ہو رہا ہے جو میرے احساس میں تازگی اور میرے جذبوں میں توانائی کا سبب ہیں۔ سچ پوچھئے تو میں دوہرا لطف اٹھا رہا ہوں۔ میں کہ ایک محبوب ہوں۔ ماہ جبینوں کی نظر فرحت اثر کی سعادتیں مجھے حاصل ہیں۔ میں جو ایک محبوبہ ہوں۔ اضطراب و اشتیاق کی نگاہیں میرے ہمراہ چلتی ہیں۔ میں جو سب رنگ ہوں۔ میرا نام شکیل عادل زادہ ہے۔ میں جو شکیل عادل زادہ ہوں۔ میرا نام سب رنگ ہے ——

مگر دوستو —— یہ بہت مشقت کا اور بڑا صبر آزما کام ہے۔ عشق کرنا آسان نہیں اور کر کے نبھانا اور مشکل ہے۔ اس ماہ اپنی جلوہ نمائی کے لئے میں کیسے کیسے مصائب سے دوچار ہوا۔ میں بتاتا ہوں۔ پانچ تاریخ تک میں باہر سے آتے ہوتے مسودوں کو پڑھتا رہا اور ایک بھی چیز کام کی نہ نکلی۔ عموماً ان تاریخوں تک پرچے کا بڑا حصہ ترتیب پا جاتا ہے —— کاتبین کرام ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ ایسے موقعوں پر انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے یہ خوش نویس میری نوجوان لڑکیاں ہیں۔ جن کی شادی کا مجھ پر بوجھ ہے اور انہیں دیکھ دیکھ کر میری پیشانی سمٹ جاتی ہے —— ادھر مجھے گلے کی خراشوں نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ اُدھر ہمارے بھائی انوار صدیقی کا بچہ ڈپتھیریا میں مبتلا ہو گیا۔ اُسے وبائی امراض کے ماہر ڈاکٹروں نے موت کے منہ سے معجزاتی طور پر بچایا —— میرے دفتر کا ہر آدمی ایک ایک کر کے غائب اور بیمار ہوا۔ رسالے اور اخبار کا کام عجیب ہے۔ آپ کے گھر جنازہ رکھا ہو۔ تب بھی وقت پر پرچا شائع کرنا لازم ہے ——

میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ سب رنگ میں معجزے رونما ہوتے ہیں —— پھر اچانک میرے عزیزوں نے میرے لئے کہانیاں لکھنا اور مجھے بھیجنا شروع کر دیں اور کہانیوں کا اس قدر اجتماع ہوا کہ میرے لئے انہیں پڑھنا اور منتخب کرنا مشکل ہو گیا۔ میں نے سمجھا مجھے کوئی امتحان دینا ہے۔ میں راتوں کو جاگتا رہا اور مسودے اس طرح پڑھے گئے جس طرح نصابی کتابیں۔ میں نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ دفتر میں یوں بھی کوئی کام نہیں ہوتا۔ سب رنگ کی اشاعت بڑھنے کے ساتھ ساتھ مشتاقانِ دید کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ سو میں نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ دفتر سے غائب رہو اور جب تک پرچے کا کام مکمل نہ ہو جائے اپنی صورت کسی کو نہ دکھاؤ کہ یہ ساری آبرو تو پرچے سے ہے۔ اس ترکیب سے فائدہ یہ ہوا کہ وقت پر پرچا شائع ہو گیا اور آخر میں کئی عمدہ کتابت شدہ کہانیاں بچ گئیں۔ اب اس شمارے میں ہر کہانی دلچسپ اور سب رنگ کے منفرد انتخاب کے مطابق ہے۔ الیاس سیتا پوری صاحب کا کہنا ہے کہ ہر پرچا کہانیوں کے اعتبار سے بڑھا ہوا ہوتا ہے اور ہر شمارہ بھی اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوتے ہے۔

اب تو قائل ہو جائیں یارانِ خوش طریقت۔ میری نیت کے خلوص اور میرے عشق صادق کے باب میں اب بھی کوئی کسر باقی ہے۔

مجھے اپنے اُن قارئین سے معذرت کرنا ہے جنہیں گزشتہ مہینے صفحات بے ترتیب ہونے کی وجہ سے بڑی زحمت اور کوفت اٹھانا پڑی۔ بہت سی جگہوں سے خط آئے کہ انہیں صفحات کی غلط ترتیب والا پرچا ملا۔ بڑی اشاعت میں اس قسم کی غلطیاں گاہے گاہے ہو جاتی ہیں۔ مگر اس مرتبہ یہ کام، معلوم ہوتا ہے بڑے اہتمام سے کیا گیا۔ سونا گھاٹ کے پجاری کی آخری قسط والے صفحات ہی غائب کر دیئے گئے۔ ایک اندازے کے مطابق دو ڈھائی ہزار کاپیاں اس خامی سے آلودہ کی گئیں۔ بظاہر اس کا سبب بائنڈر حضرات کی لاپروائی اور غیر ذمہ داری ہے —— لیکن یہ بات دل کو نہیں لگتی۔ شاید کسی نے میری محنت اور ضبط کی پھر آزمائش کی ہو —— نہ جانے کتنی اذیتوں کا سودا کر کے سب رنگ نے اپنے لئے کوئی جگہ بنائی ہے۔ بُری نظر رکھنے والے لوگ اب یہاں تک اُتر آئے ہیں —— بہرحال اس صورت حال سے نجات پانے کے لئے کچھ اقدام کرلئے گئے ہیں۔ ارادہ تھا کہ وہ کاپی جو گزشتہ شمارے میں لگنے سے رہ گئی ہے اُسے دوبارہ شائع کیا جائے اور اس شمارے کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ مگر نیوز پرنٹ کی کمیابی کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ میری گزارش ہے کہ جن حضرات کو غلط کاپیاں مل گئی ہیں وہ ایک زحمت اور کریں۔ مجھے خط لکھیں۔ میں انہیں مطلوبہ کاپی فراہم کروں گا۔ اب اس کی تلافی کی ایک یہی صورت ہے۔

گزشتہ مہینے ایک اور چوک ہو گئی۔ گولکنڈا کے طلسم میں سنہ ۱۶۸۶ء کے بجائے سنہ ۱۸۶۶ء شائع ہو گیا۔ کئی حضرات نے اس اہم غلطی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ غلطی میری اور ان تمام پروف ریڈروں (جنہیں اُردو میں 'عیب جو' کہتا ہوں) کی تھی جو تاریخ کے اہم حصے سے سرسری گزر گئے —— رہا اس واقعے کی صحت کا معاملہ تو عرض ہے کہ یہ سارا واقعہ محی الدین قادری زور مرحوم کی مستند کتاب سیرِ گولکنڈا سے لیا گیا تھا۔

ٹیپو عزیز اللہ نے اس کتاب میں شائع شدہ مختلف واقعات کے خلاصے کا کام کیا ہے —— اپنی طرف سے انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ کسی اور پہلو سے کسی صاحب نے گولکنڈا کے اس واقعے سے متعلق کچھ لکھا تو اسے ضرور شائع کیا جائے گا۔

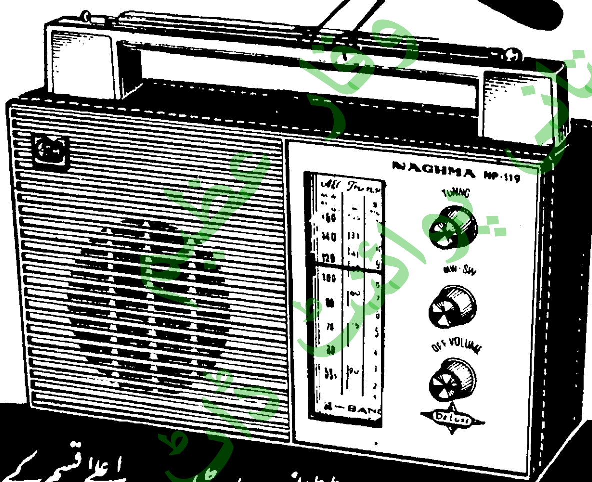
ایک بات نہ رہ جائے۔ ایک صاحبہ نے اپنے خط میں سب رنگ سے بڑی گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے انہیں دو سطریں جواب میں لکھ دی جائیں تاکہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اُن کے والہانہ جذبے مجھ تک منتقل ہو گئے یا نہیں —— میں اس صفحے کے ذریعے انہیں مطلع کر رہا ہوں کہ ان کے "احساس" میرے دل میں اتر گئے ہیں اور میں خود کو بہت سرشار محسوس کر رہا ہوں۔

بے تکلفی کی باتیں ختم کرتا ہوں۔ آگے بڑھئے اور لوگوں پر کیا کیا عالم گزرے ہیں۔ کیسے کیسے تجربے ہوئے ہیں۔ انہیں پڑھئے —— اور قلب و نظر کو مطمئن کیجئے۔

آپ کا

شکیل عادل زادہ

صاف اور سُریلی آواز کے لئے






الیاس سیتاپوری

مصر کے خلفائے بنو فاطمہ کے آخری نوجوان حکمران العاضد نے جب یہ محسوس کیا کہ مصری بساطِ سیاست کے سب سے بڑے شاطر شاور نے اپنے جملہ حریفوں کو شکست دے دی ہے تو اس کے لئے اب اس کے سوا کوئی اور راہ نہ تھی کہ بجبر و کراہ شاور کو وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے بہ وجہ مجبوری قلمدان وزارت شاور کے سپرد کر دیا اور خود قصرِ خلافت کی عظیم الشان چہار دیواری میں قیدیوں جیسی زندگی گزارنے لگا۔

شاور ملکی اور سیاسی میدان میں نٹوں جیسے کرتبوں کا ماہر تھا جس طرح ایک نٹ پتلی رسی پر خلا میں کھڑے ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے اسی طرح شاور بھی مصری سیاست کی بال سے زیادہ باریک پل صراط سے پار اترنے کی کوششوں میں مصروف تھا اسے یہ کام بہت اچھا آتا تھا اس کا منصوبہ تھا کہ جب عیسائی افواج اسکندریہ سے ہوتی ہوئی قاہرہ کی طرف بڑھیں تو خلافتِ عباسیہ بغداد کے نمائندے نور الدین زنگی سے دوستانہ امداد طلب کر لی جائے اور جب نور الدین زنگی کی فوج قاہرہ کا رُخ کرے تو اسکندریہ میں فروکش عیسائیوں کی اعانت حاصل کر لی جائے حالانکہ شاور کو مصر کی وزارتِ عظمیٰ کے مرتبے تک پہنچانے میں نور الدین زنگی کا بہت بڑا دخل تھا۔

شاور کی بے چین اور عیار طبیعت وزیراعظم بن جانے کے بعد بھی مطمئن نہ ہوئی کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ قاہرہ کی محلسرائے خلافت سازشوں اور جوڑ توڑ کی آماجگاہ ہے اور کسی بھی ذہین وزیراعظم کے لئے ضروری تھا کہ وہ سرپردۂ خلافت کی ایک ایک حرکت اور ذرا ذرا سی جنبش سے باخبر اور آگاہ ہوتا ہے۔ بہت زیادہ غور و فکر کے بعد آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی بھی طرح چند خوبصورت اور ذہین ترین کنیزوں کو گندم گوں نوجوان فاطمی خلیفہ العاضد کی خدمت میں بطور تحفہ بھیج دیا جائے اور ان کے ذریعے محلسرا کی سازشوں اور منصوبوں کی نگرانی کی جائے چنانچہ دس منتخب حسین ترین کنیزیں پچاس ہزار اشرفیوں کے ساتھ بطور نذرانہ العاضد کی خدمت میں روانہ کر دی گئیں۔ ان میں یونانی حسن بھی تھا اور ایرانی بھی لیکن ان سب میں اسکندریہ کی نومسلم جبلیا بے مثل تھی اٹھارہ سالہ شوخ و شریر اور ذہین ترین یہ لڑکی جب اپنے ریشمی جالی کے کرتے کلابتوں کے کام کی صدری اور بڑے پائنچوں کے پاجامے میں ملبوس ایک اندازِ دلربانہ سے شاور کے سامنے لائی گئی تو تھوڑی دیر کے لئے شاور کے مکار دل میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور یہ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو جانے والا ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے کتنی گھنٹے صرف یہ فیصلہ کرنے میں ضائع کر دیئے کہ جبلیا کو اپنے لئے مخصوص کر لے یا پھر منصوبے کے مطابق محلسرا میں پہنچا کر العاضد کی نگرانی کی جائے اور بالآخر دل کو شکست ہوئی اور دماغ کامیاب ہوا۔

شاور نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ جبلیا کے کاندھے پر رکھ دیا اور جذباتی لہجے میں کہنے لگا۔ "جبلیا! تیرا صحیح مقام قصرِ خلافت نہیں میرا گھر ہے بخدا میں تجھے پسند کرتا ہوں لیکن اپنے آپ کو اس پر مجبور پاتا ہوں کہ تجھے بیمار اور احمق العاضد کے حوالے کر دوں چند گھنٹوں بعد تو محلسرائے خلافت میں ہو گی لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے تجھ کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تو میرے منصوبے کا ایک ضروری کردار ہے جب تو اندر پہنچ جائے تو تیری پوری پوری یہ کوشش ہو گی کہ تو اپنے بے مثال حسن اور ناز و ادا سے العاضد کے دل کو فتح کر لے اور جب تو یہ کام کر چکے تو پھر تیرا دوسرا کام یہ ہو گا کہ محلسرا کے اندرونی واقعات کی تفصیلی روداد وقتاً فوقتاً مجھے بھیجتی رہنا محلسرا کا نگران خواجہ سرا مؤتمن الدولہ اس کام میں تیرا مددگار اور ہمراز ہو گا۔"

جبلیا نے احتراماً سر جھکا دیا لیکن کنکھیوں سے مکار شاور کو دیکھتی رہی آہستہ سے بولی "میں کوشش کروں گی کہ خلافت فاطمیہ کے روحِ رواں اور اصلی حکمران کو مایوسی کا شکار نہ ہونا پڑے۔"

اسی قسم کی باتیں بقیہ نو کنیزوں سے بھی کی گئی تھیں لیکن جبلیا کے سوا کنیزوں کو آخر میں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر ان میں سے کسی نے بھی العاضد پر شاور کے منصوبے کا اظہار کر دیا تو اس کا انجام بہت بھیانک ہو گا۔

سایے کے پیروں تلے آنے میں ابھی دیر تھی کہ قصرِ خلافت کا حبشی النسل خواجہ سرا مؤتمن الدولہ العاضد کے نمائندے کی حیثیت سے

شاور کے پاس پہنچ گیا۔ شاور نے دس کنیزیں اور پچاس ہزار اشرفیاں
اس کے حوالے کر دیں مؤتمن الدولہ کے ساتھی خواجہ سراؤں نے اشرفیوں کے
خوان اپنے سروں پر رکھے ان کے خوان پوش بھی بہت قیمتی تھے۔ ان
ارغوانی کپڑوں کی زمین پر بناوٹ میں اونٹوں پر حملہ آور شیروں کی
تصویریں بنائی گئی تھیں اور ان کے نیچے کڑھا ہوا تھا:۔

"بالآخر فاطمی شیر اپنے دشمنوں کو ان اونٹوں کی طرح ہلاک کر دیگا۔"

جب جیلیا مؤتمن الدولہ کے ساتھ جانے ہی والی تھی کہ شاور
کو اچانک العاضد کے خاص طبیب مشیر اور اتالیق نقی کا خیال آگیا اسے
معلوم تھا کہ نوعمر فاطمی خلیفہ العاضد کے دل و دماغ پر اس سینسٹھ سالہ
بوڑھے کی غیر معمولی گرفت ہے اس نے جیلیا کو سرگوشی میں سمجھایا۔

"اور ہاں دیکھنا میں تجھے یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ نادان العاضد
پر اس کے طبیب اور اتالیق نقی کا غیر معمولی اثر ہے تجھ کو اس سے
بہت ہوشیار رہنا پڑے گا۔ اور ہاں یاد رکھ۔ تو میرا اعتماد ہے۔"

جیلیا جواب میں اس طرح مسکرا دی جیسے کہہ رہی ہو۔ "او بوڑھے!
میں تجھ سے زیادہ ہوشیار ہوں اپنی ٹیں ٹیں بند کر اور سارے معاملات
میری ذمہ داری پر چھوڑ دے جیسا مناسب سمجھوں گی کروں گی۔"

شاور نے اپنا نذرانہ قصرِ خلافت تک پہنچایا اور خود ایک
دوسرے دروازے سے بنفسِ نفیس العاضد کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔

نوعمر العاضد جس تخت پر دراز تھا اس کے آس پاس حسین اور
نوخیز کنیزیں ہلکے سروں والے آلاتِ موسیقی سے اس کا دل بہلا رہی
تھیں آخری فاطمی حکمران کی مسیں بھیگ رہی تھیں اس کے گندمی رنگ
پر مستقل علالت نے زردی کی ہلکی سی تہہ جما دی تھی قصر کی دیواریں مشجر
پردوں میں گم ہو گئی تھیں ان پردوں پر مختلف جانوروں اور پرندوں کی
تصویریں زردوزی سے بنائی گئی تھیں کھڑکیوں اور دروازوں پر خس کے
دبیز پردے لٹکے ہوتے تھے ان پردوں کے پیچھے پانی کا چھڑکاؤ کرنے والے
خدام نہایت مستعدی سے اپنی خدمت انجام دے رہے تھے جب باہر کی
گرم ہوائیں ان نمیدہ پردوں سے ٹکراتیں تو کمرے کی فضا نہایت لطیف
خنکی میں ڈوب جاتی۔ پردوں کا پانی ابھی ٹھیک سے خشک بھی نہ ہونے
پاتا کہ ان پر پانی کا چھڑکاؤ شروع ہو جاتا۔

کمزور العاضد کی نظریں نوجوانی کی آرزوؤں اور خواہشوں سے لبریز
ان فتنہ سامان اور ہوشربا گانے والیوں کے گداز اور معصیت ترغیب
جسموں پر پڑتیں اور جم کر رہ جاتیں اس کے دل میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا
اور عین اس وقت جبکہ اس کی طبیعت کسی عملی اقدام پر مائل ہونے لگتی اس کے
کانوں میں طبیب نقی کی آواز گونجنے لگتی "شہزادے! تم اپنے لئے نہیں فاطمی
خلافت کی بقا کے لئے زندہ رہو اور اس زندگی کے لئے ضروری ہے کہ
تم ان دلفریب لیکن تباہ کن پری پیکروں سے خود کو محفوظ رکھو۔"

وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ ان میں کتنی ہی ایسی تھیں جو العاضد پر
نہایت ہنر مندی سے کنڈیں پھینکتیں لیکن العاضد ان کے پھندے میں نہ آتا۔
اسی حال میں نماکرے اور حسن و شباب سے آراستہ تخلیے میں جب اس کو یہ خبر ملی کہ
شاور کے نذرانے میں پچاس ہزار اشرفیوں کے علاوہ دس نہایت حسین و
جمیل کنیزیں بھی آ رہی ہیں تو وہ کسی قدر پریشان ہو گیا لیکن اس کے باوجود
اس نے اشرفیوں کو خلافت کے خزانۂ عامرہ میں اور کنیزوں کو اپنی خلوت گاہ
میں لانے کے احکام صادر کر دیئے۔ العاضد کو کسی کنیز نے پہلے ہی سے
یہ بھی بتلا دیا تھا کہ ان نوواردوں میں جیلیا نامی قتالۂ عالم بھی ہے اور اس
نے دبی زبان میں شوخی سے یہ کہنے کی جسارت بھی کی تھی کہ "اب دیکھوں
گی کہ امیر المومنین کس طرح شکار ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔"

مؤتمن الدولہ ان کنیزوں کو العاضد کی خلوت گاہ میں چھوڑ کر
الٹے پاؤں واپس چلا گیا ان کنیزوں نے العاضد کے روبرو ضرورت سے
زیادہ جھک کر سلام کیا اور وہ اس وقت تک برابر جھکی رہیں جب تک
العاضد نے انہیں سیدھے ہو جانے کا حکم نہیں دیا۔ العاضد کی نظروں نے
جیلیا کو پہلی نظر میں پہچان لیا۔ اس کے جالی کے کرتے سے اس کا
شباب ابلا پڑ رہا تھا جیلیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اتنی خفیف تھی کہ
اسے نوجوان لیکن تشنہ نظریں ہی محسوس کر سکتی تھیں۔

العاضد اٹھ کر بیٹھ گیا اور گاؤ تکیے سے لگ کر ابھی کچھ کہنے ہی
والا تھا کہ اطلاع ملی امیر المومنین کا اتالیق طبیب اور مشیر سینسٹھ سالہ
بوڑھا نقی فوری ملاقات کا متمنی ہے العاضد نے بجبر و کراہ اسے بلا لیا

تھوڑی ہی دیر بعد ایک دبلا پتلا اُلجھی داڑھی والا بوڑھا اندر داخل ہو گیا اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا چہرے سے بلا کی ذکاوت اور ذہانت ٹپکتی تھی۔ العاضد نے اپنے پھیلائے ہوئے پیر احتراماً سکیڑ لیتے اور مؤدب ہو گیا۔

بوڑھے نقی نے ایک سرسری نظر سے ماحول کا جائزہ لیا لیکن جب جبلیا پر نظر پڑی تو کچھ پریشان ہو گیا۔ پھر کچھ تامل کے بعد العاضد کو مخاطب کیا۔ "شہزادے! اس وقت میں نہ تو تیرا مشیر ہوں اور نہ اتالیق۔ اس وقت میں صرف تیرا طبیب ہوں اور یہ کہنے آیا ہوں کہ تجھے ایسے عطیات اور نذرانے ہرگز قبول نہ کرنے چاہئیں جن سے فاطمی خلافت کے ستون کو دیمک چاٹ جائے۔ شہزادے! تو فاطمی خلافت کا آخری چراغ ہے۔ جسے بیماریوں کے تند و تیز جھونکے جھلملائے دے رہے ہیں عباسی خلافت جو تیری سب سے بڑی حریف اور رقیب ہے اس چراغ کے بجھ جانے کی منتظر ہے اسکندریہ کی راہ سے داخل ہونے والی مسیحی فوجیں الگ کسی بُری گھڑی کا انتظار کر رہی ہیں۔"

العاضد نے زود رنج نظروں سے نقی کو دیکھا اور گردن جھکالی "اور رقص اور موسیقی کی بابت کیا ارشاد ہوتا ہے؟"

بوڑھے نقی نے دلیری سے جواب دیا۔ "رقص اور موسیقی روح کی غذا ہیں لیکن یہ دونوں گناہ کے سفیر بھی ہیں۔" کنیزیں نقی کی باتوں سے اندر ہی اندر کھول رہی تھیں اور جبلیا کا تو مارے غصے کے بہت بُرا حال تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت اس بوڑھے کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دے اس کو اپنی ذات اور حسن پر اتنا اعتماد تھا کہ اگر یہ خبطی بوڑھا درمیان میں حائل نہ ہو تو وہ العاضد کو بڑی آسانی سے اپنا شکار بنا سکتی ہے اور نہایت اطمینان سے قصرِ خلافت پر قبضہ کر سکتی ہے اس کو العاضد پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ یہ کیسا نوجوان ہے جو ایک ٹھنڈے مزاج بوڑھے کی نصیحتوں کو اتنے انہماک اور سعادت مندی سے سن رہا ہے۔ اس نے غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ العاضد کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں ایک سوال تھا اجازت طلبی تھی۔ کچھ کہنے کی خواہش کا اظہار تھا۔

العاضد نے دریافت کیا۔ "کیا تو کچھ کہنا چاہتی ہے؟"

جبلیا نے جواب دیا "ہاں، لیکن امیر المومنین سے نہیں، امیر المومنین کی جاں بخشی اور اجازت کے بعد اس بوڑھے کی لن ترانیوں کا جواب ضرور دینا چاہتی ہوں۔"

بوڑھا نقی جبلیا کی طرف گھوم گیا۔ العاضد نے آنکھ کے اشارے سے جبلیا کو بولنے کی اجازت دے دی۔

اس نے بوڑھے نقی سے دریافت کیا۔ "کیا تو یہ بتا سکتا ہے کہ اپنی عمر کے کس دور سے تو نے اپنی یہ بزرگانہ وضع قطع اختیار کر رکھی ہے؟"

نقی نے درشت لہجے میں جواب دیا "تیرے اس سوال کا مقصد؟"

"مقصد بعد میں بتاؤں گی" جبلیا نے جواب دیا۔

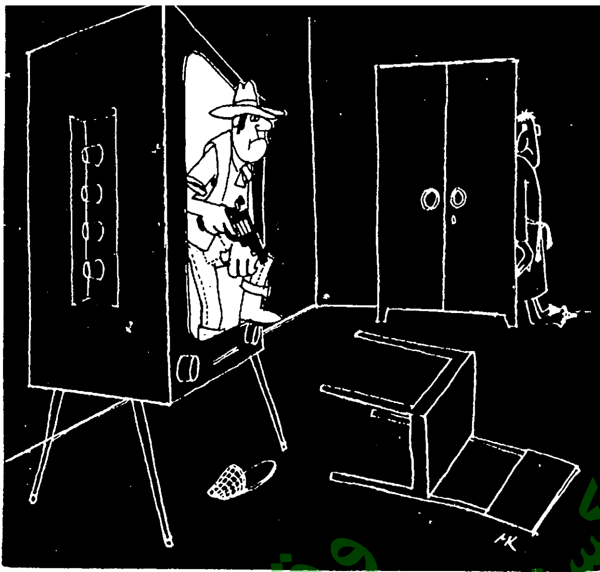
العاضد نے جبلیا کو جھڑک دیا "اے لڑکی! یہ شخص میرا اُستاد ہے اس سے ادب و احترام سے بات کر کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ میں نے اس کے آتے ہی اپنے دونوں پیر سمیٹ لیتے تھے!"

جبلیا نے آزردگی سے جواب دیا۔ "بجا ارشاد امیر المومنین! لیکن اس بوڑھے کو بھی ہماری اس طرح اہانت نہیں کرنی چاہیے اسے جو کچھ سمجھانا ہے امیر المومنین کو تخلیے میں سمجھائے، میں اپنی بے عزتی نہیں برداشت کر سکتی۔"

العاضد کا جبلیا کی جرأت اور بے باکی نے دل موہ لیا اور وہ جبلیا کی اداؤں اس کی تمکنت اور اس کے پُر وقار انداز سے بہت متاثر ہوا اسے لگا کہ العاضد کی آنکھوں میں چمک آگئی، ایسی چمک جس میں جبلیا کے لئے اشتیاق ہی اشتیاق تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ کچھ بھی ہو وہ جبلیا کے معاملے میں بوڑھے اتالیق کی ایک بات بھی نہ مانے گا لیکن سردست یہ طے کیا کہ جبلیا کی ذات سے اپنے اُنس اور لگاؤ کو راز ہی رکھا جائے گا۔

دوسری طرف جبلیا کا یہ عالم تھا کہ اس کی مخمور آنکھوں میں بوڑھے کے لئے شدید نفرت موجود تھی۔ اس نے بوڑھے کو اشتعال کی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کہنا چاہتی ہو "بوڑھے تو نے مجھے نہیں دیکھا مجھے سرکشوں کو شرمندہ کرنا آتا ہے۔"

العاضد کی کتنی راتیں اس کشمکش میں گزر گئیں کہ وہ جبلیا کو تخلیے میں بلائے یا نہ بلائے پہلے تو اس نے یہ سوچا تھا کہ وہ اپنے بوڑھے اتالیق



امریکی ٹیلی ویژن کے ہیرو اپنے ہم وطنوں کی زندگی میں آ رہے ہیں۔

اور طبیب تقی کو لاعلم رکھ کر جبلیا کی زلفوں کے سائے میں کچھ وقت گزار لیا کرے گا لیکن بعد میں اس کے ضمیر نے سخت ملامت کی کہ تو فاطمہؓ سے نسبی تعلق رکھتا ہے ایک فاطمی کو یہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور ایسی حالت میں جبکہ اس کی زندگی پر موت سایہ فگن تھی اور کچھ پتا نہ تھا کہ کب کیا ہو جائے نامۂ اعمال گناہوں سے جتنا پاک رہے بہتر ہے ان حالات اور اس کشمکش میں وہ جبلیا کو اپنی خلوت گاہ میں بلانے کی ہمت نہ کر سکا۔ دوسری طرف جبلیا کو یہ یقین تھا کہ العاضد اس کا شکار ہو چکا ہے اور کسی بھی لمحے اس کا بلاوا آنے ہی والا ہے لیکن جب کئی دن گزر گئے اور العاضد کی خاموشی برقرار رہی تو وہ ذرا بے چین ہو گئی۔ اسی عالم میں اسے موتمن الدولہ کے ذریعے شاور کا ایک مختصر پیغام ملا۔ یہ قرطاس کا ایک چھوٹا سا پرزہ تھا جس پر تحریر تھا۔

”امیر المومنین العاضد خلافت عباسیہ کے بارے میں آج کل کیا رائے رکھتے ہیں اور آج کل ان کے مزاج میں کون لوگ زیادہ دخیل ہیں؟“

جبلیا نے جواب میں لکھ دیا۔ ”ابھی میں امیر المومنین العاضد سے دور ہوں یہاں بوڑھے اتالیق تقی کی حکومت ہے جوانی بڑھاپے کے زیر اثر ہے وہ بوڑھا بڑا ہی سرکش ہے۔“

لیکن عجب اتفاق کی بات تھی کہ اس کے فوراً بعد العاضد نے جبلیا کو بلا لیا۔ جبلیا نے جانے میں تامل اختیار کیا اور ایسے زیورات اور لباس زیب تن کئے جو العاضد کے بیمار اور نصیحت زدہ دل کو ایک ہی وار میں بے کار کر دیں۔ وہ اپنے حسن کی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ وہاں پہنچی، العاضد اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ محل کی فضا نغموں اور ساز کی سریلی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ العاضد نے تین کنیزوں کے سوا سب کو رخصت کر دیا۔ یہ تینوں کنیزیں راگ اور موسیقی میں بے مثل تھیں۔ العاضد کے کھڑے ہوتے ہی سازوں کی آواز تیز ہو گئی۔ العاضد دو قدم آگے بڑھا اور فرطِ محبت میں جبلیا کے ہاتھ پکڑنے چاہے لیکن جبلیا اس سے پہلے ہی العاضد کے احترام میں کچھ خم ہو چکی تھی۔

العاضد نے لرزتے ہاتھ سے جبلیا کی زلفیں چھو لیں اور آہستہ سے بولا۔ ”تجھے آئندہ خلافت کے احترام سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے!“

جیلیا سیدھی ہوگئی اور شرمائی لیکن شوخ اور متبسم نظروں سے العاضد کو دیکھا اور نگاہیں ہٹا لیں، العاضد نے ہمّت کر کے اس کا بایاں ہاتھ بھی پکڑ لیا اور اپنے مرصع تخت کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔

"اے شوخ و شریر لڑکی! تو مجھے کیا سمجھتی ہے؟"

جیلیا نے زمانہ سازی سے جواب دیا "میں جو کچھ سمجھتی ہوں اس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں!"

العاضد نے اُسے اپنے قریب بٹھا لیا اور ایک نیا سوال کر دیا "تیرا کیا خیال ہے؟ کیا تجھے اس بات کا یقین ہے کہ میں تجھ سے محبت کرنے لگا ہوں؟"

"نہیں میں ایسا نہیں سوچ سکتی!" جیلیا نے جواب دیا "لیکن یہ خیال البتہ ہے کہ امیر المومنین اس کنیز پہ خصوصی توجہ دیتے ہیں اور یہی میرے لئے باعثِ فخر ہے۔"

العاضد کی آواز اچانک تیز ہوگئی اور وہ پُروقار لہجے میں بولا۔

"لڑکی! میں فاطمہؓ کی نسل سے تعلق رکھتا ہوں میں بدعہدی یا دھوکا دہی سے کام نہیں لے سکتا اور آج میری یہ بات غیر مبہم اور واضح آواز میں سُن لے کہ میں تجھ سے محبت نہیں کر سکتا میں اپنے اتالیق اور طبیب تقی کے زیرِ اثر ہوں میں نے اس سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ میں کسی لڑکی سے عشق نہ کروں گا اس وعدے کو انشاءاللہ تازیست نباہوں گا ہر چند کہ تیرا یہ گداز اور ریشمی جسم میرے وعدے کو متزلزل کرتا رہے گا۔"

جیلیا کی امیدوں پر بجلی گر گئی وہ العاضد کو کوئی پھڑکتا یا چُبھتا ہوا جواب دے سکتی تھی لیکن وہ سرِدست ایسا نہ کر سکتی تھی وہ کسی موقعے کی منتظر تھی۔

العاضد نے ذرا صاف گوئی اور راست بیانی سے کام لیا۔ آہستہ سے کہا "لیکن مجھے جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے مجھے حقیقتاً تجھ سے محبت ہوگئی ہے اور میں تجھے چاہتا ہوں لیکن تجھے اس کا پتا نہ ہوگا۔"

جیلیا پھر خوش ہوگئی اس کے انگ انگ میں خوشی اور کیف کی لہریں دوڑنے لگیں لیکن یہ خوشی اور یہ کیف بھی عارضی ثابت ہوا

العاضد نے جیلیا کو تنبیہہ کی "لیکن میں اپنے بوڑھے اتالیق اور طبیب کی ہدایات اور مشوروں کے خلاف بھی نہیں چل سکتا اس کا احترام کرتا ہوں اور تجھے بھی اس کا احترام کرنا چاہیئے۔"

یہ کہتے کہتے العاضد نے افسردگی سے گردن جُھکا لی لیکن جیلیا کے سینے میں تقی کے خلاف آگ لگ گئی اسے یہ ملال کم تھا کہ العاضد اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ اس کو غصّہ تو اس پر آ رہا تھا کہ بوڑھا تقی درمیان میں رُکاوٹ بن رہا تھا وہ اپنی تذلیل اور اہانت کا انتقام لینا چاہتی تھی تاہم اپنے دلی جذبات کا اظہار چہرے سے نہیں ہونے دیا تبسّم بکھیرتی ہوئی بولی "میں امیر المومنین کے اتالیق کی تعظیم اور احترام کی بہرحال پابند ہوں۔"

العاضد نے جیلیا کو شانے سے لگا لیا اور اس کی زلفوں پر اپنے چہرے کو رکھ دیا۔ سازوں کی آواز تیز ہونے لگی، انہی آوازوں میں جیلیا کی سسکیوں کی آواز اُبھری وہ رو رہی تھی۔ العاضد نے بے چینی سے اپنا چہرہ اُٹھا لیا اور ٹھوڑی کو انگلیوں سے اُٹھا کر دیکھا تو دونوں رُخسار آنسوؤں میں تر تھے۔

"تو رو کیوں رہی ہے؟" العاضد نے بے چینی سے دریافت کیا۔

جیلیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ سسکیوں میں اور زیادہ شدّت پیدا ہوگئی۔

"تو بولتی کیوں نہیں؟" العاضد نے اس کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا "میری کس بات نے تجھ کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیا ہے؟ کچھ بتلا تو سہی!"

جیلیا نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا "امیر المومنین کو غالباً اس کا علم ہوگا کہ میں اسکندریہ کے ایک غریب اور گمنام خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔"

"ہاں مجھے تیری بابت یہی کچھ بتایا گیا ہے!" العاضد نے رحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو ناصری ہے تیرے آباؤ اجداد نصاریٰ تھے۔"

جیلیا نے بدستور رقّت آمیز لہجے میں کہا "امیر المومنین کی اطلاعات

حرف بحرف درست ہیں میں چاہتی ہوں کہ امیرالمومنین مجھے اسکندریہ واپس جانے کی اجازت مرحمت فرمادیں۔"

العاضد نے اس کے رخساروں سے ہاتھ ہٹالیا۔ "کیوں ؟ کیا اس حسین و دلکش اور وسیع قصر کی روح پرور فضائیں تجھے پسند نہیں آئیں؟"

جیلیا نے آزردگی سے جواب دیا "نہیں یہ بات نہیں ہے امیرالمومنین! مجھ جیسی غریب اور آوارہ وطن لڑکی اس حسین اور جنت نشان قصر کا کبھی تصوّر تک نہ کرسکتی تھی لیکن مجھے اپنی قسمت پر کبھی تو ہنسی آتی ہے اور کبھی رونا کہ اس نے مشرق کے ایک عظیم تاجدار کے دل کو مسخر تو کرلیا لیکن یہ میری بدنصیبی کہ یہ تاجدار اپنے نوجوان دل سے زیادہ اپنے بوڑھے اتالیق کی مرضی کا تابع ہے ان حالات میں قصر خلافت کی ہر حسین شے میرے لئے اپنی دلکشی کھوچکی ہے یہ جگہ میرے لئے جہنم بن گئی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ دنیا کا کوئی شخص بھی جہنم میں اپنی خوشی اور مرضی سے رہنا کبھی بھی پسند نہ کرے گا۔"

العاضد کے پائے استقامت میں لرزش پیدا ہوگئی۔ جیلیا کے مقابلے میں اتالیق تقی فضول گو ناصح اور چرب زبان واعظ نظر آنے لگا۔ اس نے فرطِ محبت میں جیلیا کی زلفوں کا بوسہ لے لیا اور سرگوشی میں کہا "تجھے اسکندریہ واپس جانے کی کوئی ضرورت نہیں تو نہیں رہ اسی قصرِ خلافت میں، وقت کی منتظر رہ ممکن ہے یہ جہنم جنت میں تبدیل ہوجائے"

جیلیا کے چہرے پر شادابی آگئی' العاضد مفتوح ہو رہا تھا۔

"اچھا!" العاضد کھڑا ہوتا ہوا بولا "میں نے جو ارادہ کیا تھا اور تجھ سے جو کہنا چاہتا تھا وہ میں نہیں کہہ سکا۔ اور اگر تیری شیریں بیانی کا یہی عالم رہا تو شاید میں کبھی بھی تجھ سے وہ باتیں نہ کرسکوں گا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تو میرے لائق صد احترام اتالیق کو شکست دینے پر تل گئی ہے خیر مجھے کچھ سوچنے کا موقع دے۔"

شاور کو جیلیا کی طرف سے چند سطری خفیہ پیغام پہنچ گیا "مزاجِ خلافت میں حسبِ خواہش تبدیلی آچکی ہے امید ہے کہ دوسرے وار میں رہی سہی کسر بھی پوری ہوجائے گی۔"

دو دن اور تین راتیں گزر گئیں لیکن العاضد نے جیلیا کو نہیں بلایا۔ اسے شبہ گزرا کہ کہیں متلوّن مزاج اور ناپختہ کار العاضد بوڑھے اتالیق کے وعظ و نصائح کا پھر شکار تو نہیں ہوگیا لیکن رات کے پچھلے پہر کسی نے اس کے در پر دستک دی اس کی آنکھ کھل گئی اسے خواب کا شبہ گزرا لیکن اسی لمحے پھر دستک کی آواز سنائی دی۔ وہ آہستہ آہستہ پنجوں کے بل دروازے کی طرف بڑھی اسے یقین تھا کہ یہ ضرور کوئی خواجہ سرا ہے جو رات کی تاریکی اور سناٹے میں شاور کا کوئی خفیہ پیغام لے کر آیا ہے۔

دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے پوچھا "کون ؟"

دوسری طرف سے ایک تنا سا آواز سنائی دی "میں ہوں دروازہ کھولو۔"

یہ العاضد کی آواز تھی جس میں ارتعاش بھی تھا اور محبت کی بے تکلفی بھی۔ جیلیا کو ایک نئی بات سوجھی' ایک نئی تجویز۔ ایک نئی ترکیب' جس کے نتائج بڑے دوررس نکلے۔ وہ ایک دم مغموم اور اداس ہوگئی چہرے پر ایسے تاثرات پیدا کرلئے جو کسی شدید بیماری کا نتیجہ ہوتے ہیں اس نے چپکے سے دروازہ کھول دیا۔ العاضد اندر داخل ہوگیا اور دروازہ پھر بند ہوگیا۔

العاضد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بوسہ دیتا ہوا بولا "قبل اس کے کہ تو اس وقت میرے چوروں کی طرح آنے کا سبب معلوم کرے میں خود ہی سب کچھ بتا دوں گا۔"

جیلیا نے کسی اندرونی کرب کا تاثر کراہتے ہوئے لہجے سے ظاہر کیا "امیرالمومنین تشریف رکھیں مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا یہ خواب ہے یا حقیقت ؟"

العاضد جیلیا کے ساتھ اس کی مسہری پر جاکر بیٹھ گیا۔ اس نے جیلیا کو غائر نظروں سے دیکھا "بوڑھے تقی کی نصیحتیں اب نقطۂ عروج کو پہنچ چکی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مجھ سے غیر معمولی کدورت ہوگئی ہے۔ دو دن سے برابر یہی سمجھا رہا ہے کہ امیرالمومنین ابھی نوجوان ہیں خلافت کا بوجھ اتنا بھاری ہے کہ اس میں تیری جیسی ہوش ربا دوشیزاؤں کا دور رہنا بہت ضروری ہے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ خلافت

کی ذمہ داریوں کے علاوہ میری مستقل علالت بھی تیری متحمل نہیں ہو سکتی۔"
وہ اچانک چپ ہو گیا اور جبلیا کی گردن کے پیچھے ہاتھ رکھ کر چہرہ اپنے منہ کی طرف کر لیا۔ "مجھے اس بوڑھے سے نفرت سی ہو چکی ہے لیکن پھر بھی وہ میرا اتالیق اور طبیب ہے اس کے مشورے نہایت قیمتی ہوتے ہیں مگر تیری بابت اس کے مشورے ایک بوڑھے اور مایوس دل کے حسد کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے۔"

جبلیا نے کراہتے ہوتے کہا۔ "لائق صد احترام اتالیق کی بابت میں کیا کہہ سکتی ہوں!"

العاضد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تو کراہ کیوں رہی ہے؟"

جبلیا نے مجبوروں کی طرح عرض کیا۔ "میں دو دن سے بیمار ہوں!"

"لیکن تو نے مجھے مطلع کیوں نہیں کیا؟" العاضد نے بے قراری سے کہا

جبلیا نے جواب دیا۔ "اس دوران مجھے امیر المومنین کی خدمت میں باریابی کا موقع ہی کہاں ملا؟"

العاضد نے اس کی پیشانی کا بوسہ لے لیا۔ "اس کے باوجود تو مجھے مطلع کر سکتی تھی؟"

جبلیا سمٹ گئی اور شرم و حیا کی تصویر بن کر عرض کیا۔ "لیکن کسی کے ذریعے اپنی علالت کی اطلاع دینے میں مجھے اپنی کنیز حیثیت کا احساس اور امیر المومنین کی عظمت اور برتری کا پاس مانع رہا۔ میں اپنا حال زبانی ہی عرض کرنا چاہتی تھی۔"

العاضد نے کہا۔ "اگر تو کہے تو میں اسی وقت نقی کو طلب کر کر سکتا ہوں!"

جبلیا نے جواب دیا۔ "نہیں میں ایسا نہیں چاہتی لیکن اگر یہاں سے جانے کے بعد صبح تک امیر المومنین کو اس کنیز کی علالت اور تکلیف کا خیال رہے تو طبیب کو ضرور بھیج دیں لیکن میں اپنا علاج آپ کے بوڑھے طبیب ہی سے کرانا چاہتی ہوں۔"

العاضد نے کہا۔ "بوڑھا نقی صبح تیرے پاس آ جائے گا تو مطمئن رہ۔"

جبلیا اپنے مقصد اور اداکاری میں کامیاب ہو چکی تھی اب اس نے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا کہنے لگی۔

"امیر المومنین اس ناخوشگوار موضوع سے گریز فرمائیں میں وہی سب کچھ سننا چاہتی ہوں جس کا امیر المومنین ابھی اظہار فرما رہے تھے"

العاضد نے محبت سے اس کے سر کو ہلا دیا۔ "شریر لڑکی۔ میں تجھے آدابِ خلافت سے پہلے ہی مستثنیٰ قرار دے چکا ہوں یہ تو بار بار امیر المومنین امیر المومنین کی کیا رٹ لگاتے ہوتے ہے۔"

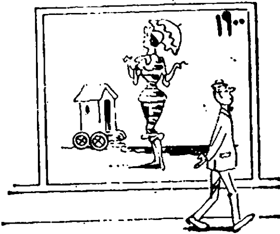
جبلیا نے آنکھیں بند کر لیں قدرے بے تکلفی سے بولی۔ "میں فوراً امیر المومنین کے ارشاد پر عمل نہیں کر سکتی۔"

العاضد کے دل میں بہت ارمان تھے خواہشیں تھیں کہ جملہ بندشیں توڑ کر آزادی کی طالب تھیں، دل تھا کہ جنون کا متقاضی تھا نفس تھا کہ آزادی اور بے راہ روی چاہتا تھا لیکن ان سب کو ایک ہی احساس نے مغلوب کر دیا تھا۔ "وہ فاطمہؓ کی نسل سے تعلق رکھتا تھا" اور نسب نامے کی عظمت نے ان وسوسات شیطانیہ کو شکست دیدی

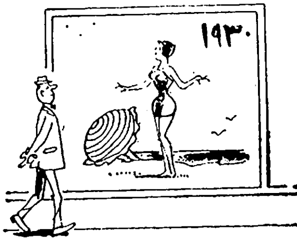
العاضد جبلیا کو چھوڑ کر اچانک کھڑا ہو گیا۔ بالکل اس طرح جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ جبلیا اس اچانک تبدیلی پر حیران رہ گئی وہ سمجھی شاید بوڑھے اتالیق کی نصیحتوں کے سانپ بچھو العاضد کی بے باکیوں اور جرأت مندیوں کو اب بھی ڈس رہے ہیں، وہ بے بس سوالیہ لیکن ترغیب آمیز نظروں سے العاضد کو دیکھنے لگی۔

العاضد نے شکست خوردہ آدمی کی طرح جبلیا کو دیکھا اور گھٹے گھٹے لہجے میں بولا۔ "جبلیا! میں فاطمی ہوں، میرے نسب نامے کی برتری میرے حساس دل کے لئے سوہانِ روح بن گئی ہے میرے آبا و اجداد مجھ سے زیادہ بااختیار تھے انہیں اختیارات بھی ملے تھے اور قدرت کی طرف سے صحت و توانائی بھی، لیکن میں ان دونوں نعمتوں سے محروم ہوں مجھے خلافت ملی ہے لیکن اس خلافت پر میرا کوئی اختیار نہیں اس پر میرے عیار اور شاطر وزیر شاور کا قبضہ ہے وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے میں جو چاہتا ہوں نہیں کر سکتا اور جبلیا حد تو یہ ہے کہ اس کی سازشوں کا جال قصرِ خلافت کی پُر پیچ راہوں تک میں بچھ چکا ہے میرے گرد و پیش جو لوگ ہیں مجھے نہیں معلوم کہ ان میں سے کتنے شاور

کے جاسوس ہیں اور کتنے میرے مخلص ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ شاور نے
محلسرا کے بعض خواجہ سراؤں تک کو خرید لیا ہے۔"



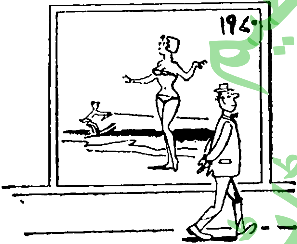
جیلیا کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی اسے یقین ہو گیا کہ العاضد نے اسے پہچان لیا ہے اور یہ شاور ہی استعاروں میں مرکزی کردار اسی کی ذات ہے لیکن اس نے اپنی اندرونی وحشت اور سراسیمگی کا اظہار چہرے سے نہیں ہونے دیا بلکہ یہ سب کچھ اس طرح سُنا جیسے کوئی عجیب و غریب انکشاف ہو رہا ہو۔



العاضد کہتا رہا "میں بوڑھے نقی کی اسی لئے بے حد عزت کرتا ہوں کہ وہ مخلص اور میرا ہمدرد ہے۔ میں آج کل بہت پریشان ہوں، کچھ ایسے ملکی مسائل درپیش ہیں کہ میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہوں، نقی جو مشورے دیتا ہے وہ حد درجہ مخلصانہ اور صائب معلوم ہوتے ہیں لیکن پھر بھی مجھے کچھ اور مشیر درکار ہیں!"

پھر اچانک سوال کیا "کیا ملکی امور سے تجھے بھی کبھی دلچسپی رہی ہے؟"

جیلیا نے جواب دیا "مجھے دلچسپی تو دُنیا کے ہر معاملے میں محسوس ہوتی ہے یہ الگ بات ہے کہ میں کس معاملے میں کتنا ادراک اور شعور رکھتی ہوں اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔"



العاضد نے کہا "اچھا تیرے ادراک اور شعور کا ابھی اندازہ ہوا جاتا ہے۔ میں درپیش مسئلہ تیرے سامنے رکھتا ہوں تا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

جیلیا اس کی صورت دیکھنے لگی۔ العاضد نے مسئلے کی تفصیلات اس کے سامنے رکھ دیں۔



"کچھ عرصہ پہلے میں نے حملہ آور مسیحی افواج کے مقابلے میں بغداد کی عباسی خلافت سے مدد مانگی تھی۔ عباسی خلافت شاور کے جبر و مکر سے بہت دل برداشتہ تھی بہرحال اس نے اپنی امداد و اعانت کے لئے جو شرطیں پیش کی تھیں اِن میں دو شرطیں بہت سخت تھیں۔ ایک تو یہ کہ فاطمی خلافت کا ایک تہائی حصہ عباسی خلافت کی تحویل میں دے دیا جائے دوسری یہ کہ فاطمی افواج عباسی افواج کے سپہ سالار اسدالدین شیر کوہ کی ماتحتی میں دے دی جائیں گی۔ اور ہماری چھاؤنیوں

پر عباسی جنرل کا قبضہ رہے گا۔ اسدالدین شیرکوہ اپنی افواج کے ساتھ یہاں آچکا ہے اور اس نے قاہرہ کو محاصرے میں لینے والی مسیحی افواج کو فرار ہوجانے پر مجبور کر دیا ہے اب معاہدے کی جملہ شرائط پر عمل درآمد کا وقت آچکا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔"

جیلیا نے پوچھا۔"امیرالمومنین کے اتالیق کی کیا رائے ہے؟"

العاضد نے جواب دیا۔"معاہدے کی شرائط کو دیانت داری سے پورا کر دینا چاہیئے۔"

"اور امیرالمومنین کے وزیر شاور کی کیا رائے ہے؟" جیلیا نے پوچھا

العاضد نے بیزاری سے کہا۔"وہ کہتا ہے کہ فی الحال ٹال مٹول سے کام لیا جائے اور اس معاملے کو اتنا طول دیا جائے کہ یا تو کسی سازش کے ذریعے اسدالدین شیرکوہ کو ہلاک کر دیا جائے یا پھر مسیحی حکومتوں سے ساز باز کر کے ان افواج کی مدد سے اسدالدین شیرکوہ کو جبراً قاہرہ سے نکال دیا جائے۔"

جیلیا خوش تھی کہ بڑے کام کی باتیں اس کے علم میں آرہی تھیں، اس نے دریافت کیا۔"اور خود امیرالمومنین کی کیا رائے ہے؟"

العاضد نے کہا۔"میں فاطمی ہوں مجھے معاہدہ شکنی نہیں کرنی چاہیئے۔"

جیلیا نے جواب دیا۔"امیرالمومنین کا منصب یہی کہتا ہے کہ معاہدہ شکنی نہیں ہونی چاہیئے۔"

العاضد خوش ہو گیا"تو صحیح کہتی ہے تیرے دل میں ایمان کی روشنی اور حق پرستی موجود ہے لیکن مکار شاور کی شرارتوں کا کیا کیا جائے۔"

جیلیا نے کہا۔"اس کے لئے امیرالمومنین بھی غور فرمائیں میں بھی سوچوں گی اور اتالیق تقی کو بھی غور کرنا چاہیئے۔"

العاضد واپس جاتا ہوا بولا"میں تیرے پاس سے اطمینان لے کر جارہا ہوں تو عقل صائب رکھتی ہے میرا بوجھ ہلکا ہوچکا ہے صبح تیرے علاج کے لئے بوڑھا طبیب آجائے گا۔"

العاضد کے چلے جانے کے بعد وہ کسی اور فکر میں ڈوب گئی۔ اس کی دوررس نظریں صاف دیکھ رہی تھیں کہ شاور کی مکاریاں زیادہ دن نہیں چلیں گی۔ وہ وزیر ہے اور ایک ایسا وزیر جس کو نہ تو العاضد پسند کرتا ہے اور نہ عباسی خلافت کا جنرل اسدالدین شیرکوہ جیلیا کے اندازے کے مطابق شاور کو یا تو قتل ہوجانا چاہیئے یا پھر اپنے عہدے سے معزول ہوجانا چاہیئے اس نے سوچا ایسے ناقابل اعتبار شخص کے لئے خطرناک خدمات انجام دینا عقلمندی نہیں ہے، دوسری طرف سادہ لوح اور صاحب کردار العاضد تھا جس کے اختیارات اور اقتدار خاندانی تھے انہیں شاور چھین نہ سکتا تھا۔ اور آخر کار اس کی جاہ پسند فطرت اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ شاور سے کسی طرح خوبصورتی سے پیچھا چھڑا کر العاضد کو اپنا لینا چاہیئے لیکن یہاں بوڑھا اتالیق سانپ بنا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلے اس سانپ کو کچل دینا چاہیئے اس کے بعد جب راستہ صاف ہوجائے گا تو وہ العاضد کی سب سے زیادہ با اختیار محبوبہ یا ملکہ بن کر فاطمی خلافت پر حاوی ہوجائے گی، اس نے شاور کو ایک مختصر سا پیغام بھیج دیا۔

"بوڑھا اتالیق سانپ بنا ہوا ہے امید ہے کہ عنقریب اس کے زہر کو زائل کر دیا جائے گا۔"

صبح فجر کی نماز کے فوراً بعد طبیب تقی جیلیا کے پاس پہنچ گیا جیلیا اس کی منتظر تھی ایک خطرناک منصوبہ زیر عمل تھا۔ اس نے ایسے کپڑے زیب تن کر رکھے تھے جن میں بھرپور شباب کی زہد شکن قوت کارفرما تھی اور وہ سج دھج کر اس آگ کی مانند ہوگئی جس میں کہنہ سالی کے بھرم اور احتیاط پسندی کو بآسانی خاکستر کیا جا سکتا تھا گلے کے منقش اور خوبصورت گلوبند سے پھسلتی ہوئی بوڑھے کی نظر جس جگہ پہنچ کر خود بخود ٹھہر گئی وہاں ہوش و حواس صبر و پندار اور حزم و احتیاط کو چشم زدن میں پگھلا دینے والا آتش فشاں گویا اس کا پہلے سے منتظر تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے بوڑھا طبیب یہ فراموش کر بیٹھا کہ وہ یہاں کس لئے آیا ہے وہ جیلیا کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بوڑھے دل میں ہلچل مچ گئی۔ جیلیا اپنے حسب دل خواہ نتائج سے بشاشش اور مطمئن تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو ہلکی سی مسکراہٹ

اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

جیلیا نے عزت و احترام سے بوڑھے نقی کو بٹھایا۔ بوڑھے نے نہایت ملائمت اور محبت سے دریافت کیا "تجھے کیا تکلیف ہے اور کب سے لاحق ہے؟"

اور تھوڑی دیر تک بیماری سے لاپروائی اور غفلت کے سنگین نتائج پر تقریر کرتا رہا اور آخر میں فرمایا "اگر تو امیرالمومنین کے بجائے براہ راست بھی مجھے اپنی علالت سے مطلع کر دیتی تب بھی کوئی ہرج نہ تھا میں فوراً حاضر ہو جاتا۔"

جیلیا نے بناوٹی لگاؤ سے کہا "میں براہ راست بھی آپ کو بلا سکتی تھی لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ امیرالمومنین کے دل میں کسی قسم کا شبہ پیدا ہو۔ ہمیں احتیاط بہرحال کرنی چاہیے۔"

بوڑھے طبیب نے اپنے اشتیاق اور وارفتگی کو قوت ارادی سے کچل دیا اور پوچھا "ہاں تو تجھے کیا تکلیف ہے؟ جلد بتا تاکہ اس کا فوراً علاج شروع کر دیا جائے۔"

جیلیا نے نہایت لاپروائی سے جواب دیا "بائیں طرف پسلیوں کے نیچے میرا خیال ہے کہ صرف کہنے یا سننے سے کام نہیں چلے گا بہتر ہے کہ اس کا معائنہ بھی فرما لیا جائے۔"

"بائیں طرف پسلیوں کے نیچے!" بوڑھے طبیب نے پریشان ہو کر جیلیا کے الفاظ دہرائے "لیکن۔ لیکن۔ اس جگہ کا یہ رے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر تکلیف کیا ہے۔ کچھ کیفیت تو بیان کر۔"

جیلیا نے غمزے دکھائے اور شوخ و شریر لہجے میں کہا۔ "تمام تکلیفیں یکساں ہوتی ہیں ان کی شدت میں کمی بیشی البتہ ہو سکتی ہے میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ یا تو مجھے فم معدہ کی شکایت ہے یا جگر خراب ہے اور اس کا فیصلہ اس جگہ کو دیکھنے کے بعد آپ خود فرمائیں گے۔"

نقی نے جب یہ دیکھا کہ جیلیا اس جگہ کا معائنہ کرانے ہی پر بضد ہے تو اپنے پیشے کی ذمہ داری سے وہ بھی مجبور ہو گیا اور اس نے اس جگہ کا معائنہ کرنا بہت ضروری خیال کیا۔

بوڑھے کا رہا سہا حزم واحتیاط اس معالجے کے دوران رخصت ہو گیا اور اس عالم میں جبلیا کی شرارت اور لگاوٹ کی باتوں نے رہے سہے احتیاط اور شبہات بھی دور کر دیئے۔

چلتے چلاتے جب جبلیا نے بوڑھے طبیب سے یہ کہا کہ ایک بیمار اور ناقابلِ اعتبار نوجوان کے مقابلے میں صحت مند اور تجربہ کار بوڑھا زیادہ اچھا ہے۔ کیا میں امید کروں کہ آپ دوبارہ پھر یہاں تشریف لانا گوارا فرمائیں گے؟"

تو فریب خوردہ طبیب کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ "بہر حال جب تک تو بیمار ہے میرا آنا لازمی ہے اور اب تو میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تیرا مرض متعدی ہے اور کچھ کچھ میں خود بھی اس سے متاثر ہو چلا ہوں"

بوڑھا تقی چلا گیا اور جبلیا اپنے منصوبے کے اگلے حصے کا خاکہ تیار کرنے لگی۔

اب بوڑھے تقی نے العاضد کو جبلیا کے خلاف برگشتہ کرنے میں سرگرمی دکھلانی شروع کر دی اور اپنے پند ونصائح سے خوب اچھی طرح یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اگر نوجوان مگر بیمار العاضد نے ذرا بھی بے احتیاطی اور لاپروائی سے کام لیا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ دوسری طرف جبلیا کے علاج میں جوش وخروش کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ تقی کی طرح سفید داڑھی حنا اور وسمے کے لیپ سے سیاہ ہو گئی تھی اور سر کے چاندی جیسے بال حنا سے سرخ کر لیتے گئے تھے۔

العاضد بے چین تھا کہ جبلیا سے کس طرح ملا جائے۔ بوڑھے طبیب نے جبلیا کو سکھا رکھا تھا کہ جب العاضد اس کو دیکھنے آجائے تو اس کو اس قریب المرگ نوجوان سے بچنے کے لئے بیماری کا بہانہ بنانا چاہیئے۔ جبلیا نے ہامی بھر لی تھی۔ دوسری طرف جبلیا کے آس پاس کے لوگ العاضد کو کچھ عجیب وغریب خبریں فراہم کر رہے تھے اسے پہلے تو ان پر یقین نہ آیا لیکن جب اس نے بوڑھے طبیب کی حنا اور وسمے کی آمیزش سے سیاہ ہو جانے والی داڑھی پر غور کیا اور پھر سر کے سرخ بالوں پر نظر گئی تو اس کے شبہات یقین میں بدلنے لگے۔ ملک کے نازک اور پیچیدہ معاملات الگ مانع تھے لیکن اس کے باوجود وہ جبلیا سے ملنے پہنچ گیا۔ العاضد کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ اس نے بیمار بننے کی کامیاب اداکاری کرنا چاہی لیکن ناکام رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ العاضد میں وہ پہلی جیسی سرگرمی نہیں ہے وہ اگلا سا التفات اور لگاوٹ مفقود ہے۔ ان حالات میں اسے بھی اپنی بچائی کے مکر سے کشمکش ہونا پڑا۔ اس نے جرأت سے کام لیا اور العاضد کے سینے سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ اس کے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ العاضد نے اس کی کمر کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا اور مسہری کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔

"جبلیا! میں اس درمیان بہت زیادہ فکرمند رہا ہوں۔ اور افسوس کہ میں تیری عیادت کو بھی نہ آسکا۔ اب پہلے یہ بتا کہ تیری طبیعت کیسی ہے؟"

جبلیا کو کسی قدر اطمینان ہوا۔ بے ساختہ ہنس دی۔ بولی — "امیرالمومنین کی تشریف آوری سے پہلے میں کسی حد تک بیمار بھی تھی لیکن اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

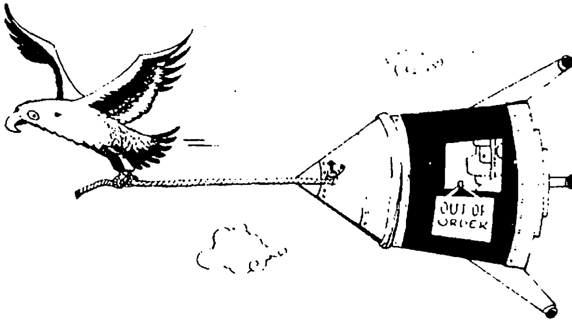
العاضد اور جبلیا مسہری پر پاس پاس بیٹھ گئے۔

کچھ فکرمندی اور تامل کے بعد العاضد نے کہا۔ "میرے خبر رسانوں نے تیرے اور طبیب کے بارے میں عجیب وغریب افواہیں پھیلا رکھی ہیں کیا تو خود بھی اس پر کوئی تبصرہ کر سکتی ہے؟"

جبلیا نے بلا جھجک عرض کیا۔ "لوگ تو عجائب پسند ہوتے ہی ہیں یہ ضرور ہے کہ امیرالمومنین کے طبیب نے میرے علاج معالجے میں غیر معمولی مستعدی اور محنت سے کام لیا ہے لیکن اس سے لوگوں میں شک و شبہ تو نہیں پھیلنا چاہیئے۔"

العاضد نے بوڑھے تقی کی داڑھی اور سر کے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔ "بوڑھے تقی کے بالوں میں مضحکہ خیز تبدیلی بھی کچھ کم معنی خیز نہیں ہے"

جبلیا نے شوخ وشریر لہجے میں سادگی سے جواب دیا۔ "ہاں اس کے لئے میں امیرالمومنین کی واقعی گناہگار ہوں جیسا کہ امیرالمومنین نے خود بھی محسوس کیا ہوگا کہ بڑھاپا میں بالکل پسند نہیں کرتی، حد تو یہ ہے کہ جب میں خود اپنے بڑھاپے کا تصور کرتی ہوں تو بڑھاپے سے قبل موت کی طالب ہو جاتی ہوں۔ اپنے اسی کراہ کے پیش نظر میں نے امیرالمومنین



کے بوڑھے طبیب سے یہ خواہش کی تھی کہ جب تک وہ میرے علاج پر مامور ہے اس کو اپنی داڑھی میں حنا اور وسمے کا آمیزہ اور سر کے بالوں میں صرف حنا استعمال کرنا چاہیئے۔"

اس جواب نے العاضد کے شکوک دور کر دیئے لیکن تھوڑی دیر بعد جب العاضد واپس جانے لگا تو جبلیا کی ایک غیر متوقع خواہش نے پچھلے شکوک اور شبہات کو ایک بار پھر زندہ کر دیا۔

جبلیا نے العاضد سے اجازت طلب کی۔" اگر اس وقت امیر المومنین تشریف نہ لاتے تو میں خود کسی وقت اذن باریابی چاہتی قاہرہ کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آ رہی ہے میں چاہتی ہوں کہ امیر المومنین کچھ دنوں کے لئے قاہرہ کے باہر بھیج دیں، میں دریائے نیل کے مشرقی ساحلی شہر اخمیم جانا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس شہر کی کھلی آب و ہوا اور قدیم قبطیوں کی شاندار یادگاریں میری صحت کے حق میں مفید ثابت ہوں گی۔"

العاضد نے دریافت کیا" اور تو اس سفر میں اپنے ساتھ کسے لے جانا پسند کرے گی؟"

جبلیا نے جواب دیا" امیر المومنین کے قابل اعتبار مخلص اور بوڑھے طبیب تقی کو۔"

العاضد چونک پڑا اور کچھ سوچتا ہوا بولا "بہتر ہے لیکن تیرے ساتھ تیری خدمت کے لئے دو کنیزیں اور چار غلام بھی جائیں گے۔"

جبلیا سمجھ گئی اور یہ دو کنیزیں اور چار غلام اس کی خدمت کیلئے نہیں، نگرانی اور جاسوسی کے لئے ساتھ کئے جائیں گے اسے اپنی عقل اور ذات پر اعتماد تھا اس نے العاضد کی اس پیشکش کو فوراً قبول کر لیا۔ سر کو جھکا کر بولی" امیر المومنین کی عنایات اور نوازش کا پیشگی شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

العاضد شکوک اور شبہات کے ساتھ واپس چلا گیا اسے جوانی اور حسن و شباب کے مجسمے جبلیا اور بوڑھے تقی کے باہمی واسطہ ارتباط کی جستجو تھی اور عقل کے پاس اس کا کوئی معقول جواز یا جواب نہ تھا۔

بوڑھے طبیب کی سرپرستی میں جب یہ مختصر قافلہ اخمیم پہنچا تو جبلیا کی خوشی کی انتہا نہ رہی دونوں کنیزیں اور چار غلام خدمت کے بہانے ہر وقت آس پاس منڈلاتے رہتے لیکن یہاں جبلیا کو کسی بات کا ڈر نہ تھا وہ نہایت بے تکلفی سے بوڑھے تقی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اہرام کی سیڑھیوں پر چڑھ جاتی اور کافی بلندی پر پہنچ کر دونوں راز و نیاز میں کھو جاتے یہاں سے اتر کر اخمیم کے سب سے قدیم چالیس ستونوں والے قبطی مندر میں گھس جاتی اور اس کی زنگار رنگ مینا کاری میں محو ہو جاتی مندر کے مختلف دالانوں میں بنی ہوئی تصویریں دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہوتی۔ ہزاروں سال پہلے کی بنی ہوئی یہ تصویریں عجیب تھیں، پر پرواز تولتے ہوئے پرندوں کی تصویریں خوش رو حسین لیکن ایک دوسرے سے مختلف وضع قطع رکھنے والے آدمیوں کی تصویریں کسی کے ہاتھ میں ہتھیار تھا کسی کے ہاتھ میں پیالہ اور کوئی خالی ہاتھ تھا۔ جبلیا انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہی اور بوڑھے تقی کو ان سے اچھی طرح لطف اندوز

ہونے کی تلقین کرتی رہی۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ یہاں برسوں رہ چکی ہو۔ یہ ساری خبریں مستعدی سے العاضد کو بھیجی جارہی تھیں جیلیا نے جب بہت زیادہ خوش ہوکر یہ کہا کہ "اب وہ یہاں سے قاہرہ واپس نہیں جائے گی۔ اور بوڑھا طبیب بھی اس کے ساتھ رہے گا۔" تو اس اہم خبر کو لے کر ایک ہرکارہ فوراً قاہرہ روانہ ہوگیا لیکن جب وہ دونوں چالیس ستونوں والے عظیم قبطی مندر میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے تو انہیں ڈھونڈتا ہوا ایک خواجہ سرا وہیں پہنچ گیا۔ وہ ایک المناک خبر لے کر آیا تھا۔ خواجہ سرا نے جیلیا کے ہاتھ میں قرطاس کا ایک پرزہ تھما دیا۔ جیلیا نے لرزتے ہاتھوں سے اس کی تہیں دور کیں اور خط پڑھنے لگی۔ اس میں لکھنے والے کا نام نہ تھا۔ اس میں لکھا تھا:۔

"آقائے ولی نعمت شاور کو قتل کر دیا گیا۔ اس کی تفصیل بہت المناک ہے۔ جب وہ کسی اہم مسئلے پر بات کرنے عباسی جنرل شیر کوہ کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ شیر کوہ امام شافع کے مزار پر گیا ہوا ہے۔ وہ یہاں سے امام شافع کے مزار کی طرف چل دیا لیکن عین روانگی کے بعد شیر کوہ کے بھتیجے صلاح الدین نے اسے قید کر کے العاضد کو اس سے مطلع کر دیا۔ العاضد نے صلاح الدین کو بار بار یہ تاکید کی کہ شاور کو قتل کر دیا جائے۔ شاور قتل کر دیا گیا۔ اب اس کی جگہ وزارت عظمیٰ کا عہدہ شیر کوہ کے حوالے کر دیا گیا۔ فوراً قاہرہ واپس آ، یہ یہاں کی تو دنیا ہی بدل چکی ہے۔"

جیلیا پر اس خبر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ شاور کا انجام وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ اسے خوشی تھی کہ راستے کا سب سے خطرناک کانٹا دور ہو چکا تھا اور منزل مراد اب کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ سیر و تفریح جاری رہی بوڑھا نقی اس وقت مندر کی ہیبت ناک عبارتوں میں کھویا ہوا تھا۔ ایک اجنبی شخص کو جیلیا کے قریب دیکھ کر مڑا اور جیلیا سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے؟"

جیلیا نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "کیا اسے نہیں پہچانتے؟ یہ قصر خلافت کا خواجہ سرا ہے اور مؤتمن الدولہ کی طرف سے ایک خاص خبر لے کر آیا ہے۔"

اس کے بعد جیلیا نے قرطاس کا پرزہ بوڑھے نقی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ جیسے جیسے اسے پڑھتا اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا۔ آخر میں اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ فرط جوش میں چلایا۔

"اے میرے آقا العاضد! بالآخر تو نے اپنے بدترین دشمن سے نجات حاصل کر لی۔"

وہ لوگ مندر کے دالانوں سے گزر کر عبادت گاہ میں داخل ہوتے اور پھر اس کے صدر دروازے سے نکل کر باہر میدان میں پہنچ

گئے ان کے گھوڑے زیتون کے سائے میں کھڑے ہنہنا رہے تھے اور ان کی لگامیں العاضد کے عطا کردہ غلاموں نے پکڑ رکھی تھیں، ابھی یہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ ان کی نظریں اس گرد و غبار پر جم گئیں جو جنوب سے بلند ہو رہا تھا اور دم بدم قریب ہوتا جا رہا تھا اور پھر گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سُنائی دینے لگیں یہ لوگ دوڑ کر اپنے گھوڑوں کے قریب پہنچ گئے اور خوفزدہ نظروں سے آنے والوں کا انتظار کرنے لگے تھوڑی سی دیر بعد اس گرد و غبار کے اندر سے کئی سو سپاہی نمودار ہوئے جو اپنے لباس سے مصری نہیں لگتے تھے، پہلے ان کا رُخ قدیم قبطی مندر کی طرف تھا لیکن ایک سوار کی نظر ان پر بھی پڑ گئی اور اس نے بآوازِ بلند کچھ کہتے ہوئے اپنے گھوڑے کی باگ ان لوگوں کی طرف موڑ دی۔ اس سوار کی اتباع میں دوسرے سواروں نے بھی اپنے اپنے گھوڑوں کا منہ اس طرف موڑ دیا۔ جو گھوڑے ذرا آگے نکل چکے تھے نصف دائرہ بناتے ہوئے زیتون کے درخت کی طرف مُڑ گئے۔

زیتون کا درخت محاصرے میں لے لیا گیا اور ان میں کا ایک شخص گھوڑے کی پشت سے کود کر نیچے آ گیا۔ اس کا سر بڑا، چہرہ بارُعب، داڑھی گھنی، پیٹ ذرا آگے کو نکلا ہوا تھا۔ وہ جبلیا اور تقی کے قریب پہنچ کر مبہوت رہ گیا اتنی حسین اور نوعمر لڑکی کسی حفاظتی سپاہ کے بغیر ایک بوڑھے اور چند آدمیوں کے ساتھ اس ویرانے میں!!

بوڑھا تقی اب انہیں اس حد تک پہچان چکا تھا کہ یہ لوگ عباسی سپاہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ادھیڑ عمر فوجی نے اِن سے ایک عام سا سوال کیا۔ "کیا تمہیں لڑنا نہیں آتا؟"

بوڑھے طبیب نے دانائی سے بھرپور جواب دیا "میں طبیب ہوں جو زخموں کا علاج تو کر سکتا ہے لیکن زخمی نہیں کر سکتا"

ادھیڑ عمر فوجی مسکرا دیا "تو بہت عقلمند معلوم ہوتا ہے"۔ اس کے بعد ان کے غلاموں کی طرف اشارہ کیا "اور یہ؟ کیا یہ بھی تیری طرح طبیب ہیں؟ تیری طرف سے یہ تو لڑ سکتے تھے!"

بوڑھے تقی نے دوسرا دانائی سے لبریز جواب دیا "یہ میرے غلام ہیں اور یہ میری مرضی کے خلاف کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکتے!"

"خوب! خوب!!" ادھیڑ عمر فوجی مسکراتا ہوا زور سے چلّایا

بوڑھے طبیب نے نہایت اطمینان سے سوال کیا "میرا خیال ہے کہ تم لوگ عباسی سپاہ سے تعلق رکھتے ہو!"

"تو ٹھیک کہتا ہے!" ادھیڑ عمر فوجی ان سے اور زیادہ قریب ہو گیا جبلیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ کون ہے؟ کیا تیری لڑکی ہے؟"

بوڑھا عجیب مخمصے میں پھنس گیا۔ بیٹی کہہ نہ سکتا تھا۔ محبوبہ کہتا تو مذاق اُڑتا اور جبلیا کے چھن جانے کا بھی خوف تھا۔ بوڑھے نے جبلیا کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس اُجڈ فوجی کے سوال کا تو ہی کوئی اچھا سا جواب دے سکتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اپنے خادم مزاحم سے کہا کہ "مجھے ایک رحل درکار ہے لا دو"

مزاحم نے تعمیلِ حکم میں ان کے لئے ایک نہایت نفیس رحل فراہم کر دی۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اسے بے حد پسند کیا، اور دریافت فرمایا "اسے کہاں سے لائے ہو؟"

مزاحم نے جواب دیا "بیت المال سے، وہاں لکڑی پڑی تھی۔ میں نے اسے بڑھئی کے حوالے کر دیا اور اس سے رحل بنوا لی"

اس جواب سے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز بہت ناراض ہوئے اور مزاحم کو حکم دیا کہ اسی وقت رحل کو لے کر بازار جاؤ اور اسکی قیمت معلوم کرو"

کچھ دیر بعد مزاحم واپس آیا تو اس نے بتایا کہ اس لکڑی اور اس سائز کی رحل بازار میں آدھے دینار میں مل جاتی ہے"

حضرت عمرؒ نے کہا "اگر ہم ایک دینار بیت المال میں داخل کر دیں تو کیا سبکدوش ہو جائیں گے؟"

مزاحم نے عرض کیا "لیکن امیرالمومنین بازار میں تو اس لکڑی اور اس سائز کی رحل آدھے دینار میں مل جاتی ہے!"

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے فکرمند اور خوفزدہ لہجے میں کہا "اچھا لیکن تم بیت المال میں اس کی قیمت میں ۲ دو دینار جمع کر دو"

اب جیلیا نے اپنے لب کھولے اور دلوں میں ہلچل مچا دینے والی آواز میں کہا ”میں قصرِ فاطمی سے تعلق رکھتی ہوں اور یہ بوڑھا طبیب العاضد کا طبیب خاص بھی ہے اور اتالیق بھی، ہم لوگ تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے اخمیم آئے تھے۔“

مؤتمن الدولہ کا قاصد خواجہ سرا بھی موجود تھا ادھیڑ عمر فوجی نے اس کی طرف اشارہ کیا۔”اور یہ کون ہے؟“

جیلیا نے جواب دیا۔”یہ ہمارا غلام ہے!“

”غلط جھوٹ!“ وہ چیخا۔”یہ ضرور کوئی خاص پیغام لے کر آیا ہے اس کا تیز رفتار گھوڑا اور اس کے بھاگنے کا اندھا دھند انداز ہی تو ہمیں یہاں تک کھینچ لایا ہے!“

اتنا کہہ کر اس فوجی نے نہایت بے باکی سے ان کی تلاشی لینا شروع کر دی اور جیلیا کے پاس سے مؤتمن الدولہ کا پیغام برآمد کر لیا اور اسے پڑھتے ہی بے ساختہ ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ وہ پھر چیخا۔

”احمق لڑکی! تو ہمیں بے وقوف نہ بنا۔ سچ سچ بتا کہ تیرے ملعون شاور سے کس قسم کے تعلقات رہے ہیں اور یہ بات بھی ذہن میں رکھ کر اس وقت تو اسدالدین شیرکوہ سے مخاطب ہے میں جھوٹ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔“

جیلیا خوفزدہ ہو کر گال سہلانے لگی یہ تو ان مصریوں سے بالکل مختلف تھا جنہیں اب تک یہ بہلاتی پھسلاتی رہی ہے۔ بوڑھا طبیب خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا لیکن مجبور تھا۔

ان سب کو حراست میں لینے کے بعد انہی کی نشاندہی پر دونوں کنیزیں بھی گرفتار کر لی گئیں، عباسی جنرل اچھی طرح تحقیق و تفتیش اور جرح اور بحث کے بغیر ان پر اطمینان نہ کر سکتا تھا۔ قاہرہ پہنچ کر جب یہ قیدی عباسی سپاہ کے درمیان سے گزر رہے تھے تو جیلیا پر ہزاروں للچاتی نظریں نچھاور ہو رہی تھیں، لیکن اسدالدین شیرکوہ اس طرح چل رہا تھا گویا جیلیا کے زندگی شکن حسن کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا ہو متاثر وہ بھی تھا لیکن اسے اپنی طبیعت پر قابو حاصل تھا اور اندرونی طوفان کے آثار اس کے چہرے سے بالکل ظاہر نہ ہوتے تھے

جیلیا کی طبیعت بھی کچھ عجیب تھی جب وہ اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ قید تنہائی گزار رہی تھی تو اس کے تصورات پر شیرکوہ کا قبضہ تھا وہ شیرکوہ جو اب مصر کا وزیر اعظم تھا، خلافت عباسی کا تجربہ کار مشہور اور بااختیار جنرل جو محض سپاہی تھا، شجاعت اور دلیری جس کی ہر ہر ادا اور ایک ایک بات میں پائی جاتی تھی اسے یقین تھا کہ یہ شاور جیسا وزیر اعظم ہرگز نہ ہوگا شیرکوہ کا مستقبل سب سے زیادہ روشن تھا۔ بیمار اور نادان العاضد کے بجائے اب وہ اس سنگلاخ قلعے کو سر کرے گی۔ اس نے شیرکوہ کی تسخیر کا ارادہ کر لیا اور اس کا پہلا سبق یہ تھا کہ جب شیرکوہ تخلیئے میں اس سے اس کے ماضی اور اصل حیثیت کے بارے میں سوالات کرنے بیٹھا تو کسی سوال سے پہلے ہی اس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ اس نے کہا۔”میں شاور کی آلۂ کار نہیں بن سکتی تھی اس لئے میں قاہرہ سے اخمیم چلی گئی تھی میں العاضد کے محل میں بھی واپس نہیں جانا چاہتی!“

شیرکوہ اس کے بیان سے مطمئن ہو گیا۔”اب تو کیا چاہتی ہے؟“

جیلیا کے گالوں پر شرم و حیا کی سرخی دوڑ گئی۔”میں اب قصرِ خلافت واپس نہیں جانا چاہتی۔“

”پھر؟“ شیرکوہ ٹہلنے لگا۔”پھر تو کیا چاہتی ہے؟ تو کہاں جانا چاہتی ہے؟“

جیلیا نے گویا عالم سرخوشی سے جواب دیا۔”اخمیم میں زیتون کے سائے تلے لگائے جانے والے طمانچے کی لذت میں زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں گی تو بہادر ہے اور میں اس بہادر سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔“

”احمق، پاگل!“ شیرکوہ ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔”نادان لڑکی! میری شادی ہو چکی ہے اور میرے کئی بچے بھی ہیں!“

جیلیا نے جواب دیا۔”مجھے ان سے کوئی غرض نہیں، آؤ ہم دونوں ایک معاہدہ کر لیں جب تک تو مصر میں رہے گا میں تیرے ساتھ رہوں گی جب تو یہاں سے جائے گا تو میں یہیں رہ کر تیرا انتظار کروں گی اس طرح میں اور تیری بیوی دونوں ایک دوسرے کی رقابت اور حسد سے بھی محفوظ رہیں گے۔“

جیلیا کی تجویز بہت معقول تھی اس لڑکی نے شیرکوہ کو اندر سے کچھ کمزور کر دیا تھا۔ اس نے کہا۔”اچھا مجھے سوچنے کا موقع دے۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

اس کے بعد جیلیا کی قید تنہائی ختم ہو گئی دونوں کنیزیں اس کی خدمت پر مامور کر دی گئیں اور باہر سپاہی ان کی نگرانی پر متعین کر دیئے گئے جیلیا کو شیر کوہ پر مشتبہ فتح حاصل ہو گئی تھی۔

شیر کوہ نے جیلیا کی درخواست منظور کر لی تھی لیکن اس کے لئے اپنی طرف سے جو کڑی شرط عائد کر دی تھی وہ بڑی جان جوکھم کا کام تھا۔ اس نے کہا "جیلیا! تو قصر خلافت میں واپس جا۔ میں محبت کی قدر کرتا ہوں لیکن کسی ایسی محبت پر یقین نہیں رکھتا جو تیری طرح اچانک ہو گئی ہو۔ میں تیری محبت کو پرکھنا چاہتا ہوں!"

جیلیا نے قصر خلافت کی واپسی کے حکم کو سنا اور کرب سے بے چین ہو گئی تاہم اس نے صبر و سکون سے دریافت کیا "بہادر جرنل! تو بھی صحیح کہتا ہے میری طرف سے جس سادگی اور سادہ لوحی سے محبت کا اظہار ہوا ہے تیرے جیسے غیر مصری کو اس پر شبہ ہی کرنا چاہیئے۔"

شیر کوہ نے ناگواری سے اکھڑے لہجے میں کہا "میں زیادہ باتیں پسند نہیں کرتا اور اس وقت تک جب تک کہ تو اپنی بے لوث محبت کا یقین نہ دلائے میں تجھ سے باتیں بھی کس قسم کی کر سکتا ہوں۔"

جیلیا نے بھی کھرے لہجے میں سوال کیا۔ "اپنی شرط بیان کر جنگجو بند۔"

شیر کوہ نے کسی قدر تامل سے کہا۔ "تو العاضد کے آس پاس رہ اور وہاں کے حالات سے کسی بھی طرح مجھے باخبر رکھ۔"

پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "اپنی خدمات کے صلے میں تو جو کچھ پائے گی اس کا تو قبل از وقت تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اشارتاً یہ بس اتنا بتا دینا کافی ہے کہ حجاز سے طابخیر تک اور بغداد سے ماوراء النہر تک ایک خلافت رہے گی اور وہ ہو گی خلافتِ بغداد، مصر کی بیمار خلافت کو اب مزید زندہ نہیں رہنا چاہیئے۔"

شیر کوہ نے جیلیا کے چہرے کا جائزہ لیا اور اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپنے کی کوشش کی۔ اور پھر آخری وار کیا۔ "مصری خلافت کا زوال زیرِ عروج ہو گا کیونکہ یہاں کی حکومت شیر کوہ کے سوا کسی دوسرے کو نہیں مل سکتی۔"

جیلیا کی جاہ پسند طبیعت شکست کھا گئی اور سنہرے مستقبل کا خوش



آئند تصور فاطمی خلافت کی بنیادیں کھوکھلی کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ جیلیا نے دریافت کیا۔ "لیکن محلسرا کی خبریں تجھ تک کس طرح پہنچیں گی؟"

شیر کوہ نے اس طرح جواب دیا گویا سارا انتظام پہلے ہی سے کیا جا چکا ہے "محلسرا کے ملوک نگران اور پہرے دار تجھ سے خود ہی رابطہ قائم کر لیں گے۔"

جیلیا نے جواب دیا۔ "میں تیار ہوں اور تو جس طرح کہے گا کروں گی لیکن میری خواہش ہے کہ تو مجھے اپنی ہدایات پر چلا۔ مجھے اپنی خود اعتمادی پر اتنا بڑا بھروسا نہیں ہے کہ مصری خلافت کو ڈھا سکوں۔"

شیر کوہ نے کہا۔ "بہتر ہے کل صبح تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ فاطمی محلسرا واپس چلی جا اور العاضد کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر۔"

جیلیا کو سکون حاصل ہو چکا تھا اور شیر کوہ زیرِ دام آ چکا تھا اس کے خیال میں بوسیدہ اور دیمک خوردہ مصری خلافت کو ڈھا دینا اتنا بڑا کام بھی نہ تھا۔

دوسرے دن صبح شیر کوہ نے جیلیا، بوڑھے تقی اور ان کے آدمیوں کو مختصر سے معذرت نامے کے ساتھ العاضد کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

العاضد کو اب تک اخمیم سے جیلیا کے بارے میں جیسی شرمناک

اور حیا سوز اطلاعات پہنچی تھیں۔ انہوں نے اسے آتش زیر پا کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ پھر جب اسے یہ اطلاع ملی کہ انہیں شیرکوہ نے گرفتار کر لیا ہے تو اس کا غصہ شیرکوہ کی طرف منتقل ہو گیا لیکن اس کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھایا جاسکتا تھا شیرکوہ کی حیثیت فاتح جیسی تھی اور مصری خلافت کی مفتوح جیسی لیکن جب العاضد کو یہ خبر پہنچی کہ شیرکوہ نے ان قیدیوں کو عزت و احترام کے ساتھ محلسرائے خلافت واپس بھیج دیا ہے تو اس کے دل میں شیرکوہ کی قدر و منزلت پہلے سے زیادہ ہو گئی۔

اسے اطلاع ملی کہ جبیلیا اور بوڑھا طبیب دونوں اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے ہیں تو ان دونوں کے خلاف اس کے تن بدن میں ایک آگ سی لگ گئی۔ دلنواز مطربائیں العاضد کی افسردگی اور تکدر کو دور کرنے کی کوششیں کر رہی تھیں کہ جبیلیا اور اتالیق حاضر کر دیئے گئے۔ بوڑھے نقی نے اپنے دونوں ہاتھ ناف پر رکھ لئے اور نادم و شرمسار گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ العاضد اپنے بزرگ اتالیق کو دوسروں کے سامنے پھر بھی ذلیل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے کنیزوں کو رخصت کر دیا۔

العاضد کے ہاتھ میں دُرّہ تھا اور مارے غصے کے بار بار اسے حرکت دے رہا تھا۔

العاضد کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اس نے حقارت سے بوڑھے اتالیق کو گھورا اور سوال کیا۔ "او بوڑھے ناصح کیا تو اب بھی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ تو جبیلیا سے محبت نہیں کرتا اور یہ محبت کیا اس نوع کی نہیں ہے جس کے محرک سفلہ جذبات ہوا کرتے ہیں؟"

بوڑھے نے آہستہ سے اقرار کیا۔ "مجھے اقرار ہے!"

العاضد نے دُرّے کو فضا میں لہرایا اور زمین پر دے مارا۔ "کیا تو اس سے بھی انکار کر سکتا ہے کہ جبیلیا میری امانت تھی اور تو نے خیانت کی؟"

بوڑھے نے انکار کیا۔ "میں نے خیانت نہیں کی!"

"تو جھوٹ بولتا ہے!" العاضد کپکپانے لگا۔ "کیا تو جبیلیا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے قدیم مصری بادشاہوں کے مقبروں کی سیڑھیوں پر چڑھا اُترا نہیں کرتا تھا؟"

"مجھے اس کا اقرار ہے!" بوڑھے نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور یہ کہ" العاضد کہنے لگا۔ "اخمیم کے قدیم چالیس ستونوں والے مندر کے دالانوں میں کیا تو نے جبیلیا کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا؟"

"میں انکار نہیں کروں گا، درست ہے!" بوڑھا اطمینان سے بولا۔

"اور یہ کہ تو نے جبیلیا کو اپنی آغوش میں لے کر بوسہ لیا۔ کیا یہ غلط ہے؟" العاضد تھر تھرا رہا تھا۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا مجھے اقرار ہے!" بوڑھے نے جواب دیا۔

"اور یہ بھی بتا کہ تو نے اپنی روئی جیسی سفید داڑھی کو خضاب اور وسمے کے آمیزے سے سیاہ کیا اس لئے نہیں کیا تھا کہ نوجوان جبیلیا کے دل میں نوجوانوں جیسی شکل بنا کر رسائی حاصل کرے؟"

بوڑھے نے مختصر جواب دیا۔ "یہ بھی درست ہے!"

العاضد نے دُرّے کو ایک بار پھر ہوا میں لہرا کر زمین پر دے مارا۔ "جب سب کچھ درست ہے سب کچھ صحیح ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ کیا ایسا کرتے وقت تیرے حافظے سے وہ نصیحتیں اور ہدایتیں محو ہو گئی تھیں جو تو جبیلیا کے بارے میں مجھے دیا کرتا تھا؟"

"نہیں مجھے وہ سب کچھ آج تک یاد ہے۔"

"تو بوڑھا بھی ہے اور میرا اتالیق بھی میں تجھے کوئی سزا نہیں دینا چاہتا لیکن تجھے اپنی فرد جرم کی صفائی میں یہ ضرور بتانا پڑے گا کہ ایسا کیوں ہوا؟" العاضد کو ضد ہو گئی تھی۔

بوڑھے نے گردن اوپر اُٹھائی اور ہاتھ سے جبیلیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "امیر المومنین پہلے اس سے اس نوع کے سوالات کریں میں اس کے جوابات سننے کے بعد کوئی جواب دوں گا۔"

العاضد طیش میں جبیلیا کی طرف گھوم گیا اور اس کی نرم و نازک پشت پر ایک دُرّہ رسید کر دیا وہ بلبلا گئی۔ العاضد نے غصے میں پوچھا "ابھی میں نے جو سوالات اپنے اتالیق سے کئے تھے کیا تو انہیں سن رہی تھی"

جبیلیا نے روتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

العاضد نے تڑپ کر پوچھا۔ "تیرے پاس اپنی برأت کے لئے کیا جواب ہے؟"

جیلیک کے حلق سے یوں آواز نکلی جیسے وہ اندر سے ڈھکیلی جا رہی ہو "امیرالمومنین! میں قسم کھا سکتی ہوں کہ میں نے اِس احمق بوڑھے سے آج تک محبت نہیں کی، اس طرح میں دراصل اپنی اس اہانت اور سُبکی کا بدلہ لے رہی تھی جو پہلی بار امیرالمومنین کے روبرو اس سے سرزد ہوئی تھی اب امیرالمومنین چاہیں تو مجھے قتل کرا دیں میں نہ تو اس احمق سے محبت کرتی تھی اور نہ اب اس کے لئے میرے دل میں کوئی گنجائش ہے"

العاضد کو جیلیا کی یہ صاف گوئی بہت بھلی لگی۔ اسے ہنسی آ گئی مُسکرا کر بولا "اری احمق کیا یہ بہتر نہ تھا کہ تو اسے معاف کر دیتی؟"

جیلیا نے کراہتے ہوئے کہا "میں نے اس کو سزا ہی کون سی دی ہے؟"

العاضد ہنستا ہوا بولا "کیا تو اسے سزا نہیں سمجھتی کہ یہ جدھر جاتا ہے لوگ اس کا تمسخر اڑاتے ہیں؟"

اس کے بعد وہ بوڑھے اتالیق کی طرف مخاطب ہوا "جیلیا کے خوبصورت جواب نے مجھے ٹھنڈا کر دیا ہے اب میں تیری زبان سے کچھ سُننا چاہتا ہوں"

بوڑھے نے اپنا پُرانا لہجہ اختیار کیا "جیلیا تو احمق تھی جس نے یہ سمجھ لیا کہ یہ بوڑھا اس کا عاشق ہو گیا ہے اور امیرالمومنین نے بھی رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام لیا۔ میں عاشقوں کی طرح اس شریر اور چالاک لڑکی کے پیچھے پھرتا رہا۔ میں نے اکثر و بیشتر اس سے اظہارِ عشق بھی کیا ہے، اس کے ہاتھوں اور رخساروں کے بوسے بھی لئے اس کو آغوش میں بھینچا لیکن ایک ایسی لغزش جسے خیانت کہا جا سکتا ہے۔ میں اس کا مرتکب نہیں ہوا"

پھر وہ اپنے کردار کی اصل بُلندی پر پہنچ گیا اور کہنے لگا "امیرالمومنین کو میں نے جب بھی اِس لہو و لعب سے دور رہنے کی تلقین کی، اس کا ہمیشہ مقصد یہی ہوتا تھا کہ شہزادے میں ابھی ناتجربہ کاری ہے، خلافت کا بہت بڑا بوجھ کاندھے پر ہے اگر امیرالمومنین اس طرف راغب ہو گئے تو پھر اپنے حصّے کے بڑے بڑے کام کس طرح انجام دیں گے۔ امیرالمومنین نے مجھ کو لاعلم رکھ کر طے کیا کہ جیلیا سے چوری چھپے ملتے بھی رہیں اور اس ملاقات میں اعتدال بھی قائم رکھیں۔ یہاں پہنچ کر میں صرف یہ عرض کروں گا کہ جس زور آور تسابق نے ایک بوڑھے کو اس حد تک دیوانہ و وارفتہ کر دیا ہو وہ کسی جوان کو کہاں تک ٹھکانہ بنا دے گا۔ میری حماقت امیرالمومنین کے حق میں تازیانۂ عبرت رہے"

العاضد کا سارا غصّہ کافور ہو گیا۔ ساری کدورتیں دُھل گئیں۔ اس نے بوڑھے تقی کو چلے جانے کی اجازت دے دی جب بوڑھا اتالیق چلا گیا تو العاضد نے جیلیک کے دونوں گال پیار سے تھپتھپائے اور کہنے لگا۔ "شریر لڑکی! تو نے اِس بوڑھے کو بہت ہلکان کر دیا لیکن دیکھا کہ یہ بوڑھا تجھ سے بھی زیادہ چالاک نکلا"

جیلیک نے جواب دیا "بوڑھا اپنی چالاکی سے جان بچا لے گیا ورنہ میں جانتی ہوں کہ اس کی چاہت حقیقی تھی یا وہ اداکاری کر رہا تھا"

العاضد نے کہا "اچھا اب جا اور آرام کر، میرا خیال ہے کہ اب یہ اتالیق ہم دونوں کی راہ میں اتنی شدت سے مزاحم نہ ہو گا وہ اپنا سلسلہ

جب وہ رات کی تاریکی میں سنسان سڑک سے گزر رہا تھا، چند لٹیروں نے سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر کے اس کی کار کو روک لیا اور اس کو حکم دیا کہ "کار سے نیچے آ جاؤ"

اس نے نہایت سعادت مندی سے لٹیروں کے حکم کی تعمیل کر دی لیکن قدرے تامل کے ساتھ۔

لٹیروں نے اس کی تلاشی لینی شروع کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پولیس اسٹیشن پہنچ چکا تھا وہاں اس نے اپنے لُٹنے کی روداد سناتے ہوئے کہا "جب انھوں نے میری کار روک کر مجھے نیچے اترنے کا حکم دیا تو میں قدرے تامل کے بعد کار سے باہر آ گیا، انھوں نے میری تلاشی لی نقدی کے بعد میری دونوں انگلیوں سے قیمتی انگوٹھیاں اور کلائی سے گھڑی بھی اتار لی اور ایک طرف فرار ہو گئے"

انسپکٹر کی نظریں اس کے ہاتھ کے ریوالور پر جمی ہوئی تھیں ——

انسپکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

"لیکن جناب یہ ریوالور، اس کو ——"

اس نے انسپکٹر کی بات کاٹ دی "اس کو میں نے جلدی سے اپنی سیٹ کے نیچے چھپا دیا تھا ورنہ وہ اسے بھی لے جاتے"

زور ختم کر چکا ہے۔"

جیلیا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آناً فاناً پورا محلسرا مایوسی کا شکار ہو گیا، اندر ایک نفسیاتی تحریک چل رہی تھی، ہر شخص مصری خلافت کے زوال کا منتظر تھا ہر آدمی اس پر یقین رکھتا تھا کہ قصرِ فاطمی کا اقتدار اب چند روزہ ہے اس مایوسی اور غیر یقینی کیفیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر وہ ذات جس کی وفاداریاں اور خدمات محلسرا اور العاضد سے تعلق رکھتی تھیں اس میں سرد مہری اور بیزاری پائی جانے لگی، العاضد حیران تھا کہ اس کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے لیکن کچھ پتا نہ چلتا تھا، خلافت کے بڑے بڑے عہدے دار خود بخود شیر کوہ کے سامنے جوابدہ ہوتے، العاضد ان سب سے کٹ گیا تھا۔ اس نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ مصر کا اقتدار عملاً شیر کوہ کو منتقل ہو چکا ہے اور اس کی موجودہ حیثیت شطرنج کے بادشاہ سے زیادہ نہیں ہے اور افسوس تو یہی تھا کہ اس بے بسی کا کوئی علاج بھی نہ تھا۔

اس دوران جیلیا کو شیر کوہ کا ایک خاص پیغام ملا۔ اس میں اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی بھی طرح شیر کوہ سے ملنے کی کوشش کرے۔ کچھ ایسی باتیں ہیں جنہیں لکھا نہیں جا سکتا۔ جیلیا نور شیر کوہ کی عاشق تھی اور محلسرا سے نکلنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا لیکن یہ مشکل بھی آسان ہو گئی کسی مملوک نے اس کو یہ بُری خبر سنائی کہ العاضد اس کی نگرانی کر رہا ہے اور اس کی بہت سی باتیں پکڑی جا چکی ہیں، ان حالات میں جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے فرار ہو جاؤ۔

جیلیا نے جلدی جلدی ضروری سامان سمیٹا اور العاضد سے ملے بغیر چوروں کی طرح رات کی تاریکی میں محلسرا سے باہر نکلی، پہرے دار مملوک اس کے رہبر اور محافظ تھے۔ صبا رفتار گھوڑے تیار کھڑے تھے جیلیا اچھل کر مردوں کی طرح اس کی پشت پر سوار ہو گئی، تین مملوک اس کے ہمرکاب تھے یہ بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ جیلیا نے دُلکی چلا کر ایک دم ایڑ لگا دی، محلسرا کے چند سواروں نے ان کا تعاقب بھی کیا لیکن اس کے مملوک سپاہیوں نے انہیں خاک و خون میں لوٹنے کے لئے زخمی کر کے گرا دیا۔ اور یہ لوگ بہت جلد خطرناک علاقے سے گزر کر شیر کوہ کی حدود میں داخل ہو گئے۔

جب یہ لوگ شیر کوہ کی قیام گاہ میں پہنچے اس وقت وہ بسیار خوری میں مصروف تھا شیر کوہ کے پسندیدہ دو ہی کام تھے ایک نت نئے علاقے فتح کرنا اور دوسرا دس پانچ آدمیوں کی خوراک تنہا کھا جانا وہ بہت دیر سے کھانے میں مصروف تھا اور بہت سے برتن خالی کر چکا تھا اُس نے اک نگاہِ غلط انداز سے جیلیا کو دیکھا اور کھانے میں مشغول ہو گیا شیر کوہ کے آس پاس جو لوگ موجود تھے انہی میں اس کا تئیس سالہ نوجوان بھتیجا صلاح الدین ایوبی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ شیر کوہ نے جیلیا کا صلاح الدین سے تعارف کرایا۔

"بھتیجے یہی وہ قتالۂ عالم ہے جس نے نفسیاتی جنگ لڑ کر ہمارے لئے جگہ ہموار کر دی ہے۔"

صلاح الدین نے ایک اُچٹتی نظر جیلیا پر ڈالی اور گردن جھکا لی۔

اب جیلیا بالکل اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ شیر کوہ نے جیلیا کو مخاطب کیا "اور دیکھ! یہ میرے بھائی شادی بن ایوب کا بیٹا اور میرا بھتیجا ہے اس نے تیرے وطن اسکندریہ کے محاصرے اور حملے کو جس ہمت اور استقلال سے روکا تھا اس پر مجھے فخر ہے۔"

صلاح الدین نے بے ساختہ کہا "چچا! اب بس بھی کرو بہت کھا چکے!"

ابھی صلاح الدین کا فقرہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ شیر کوہ گر گیا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ ایک ہلچل مچ گئی ایک کہرام برپا ہو گیا۔ صلاح الدین نے جیلیا کو دوسرے حصے میں پہنچا دیا اور خود شیر کوہ کو سنبھالنے لگا کئی دوسرے لوگ بھی بھاگے ہوئے آئے اور شیر کوہ پر جھک گئے۔ شیر کوہ پیٹ کے درد سے شیر کی طرح ڈکار رہا تھا ہر شخص پریشان تھا طبیب بلائے گئے لیکن صبح ہوتے ہوتے شیر کوہ رخصت ہو چکا تھا وہ مر گیا۔

طبیبوں نے اس کی موت کا سبب اس کی بسیار خوری کو قرار دیا۔

شیر کوہ کی موت کو لوگوں سے مخفی رکھا گیا لیکن العاضد کو مطلع کر دیا گیا کیونکہ شیر کوہ کی موت سے مصری وزارتِ عظمیٰ کی جگہ خالی ہو گئی تھی العاضد شیر کوہ جیسے گھاگ سے ذرا خوفزدہ بھی رہا کرتا تھا لیکن جب اس کے مرنے کی خبر سُنی تو دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔

جیلیا بھی بہت خوفزدہ تھی تقدیر اس کے خلاف تھی شیرکوہ کی بے وقت اور اچانک موت نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔

اب وہ عکسلر میں واپس بھی نہ جا سکتی تھی اور یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اب شیرکوہ کے بعد وزیر اعظم کسے بنایا جائے گا وہ یہ بھی خوب سمجھ رہی تھی کہ فاطمی ہرکارے قاہرہ کے گلی کوچوں میں اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے اسے اس بات کا بھی ملال تھا کہ شیرکوہ نے اس کو جس غرض سے بلایا تھا اسے بتائے بغیر ہی رخصت ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی میں اتنا مایوس کن وقت کبھی بھی نہ آیا تھا۔

شیرکوہ کی تجہیز تکفین کے بعد صلاح الدین ایوبی جیلیا کے پاس پہنچا اور سوگوار لہجے میں دریافت کیا "اب تو کہاں جانا پسند کرے گی؟"

جیلیا نے رقت سے جواب دیا "تیرے چچا شیرکوہ نے مجھ سے کچھ وعدے کئے تھے ان وعدوں کی رو سے تیرے چچا کا گھر میرا گھر تھا لیکن اب ان کا ذکر ہی فضول ہے!"

صلاح الدین ایوبی نے کہا "اب تیرا ارادہ کیا ہے؟ کیا تجھے عکسلر واپس بھیج دیا جائے؟"

جیلیا روہانسی ہو گئی "نہیں میں وہاں نہیں جاؤں گی میں عکسلر سے چوروں کی طرح فرار ہو کر آئی ہوں اب وہاں واپس نہیں جا سکتی"

"پھر؟" صلاح الدین نے مختصر سا سوال کیا۔

"کچھ دنوں کے لئے مجھے اپنی پناہ میں رکھ اس کے بعد دیکھا جائے گا تو نہیں جانتا کہ قصر فاطمی کے شکاری میری تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہوں گے!"

صلاح الدین اس پر رضامند ہو گیا جیلیا اس کے مرحوم چچا کی امانت تھی اور اس امانت کی حفاظت اس کا فرض اور اس کی ذمہ داری تھی۔

دوسری طرف العاضد کے آدمی واقعی نہایت خاموشی اور سرعت کے ساتھ جیلیا کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔

وزارت عظمیٰ کا عہدہ زیادہ دنوں تک خالی نہیں رکھا جا سکتا تھا خلافت بغداد کے جو جنرل اس وقت قاہرہ میں موجود تھے۔ ان کی فہرست العاضد کے سامنے پیش کر دی گئی۔ العاضد نے بوڑھے اتالیق کو اس کام پر مامور کیا کہ ان جنرلوں کے آگے ان کی عمریں بھی لکھ دی جائیں۔ اس فہرست کا آخری نام صلاح الدین ایوبی تھا اور دوسرے جنرلوں کے مقابلے میں سب سے کم عمر بھی یعنی صرف تیس سال۔

العاضد نے بوڑھے اتالیق سے دریافت کیا "اس فہرست کے کس جنرل کو مصر کی وزارت عظمیٰ سونپی جائے کیا تو بتا سکتا ہے؟"

بوڑھے اتالیق نے فہرست کو بغور پڑھا پھر عرض کیا "شیرکوہ کے بھتیجے صلاح الدین کو"

العاضد نے دریافت کیا "کیوں؟ کیا یہ نوعمر جوان وزارت عظمیٰ جیسے بھاری بوجھ کو اٹھا لے گا؟"

بوڑھے اتالیق نے جواب دیا "یہ وزارت عظمیٰ کا بوجھ اٹھا سکے یا نہ اٹھا سکے لیکن یہ ضرور ہے کہ چونکہ یہ نوجوان ہے اس لئے کچھ نہ کچھ ناسمجھ بھی ہو گا اس کی ناتجربہ کاری امیر المومنین بآسانی قابو برقرار رکھ سکیں گے۔"

لیکن کسی تجربہ کار اور عمر رسیدہ جنرل پر آپ بالکل حکومت نہ کر سکیں گے"
بوڑھے اتالیق کی باتیں درست تھیں۔ العاضد نے خلعت فاخرہ اور اعلان خلافت کے ذریعہ صلاح الدین کو وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کر دیا۔ عمر رسیدہ جنرلوں نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا لیکن صلاح الدین ایوبی نے حسن تدبیر سے اس احتجاج کو بے اثر کر دیا۔

جیلیا پھر خوش ہو گئی۔ اس کی شوخی ایک بار پھر عود کر آئی حوصلے جوان ہو گئے۔ اس نے سوچا کہ ادھیڑ عمر شیر کوہ کی موت بہت ضروری تھی جب لوگ شیر کوہ کی آغوش میں اسے دیکھتے تو کیا کہتے؟ اور صلاح الدین؟ یہ ہر لحاظ سے موزوں ہے۔ وہ گھنٹوں صلاح الدین کے تصور اور انتظار میں بیٹھی رہتی لیکن اب اس کی شکل تک نہ دکھائی دیتی تھی وہ وزارت کی ذمہ داریوں میں الجھ کر رہ گیا تھا جیلیا کو یہاں کوئی تکلیف بھی نہ تھی لیکن تنہائی اور صلاح الدین کی بے التفاتی سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس نوجوان کی تسخیر سب سے مشکل نظر آ رہی تھی۔

العاضد کے آدمی جیلیا کی تلاش سے اکتا گئے خود العاضد جیلیا کی جدائی سے مغموم رہنے لگا اور بوڑھا اتالیق جیلیا کے بارے میں اپنے لب تک کھولنا گناہ سمجھتا تھا وہ اس لڑکی سے ڈرنے لگا تھا۔

اس طرح کچھ عرصہ گزر گیا اور جیلیا بے کیفی کا شکار ہو گئی۔

لیکن حالات نے یک بیک پلٹا کھایا اور جیلیا اور صلاح الدین ایوبی کے بارے میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ صلاح الدین گھبرا گیا۔ بغداد سے اس کے باپ کا ایک خط آیا جس میں اس سے جواب طلب کیا گیا تھا کہ بیٹے! جوانی اور رسوائی لازم و ملزوم ہیں لیکن کیا سچ مچ تو نے رسوائی کا سامان اپنے گھر میں رکھ چھوڑا ہے؟"

صلاح الدین ایوبی کو شرم آ گئی وہ اپنے باپ کا خط لے کر جیلیا کے پاس پہنچ گیا اور دریافت کیا۔

"اب حالات پر سکون ہیں تو نے اپنی بابت کیا فیصلہ کیا؟"

جیلیا کو غصہ آ گیا کہ عجیب بد مذاق اور جذبات سے عاری نوجوان ہے تاہم مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تیرے چچا نے میری جو قیمت متعین کی تھی کیا تیری نظر میں وہ غلط تھی؟"

صلاح الدین ایوبی اس ذہین لڑکی کی بات کا مطلب سمجھ گیا اس نے اپنے باپ کے خط کا مضمون پڑھ کر جیلیا کو سنایا اور کہا "صرف یہی نہیں میرے آس پاس بھی اسی قسم کی سرگوشیاں ہونے لگی ہیں!"

جیلیا نے شریر مسکراہٹ سے جواب دیا "تیرے باپ نے ٹھیک ہی تو لکھا ہے کہ جوانی اور رسوائی لازم و ملزوم ہیں جو شے جوانی کا مقدر ہو اس سے گھبرانا کیا؟"

صلاح الدین نے دل برداشتہ ہو کر کہا "میں چچا مرحوم کی وجہ سے تیری عزت کرتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تو خود بھی اسے برقرار رکھ!"

ابھی بات چیت جاری تھی کہ صلاح الدین ایوبی کو اطلاع ملی العاضد اپنے وزیر اعظم سے محلسرا کے اندر ملاقات کرنا چاہتا ہے جو وفد یہ پیغام لے کر آیا تھا بوڑھا اتالیق اس کا سربراہ تھا صلاح الدین نے وفد کو باہر ہی ٹھہرایا اور جیلیا سے مشورہ کرنے اندر آ گیا۔ اپنے مختصر دور وزارت میں پہلی بار صلاح الدین کو جیلیا کی اہمیت اور ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

اس نے جیلیا سے دریافت کیا "تو محلسرا کی سیاست سے اچھی طرح واقف ہے العاضد مجھ سے اپنے قصر میں ملاقات کا متمنی ہے مجھے مشورہ دے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

جیلیا کے دل میں امیدیں پھر جاگ اٹھیں، صلاح الدین اس سے مشورہ کر رہا تھا اس نے جواب دیا۔

"انکار کر دے یہ ضرور کسی سازش کا حصہ ہے وہاں سے تیری واپسی مشکل ہو جائے گی۔"

صلاح الدین نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور حیلے حوالے کر کے وفد کو واپس کر دیا۔

جیلیا نے بڑی کوشش کی اور غمزہ و ادا کے جتنے تیر تھے صلاح الدین پر سارے ہی آزما ڈالے لیکن ناکام رہی صلاح الدین جیلیا کے حسن، دلکشی صحت، توانائی، ذہانت و فطانت کا دل سے قائل تھا لیکن اسے مستقلاً اپنانے پر آمادہ نہ تھا جیلیا صلاح الدین سے وابستہ ہو کر مصر پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی لیکن یہ خواب منتشر ہو گیا جب وہ ہر طرح

مایوس ہوگئی اور صلاح الدین کے دل میں جگہ حاصل کرنے میں ناکام رہی تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ اسے ایک بار پھر قصرِ فاطمی پہنچنا ہے اور اگر وہ العاضد کو ایک بار پھر بہلا پھسلا سکی تو وہ ہر ممکن کوشش سے صلاح الدین کو وزارت عظمیٰ سے ہٹوا دے گی۔

اس نے صلاح الدین سے کہا "میں محلسرا واپس جانا چاہتی ہوں!"

صلاح الدین نے حیرت سے پوچھا "محلسرا؟ کیا تجھے اس کا یقین ہے کہ وہاں تجھے کوئی گزند نہ پہنچے گا؟"

جمیلیا نے جلے کٹے لیکن قدرے سوگوار لہجے میں جواب دیا "میں زندگی سے بیزار ہوں اگر وہاں پہنچ کر قتل کردی گئی تو میرا یہ انجام میری توقع کے خلاف نہ ہوگا اگر زندہ رہ گئی تو بے کیف زندگی پر قناعت کرلوں گی۔"

صلاح الدین نے کہا "تیری مرضی!"

جمیلیا نے دھمکی دی "لیکن اگر میں محلسرا میں زندہ بچ گئی تو بتا نہیں کس کس کے لئے میں وبال جان بن جاؤں میں ناکامی کا زخم برداشت نہیں کرسکتی۔"

لیکن صلاح الدین پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا جمیلیا محلسرائے خلافت میں داخل ہوگئی لیکن جب وہ العاضد کو مستقل اپنا لینے کے ارادے سے اس کے پاس پہنچی تو وہ زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہا تھا اس کی زندگی کا یہ بیسواں اور آخری سال تھا اس نے حسرت آمیز نظریں جمیلیا پر ڈالیں اور منہ دوسری طرف پھیر لیا پھر تھوڑی دیر بعد العاضد کی دونوں آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ بوڑھے اتالیق نے اس کے چہرے پر چادر ڈال دی اور محلسرا کے در و دیوار سے گریہ و بکا اور آہ و زاری کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

بوڑھے نقی کی آنکھیں بھی نمناک تھیں اس نے جمیلیا کو جن نظروں سے دیکھا ان میں ایک پیام تھا۔ ایک سوال تھا ایک پرستش تھی۔ بولا "اب تیرا کیا خیال ہے؟"

جمیلیا کے وجود میں ایک طوفان برپا تھا جو اسے ہلائے دے رہا تھا اس کا اپنی بدنصیبی اور محرومی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہتا تھا لیکن اسے اس پر بھی قدرت حاصل نہ تھی۔

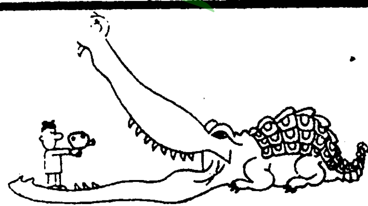
بوڑھا نقی اسے وہاں سے ہٹالے گیا اور ایک محراب کی آڑ میں کھڑے ہوکر کہنے لگا "او سرزمین مصر کی حسین لیکن بدقسمت ترین لڑکی! خدا نے تجھے بے مثال حسن اور بلا کا ادراک بخشا تھا لیکن ان دونوں کو جاہ طلبی کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں بے دریغ خرچ کرتی رہی اور یہ بھول گئی کہ ماورائے حسن اور ماورائے عقل جو کچھ ہے اس پر تیرا کوئی اختیار نہیں تو ان خواہشات کے پیچھے بھاگتی رہی جن سے تیری تقدیر محروم ہے تو نے اپنی ہر کوشش اور ہر جدوجہد میں طمع اور بے صبری کو پیش پیش رکھا اور نتیجۃً ان کی حصولیابی میں ناکام رہی ایک ایسی کوشش جس میں قناعت نہ ہو اسی طرح ناکام اور اذیت ناک رہتی ہے۔"

جمیلیا روہانسی ہوگئی بھرآئی آواز میں بولی "میں ناکام رہ کر زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ میں خودکشی کرلوں گی۔"

بوڑھے نقی نے جرأت سے کام لے کر اس کے سر کو اپنے سینے سے لگالیا "خودکشی کے مقابلے میں یہ بوڑھا کچھ زیادہ بُرا نہیں ہے محبت اور جذبۂ پرستش سے لبریز محبت صرف ایک بوڑھے کے دل میں ملے گی نوجوانوں کے دل ارمانوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں جبکہ ایک بوڑھے دل میں حسرت و یاس کے سوا کچھ بھی نہ ملے گا پس و پیش ترک کردے اور اس بوڑھے پر قناعت کر، بہتر ہے کہ تیری شکست تیرے ساتھ رہے۔"

جمیلیا نے تقدیر اور مشیت الٰہی کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔

بوڑھا محلسرا کی پُرپیچ راہوں سے گزرتا ہوا جب جمیلیا کو لے کر اپنے گھر جارہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حسن، دلکشی، دانائی اور بزرگی سبھی کچھ اس محلسرا سے رخصت ہوگئی۔ اور پھر واقعی قصرِ فاطمی نے اپنی جملہ رونقیں کھودیں اور خلافتِ فاطمی خلافتِ بغداد میں ضم ہوکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔



ایک امریکی دوشیزہ کی عبرتناک کہانی

جب ایڈ کی امی نے مجھے بتایا کہ ایڈ نے للّی نامی فاحشہ عورت سے تعلقات استوار کرلیے ہیں تو میرے دل کو شدید دھچکا لگا۔ رنج و غم کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، پھر یہ جان کر کہ وہ جذبات میں آکر رونے دھونے کو سخت ناپسند کرتی ہے میں نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ پرس سے رومال نکال کر میں نے آنسو پونچھ لئے اور غسل خانے میں چلی آئی۔ سرد پانی کے چھینٹے اپنی آنکھوں پر مارے، تولیے سے چہرہ صاف کرکے میں نے احتیاط سے دوبارہ میک اپ کرنا شروع کردیا۔ میرا چار فٹ آٹھ انچ کا قد میری اس مصیبت کا باعث تھا۔ خوب اچھی طرح ہونٹوں پر سرخی مل کر، رخساروں پر غازہ تھوپ کر، میں نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا اور واپس ڈرائنگ روم میں اپنی ساس کے پاس چلی آئی۔

کافی حد تک میرے اوسان بحال ہوچکے تھے لیکن اس اندوہناک صدمے نے جیسے میرے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب کرلی تھی۔ وہ توقع کررہی تھی کہ میں کچھ کہوں گی۔ لیکن آواز میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی، الفاظ زبان پر آتے آتے رک جاتے تھے، رہ رہ کر مجھے للّی کا خیال آرہا تھا جس نے میرے پیار پر ڈاکا ڈالا تھا جس نے میرا شوہر مجھ سے چھین لیا تھا۔ آخر ایڈ مجھے ہلاک کیوں



اقبال پاریکھ

ٹارزن کی بیوی

کئے دے رہا تھا؟ کیا وہ مجھ سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ اس قسم کی حرکت کر کے مجھے اذیت میں مبتلا کرے؟ کیا وہ یہ حرکت کر کے مجھے شرم دلانا چاہتا ہے؟

میں نے اپنی ساس ایلن کی طرف دیکھا، اسے دیکھنا آئینے میں دیکھنے کے مترادف تھا۔ ہم دونوں کا قد یکساں تھا اور اسی بنا پر ایڈ ہمیں اکثر چھیڑا کرتا تھا، ایڈ سیدھا ہو کر اپنا ہاتھ پر کی طرح پھیلا دیتا تو ہم دونوں اس کے نیچے سے بغیر اپنے بال بکھرائے نکل جاتی تھیں، ایلن نے اپنی عمر کو بڑی خوبصورتی سے سنبھال رکھا تھا کوئی بھی شخص پہلی نظر میں ہمیں دیکھ کر بہنیں تصوّر کرتا تھا۔

”ڈیبی،“ آخر اُس نے کہا ”اس واقعے کا میری جان اتنا اثر نہ لو۔ خود کو یوں ظاہر کرو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ مردوں کی فطرت کیسی ہوتی ہے، ان کے ذہن پر بس ہر وقت عورت سوار رہتی ہے۔ اگر اپنی بیوی سے انہیں آسودگی حاصل نہ ہو تو وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگتے ہیں، ممکن ہے یہ سرے سے اتنی بُری بات نہ ہو، میرا مطلب ہے، اس سے اس کی توجہ تمہاری طرف سے ہٹ جائے گی اور یہ بہت اچھا ہے۔“

”لیکن للّی؟“ اگر اسے بیوفائی کرنی ہی تھی تو اس نے للّی کے ساتھ تعلقات استوار کیوں کئے؟ للّی جو اس شہر کی سب سے بدصورت عورت ہے، بے حد موٹی اور بھدّی عورت جو بولتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سینکڑوں کوّے مل کر چیخ رہے ہوں، نارنجی اور سُرخ رنگ کے ملے جلے بال اور چھوٹی چھوٹی مضحکہ خیز آنکھیں، اُسے تو دیکھتے ہی گھن آنے لگتی ہے، ایڈ چاہتا ہے میں اسے اس کے ساتھ دیکھ کر خوب جلوں اور وہ دل ہی دل میں خوش ہو۔“

ایلن نے لاپروائی سے شانے اُچکائے ”پیاری، یقین کرو اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو بہت خوش ہوتی، میں اس پر قطعاً اعتراض نہ کرتی اور معاملے کو یوں ہی چلنے دیتی، تم جانتی ہو ایڈ کے باپ کے بارے میں، میں نے تمہیں کیا بتایا تھا۔ جب اسنے فاحشہ عورتوں سے ناجائز تعلقات قائم کئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔“

اس نے ہینڈ بیگ سے ایک سگریٹ نکالا جس کا رنگ اس کے جوتوں کے رنگ سے میچ کر رہا تھا، میں نے اُسے دروازے تک چھوڑنے کے لئے اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ جہاں میں بیٹھی تھی، دروازے پر اس نے پلٹ کر کہا ”ارے ڈیبی ایک اہم بات تو میں تم سے کہنا بھول ہی گئی۔ جمعرات صبح دس بجے آرڈن بیوٹی سیلون میں، میں نے وقت لیا تھا، گزشتہ ہفتے بالوں کا جو نیا ڈیزائن میں نے تمہیں بتایا تھا وہی ہم بنوائیں گے، پھر لپ اسٹک اور ملبوسات کے جو نئے ڈیزائن بازار میں آئے ہیں، وہ خریدیں گے، ٹھیک ہے نا؟“

”ٹھیک ہے،“ میں نے جواب دیا، جب دروازہ بند ہو گیا تو میں خالی خالی نظروں سے اپنے رومال کو دیکھنے لگی، میری آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے تھے۔

”خدا بھلا کرے میری ساس کا،“ میں نے سوچا ”اس نے میرے لئے بڑی کوشش کی، اس وقت بھی جب ایڈ کی اور میری شادی ہوئی تھی جہاں میں اپنے ابو اور تین بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی، مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب وہ پہلی بار ہمارے پرانے اور بوسیدہ مکان میں آئی تھی جہاں میں اپنے ابو اور تین بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میں ایڈ کی امی کے متعلق صرف اتنا جانتی تھی کہ وُہ میری طرح پستہ قد ہے مجھے اس کی توقع نہیں تھی کہ وُہ اس طرح آن دھمکے گی۔ مجھے ایڈ پر بڑا غصّہ آیا، کم از کم وہ فون کر کے مجھے اس کی آمد کی اطلاع تو دے دیتا، جھوٹے برتن باورچی خانے کے ٹب میں بکھرے پڑے

تھے اور میں مکان کے پیچھے لان پر اپنے چھوٹے بھائی کپ
کے ساتھ گیند سے کھیل رہی تھی جس کے بدلے میں اس نے
وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے دھوئے ہوئے برتن خشک کردے گا۔
میرا حلیہ بڑا عجیب ہو رہا تھا، گرد آلود پتلون پر میں نے سفید
شرٹ پہن رکھی تھی جسے اوپر کر کے میں نے آگے گانٹھ دے
لی تھی، پتلون اور شرٹ کے درمیان خالی جگہ سے میرا گورا
گورا پیٹ صاف نظر آ رہا تھا، کپ اور میں ہنستے ہوئے
ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے، ہم نے بڑی دھما چوکڑی
مچا رکھی تھی چنانچہ میں نے امّی کی آواز نہیں سنی جو مجھے پکار رہے
تھے۔ پھر اُن کی آواز سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میری
ہونے والی ساس گھر میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔

اوپر جاتے ہوئے میں اپنا حلیہ بھی درست نہ کر سکی، اپنے
گندے گرد آلود ہاتھ میں نے پتلون سے پونچھ ڈالے اور شرٹ
کے دامن سے ناک سڑسڑا کر صاف کی اور اس شخص کی ماں
سے ملنے کمرے میں داخل ہو گئی جس سے میں محبت کرتی تھی
جب میں نے اُسے دیکھا تو میرے دل میں یہ خواہش بڑی شدت
سے پیدا ہوئی کہ یہ فرش پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں
وہ بہت خوبصورت اور پستہ قد خاتون تھی، بیش قیمت لباس
اس نے بڑے سلیقے سے پہن رکھا تھا، کمرے میں داخل ہوتے
ہی ٹھٹھک کر رک گئی، اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ میرے پاس آئی
اور ناخن تراشے ہوئے صاف اور گورے گورے ہاتھوں سے
میرا گندا سا ہاتھ تھام لیا۔

"اچھا تو تم ہو ڈیبی" اس نے بڑے پیار سے کہا۔

اسی لمحے میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ خود کو ایک معزز خاتون
بنانے کی کوشش کروں گی اور جس معزز خاتون کا نقشہ میرے
ذہن میں تھا، ایڈ کی امی اس پر پوری اُترتی تھی۔

ایڈ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو میں معزز خاتون قطعاً
نظر نہیں آ رہی تھی، کپ کی پتنگ درخت کی سب سے اوپری
شاخ میں اٹک گئی اور میں اُسے درخت پر چڑھنے نہیں دینا
چاہتی تھی کیونکہ پہلے بھی ایک بار وہ درخت سے گر کر اپنے ہاتھ
کی ہڈی تڑوا بیٹھا تھا "میں جین[1] ہوں" میں نے چھاتی
ٹھونکتے ہوئے کہا، اُچک کر میں نے درخت کی سب سے نچلی
شاخ پکڑ لی اور چڑھنا شروع کر دیا، جوں جوں میں اوپر جا رہی
تھی۔ خوف سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ میری قمیص بھی جگہ جگہ
سے پھٹ گئی تھی، جیسے ہی میں پتنگ کے نزدیک پہنچی درخت
کی شاخیں کمزور رہ گئی تھیں۔ بڑی احتیاط سے میں نے ایک
قدرے مضبوط شاخ کو پکڑا اور پتنگ کے بالکل قریب پہنچ گئی
اچانک درخت کے نیچے کھڑے ہوئے بچوں نے شور مچانا شروع
کر دیا، وہ طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے تاکہ میں خوفزدہ ہو
کر نیچے گر پڑوں۔

"اوہ میرے خدا" میں نے کہا "مجھے ان بچوں کے سامنے
نیچے نہ گرانا ورنہ بڑی کرکری ہو جائے گی"

"میں جین ہوں، بھلا میں کیونکر نیچے گر سکتی ہوں" میں
نے جی کڑا کر کے نیچے کھڑے ہوئے بچوں سے کہا۔

آخر میں نے پتنگ شاخ سے نکال کر زمین پر پھینک
دی۔ سب سے نچلی شاخ تک پہنچتے پہنچتے میرے بازو شل
ہو گئے۔ اور میں تھکن محسوس کرنے لگی، میری ٹانگیں کپکپا رہی
تھیں۔ اچانک دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے کمر سے پکڑ کر زمین
پر کھڑا کر دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، لمبا تڑنگا ایک وجیہہ
نوجوان میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا، اتنا لانبا آدمی اس سے
پہلے میں نے نہیں دیکھا تھا "ہائے جین" اس نے میرا چھوٹا

---

[1] ٹارزن کی بیوی، ایک افسانوی کردار جنگلوں میں بڑے بڑے درختوں پر چڑھنے میں جسے کمال حاصل ہے۔

سا ہاتھ اپنے بڑے ہاتھ میں دبا لیا "مجھے ایڈ کہتے ہیں"۔
چند منٹوں تک وہ میرے چہرے کو محویت سے تکتا رہا اور پھر اس نے مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹ لیا۔ سب بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے، آہستہ آہستہ اس کا چہرہ میرے چہرے کے قریب آتا گیا اور پھر ہم دونوں کے ہونٹ آپس میں مل گئے، چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ کیف و سرور کے چند لمحے، یہ میرے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ ایک ایسی چیز جس نے مجھے نئی لذت سے آشنا کیا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ لڑکے اور لڑکی کے ہونٹ جب آپس میں ملتے ہیں تو اس قدر لطف آتا ہے۔
لڑکوں کو میں پسند کرتی تھی کیونکہ میری پرورش ہی لڑکوں کی طرح ہوئی تھی، محلے کے سارے لڑکے مجھ سے خوف کھاتے تھے کیونکہ دیکھتے ہی دیکھتے میں ہر لڑکے کو چت کر دیتی تھی، ہاکی فٹ بال، کرکٹ، بیس بال، باکسنگ غرض لڑکوں کے سارے کھیلوں میں، میں سب سے آگے رہتی تھی، گلی کے سارے لڑکے، میرے ہم عمر یا مجھ سے بڑے، میرے آگے بھیگی بلی بنے رہتے تھے، لیکن یہ کیسا لڑکا تھا جس نے خود مجھے بھیگی بلی بنا دیا تھا، میں سہمی سہمی اس کے سینے سے لگی کھڑی تھی، مجھے مطلق یہ احساس نہیں تھا کہ یہ بہت بُری بات ہے، میری ماں ہوتی تو مجھے بتاتی، اس سے پہلے اگر کوئی لڑکی مجھ سے دوستی کرنا چاہتی تو میں اسے ٹکا سا جواب دے دیتی تھی۔ اپنے آپ کو لڑکی کہلوانا مجھے بڑا عجیب لگتا تھا، ٹھیک ہے کہ مجھے نسوانی عوارض لاحق ہوتے شروع ہو گئے تھے، میرے سینے میں اب نمایاں تبدیلی آ گئی تھی، لیکن میں نے اپنے آپ کو کبھی لڑکی نہیں سمجھا تھا۔ یہ ایڈ تھا جس نے مجھے میری نسوانیت کا احساس دلایا تھا اس کے چوڑے سینے پر سر رکھے، اس کی آغوش میں سختی سے دبے ہوتے مجھے یہ احساس ہوا کہ میرا تعلق صنفِ نازک سے ہے۔
میری عمر صرف چھ سال تھی جب امّی کیپ کو جنم دینے کے بعد انتقال کر گئیں، اس سے میں اپنے بڑے بھائیوں مارک اور پال اور چھوٹے بھائی کیپ کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ بچپن سے شباب تک ابو نے ہم میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا تھا، چند سال پہلے میرے ابو نے مجھے چند پتلونیں اور قمیصیں بالکل میرے بھائیوں جیسی بنوا دی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پچھلے سال میری سالگرہ پر ہماری پڑوسن نے مجھے لڑکی اور وہ بھی جوان ہوتے کا احساس دلانے کے لئے سینہ پوش سالگرہ کے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ دوسرے دن ٹام کے اسٹور سے میں نے اس کے بدلے میں غلیل لی اور پڑوسن کو احساس دلانے کے لئے کہ میں لڑکے سے کسی طرح کم نہیں، یکے بعد دیگرے تین شیشے اس کی کھڑکی کے توڑ ڈالے۔
خاندان والے میرے چھوٹے قد کی وجہ سے اکثر مجھ سے مذاق کرتے رہتے تھے، اس سلسلے میں انہوں نے مجھے کئی خطابات بھی دے رکھے تھے مگر میں کسی کی پروا نہیں کرتی تھی، دوڑنا، کودنا، چڑھنا، اترنا، ہر کسی سے جھگڑنا، لڑکوں کو چت کر کے ان کے سینے پر سوار ہو جانا، مکّے بازی سے چھوٹے لڑکوں کو ناک آؤٹ کر دینا، انہیں ڈرا دھمکا کر ان سے ٹافیاں اور پیسے چھین لینا، یہ سب میرے محبوب مشاغل تھے۔
یہی وجہ تھی کہ ایڈ نے مجھے اور میں نے اُسے متاثر کیا۔ "میں تصنع اور ٹیپ ٹاپ کے لوگوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ وہ خود سے بچھڑ جاتے ہیں۔ وہ وہ نہیں ہوتے جو انہیں ہونا چاہیئے"۔ اس نے مجھ سے کہا "بہت سی عورتیں، عورتیں نہیں رہیں، میک اپ کی تہیں چڑھا کر وہ خوبصورت نظر آنے کی

ل یہ نام میں نے تجویز کیا ہے۔ مگر یہ حرفِ آخر نہیں۔ بہرحال سرگرقبول افتد زہے عزوشرف...... مدیر

حساب کا ایک نیا طریقہ

حبشہ کے وحشی قبائل کے بارے میں سیاحوں کا کہنا ہے کہ وہ اعداد کو صرف دُگنا یا آدھا کر سکتے ہیں۔ اور وہ بھی صرف کنکریوں کی مدد سے۔ تمام کاروباری حساب کتاب وہ اسی طریقے سے کرتے ہیں اور کوئی سے بھی دو اعداد کو دوگنا یا آدھا کرتے ہوئے وہ صحیح جواب اخذ کر لیتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص کو پندرہ بھیڑیں بحساب تیرہ ایتھوپین ڈالر فی بھیڑ خریدنی ہیں، ان کی کیا قیمت ہوگی؟ وہ حبشی اس کو حل کرنے کیلئے مندرجہ ذیل طریقہ استعمال کرتے ہیں۔

بائیں جانب تیرہ کا ہندسہ رکھیئے اور دائیں جانب پندرہ کا، بائیں جانب کے ہندسے کو آدھا کیجئے، جواب ساڑھے چھ (۶½) آیا۔ نصف کو چھوڑ دیجئے کیونکہ قبائلی حبشی کسروں میں کاروبار نہیں کرتے، داہنے ہاتھ کے عدد کو دوگنا کیجئے۔ یہ عمل جاری رکھیئے، یہاں تک کہ بائیں جانب ایک کا ہندسہ آجائے۔ اب صورت یہ ہوگی۔

۱۵	۱۳	
۳۰	۶	ان توہم پرست قبائل کے خیال
۶۰	۳	میں بائیں جانب کے جُفت
۱۲۰	۱	اعداد منحوس ہوتے ہیں۔ لہٰذا

جُفت اعداد اور ان کے سامنے کے اعداد کو کاٹ دیتے ہیں۔ اب آپ بھی چھ اور اس کے ساتھی تیس کو قلم زد کر دیجئے اور پھر دائیں جانب کے اعداد کو جمع کر لیجئے۔ یہی جواب ہے۔

کوشش کرتی ہیں اور خود سے دُور ہو جاتی ہیں۔ وہ سب فریب میں مبتلا ہیں، میں ایک ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جسے یہ احساس ہی نہ ہو کہ وہ لڑکی ہے۔"

دوسرے دن میں نے ایڈ سے جھیل پر ملاقات کی کافی دیر تک جھیل کے کنارے ایک سنسان گوشے میں ہری ہری گھاس پر ہم لیٹے ہوئے خوش فعلیاں کرتے رہے، پھر ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ پھولوں کے ایک تختے سے پھول توڑنے لگا

گلاب کا ایک پھول ایڈ نے میرے بھورے بالوں میں لگا دیا پھر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا، میں اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔ بھاگتے ہوئے پیچھے مڑ مڑ کر میں کہتی جا رہی تھی "تم مجھے نہیں پکڑ سکتے تم مجھے نہیں پکڑ سکتے!" لیکن جلد ہی اُس نے مجھے پکڑ لیا اور جب اس نے اپنے تپتے ہوئے ہونٹ، میرے نرم و نازک بقول اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر رکھ دیئے تو میں نے جان لیا کہ اس نے مجھے ہمیشہ کے لئے پکڑ لیا ہے"

"ہماری پہلی ملاقات کے دو ہفتے بعد ایڈ کی امّی ایلن ایلہ۔ دن شام کو آدھمکی

"ڈیبی،" اس نے کہا "میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں، ایک نجی بات جس کا تعلق تم سے اور ایڈ سے ہے۔" یہ سن کر میں کانپ اُٹھی، ممکن ہے اس کے خیال میں، میں ایڈ کے لئے موزوں نہ ہوں۔

"میں تم سے صاف صاف بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا "میں جانتی ہوں تمہاری ماں اس دنیا میں نہیں ہے، ورنہ مجھے تمہیں نہ سمجھانا پڑتا میرے لئے تمہارے ابو کو یہ بات سمجھانا بہت مشکل ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہاری امی کی موت زچگی کے دوران واقع ہوئی ہے۔ کیا اس بات سے تمہیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟"

میں نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ "ابّو نے مجھے بتایا تھا کہ امی کی موت ایک حادثے کے باعث واقع ہوئی تھی۔ کیپ غیر معمولی طور پر کافی بڑا بچّہ تھا۔ اور امّی بہت کمزور اور پستہ قد تھیں، انہوں نے مجھ سے کہا تھا اس قسم کے کیس بہت کم وقوع پزیر ہوتے ہیں، اور یہ کہ امی بچ سکتی تھیں اگر بروقت انہیں اسپتال میں داخل کر دیا جاتا۔"

"چونکہ تمہاری امّی نہیں ہے" ایڈ کی امّی نے پیار

بھرے لہجے میں کہا "اس لئے اگر تم چاہو تو تم مجھے اپنی ماں سمجھ سکتی ہو، ہمدرد اور مخلص سچی ماں کی طرح۔"

یہی ایک چیز تھی جس کے لئے میرے دل میں ایک مدت سے خواہش تھی، مجھے کبھی ماں کی محبت میسر نہیں آئی تھی، میں اس محبت کی سخت بھوکی تھی۔ مدت سے یہ آرزو تھی کہ کوئی مجھے بیٹی کہے، ماں کا پیار کیا ہوتا ہے۔ یہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی مائیں نہیں ہوتیں، ایڈ کی امی کے اس محبت بھرے سلوک سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے پھر اس نے ایک ایسی بات کہی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

"میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ......... کہ میرے بیٹے سے شادی نہ کرو۔"

یہ سن کر مجھے بڑا صدمہ ہوا اور میں جیسے سکتے میں رہ گئی میں بے یقینی سے اس کی طرف دیکھنے لگی، مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسی بات کہہ سکتی ہے۔

"اس طرح تو گھور گھور کر مجھے نہ دیکھو ڈیئر" وہ مسکرائی "میں یہ تمہاری اچھائی کی خاطر کہہ رہی ہوں، اگر تم ایک عمر رسیدہ اور آزمودہ کار خاتون کی بات پر توجہ دینا نہیں چاہتیں تو جاؤ تمہیں اجازت ہے جو تمہارے دل میں آئے کرو، ہم دونوں بدستور دوست رہیں گے، ٹھیک ہے؟ لیکن میری بات پر تم ذرا سنجیدگی سے غور کرنا، اگر تم جذبات میں آگئیں تو یہ تمہارے مستقبل کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ میری بات تمہیں ناگوار گزرے گی۔ تم مجھے اپنی دشمن سمجھنے لگو گی، مگر خدا کے لئے تم میرے خلوص پر شک نہ کرنا۔"

میں نے احمقانہ انداز میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی، اپنے طلائی سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر اس نے ہونٹوں کے درمیان دبا لیا، سگریٹ سلگا کر اس نے ایک طویل کش لیا اور دھواں سر اٹھا کر چھت کی طرف چھوڑ دیا، پھر اس نے صوفے سے پشت ٹکا کر اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔

"اب" اس نے کہا "میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے اس کی وجہ نہیں بتاتی ہوں۔ یہ بات میں کئی روز سے تم سے کہنا چاہتی تھی۔"

اس نے مجھ سے کہا کہ وہ اس وقت بیحد خوفزدہ ہوئی جب اس نے سنا کہ میں بہت پستہ قد ہوں۔ صرف میرے بارے میں نہیں بلکہ ایڈ کے لئے بھی۔ آخر وہ اس کی ماں تھی اور وہ ظاہر ہے اسے خوش دیکھنا چاہتی تھی، وہ کیا ہر ماں یہی چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا خوشگوار ازدواجی زندگی گزارے، اس کے لئے مائیں طرح طرح کے جتن کر کے اپنے بیٹے کے لئے اچھی سے اچھی دلہن تلاش کرتی ہیں، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا اپنی دلہن کے ساتھ ایسا ویسا سلوک کرے کیونکہ ایڈ کے باپ نے اتنی طویل ازدواجی زندگی میں غالباً ایک دو بار ہی حقیقی مسرت دی تھی" "میں بہت چھوٹے قد کی تھی" اس نے کہا

ایک خبر + ذہانت = ڈھائی لاکھ ڈالر

یہ ۱۸۶۱ء کا واقعہ ہے کہ جارج گرانٹ نامی ایک امریکی نے جو امریکہ سے ہجرت کر کے لندن میں آباد ہو گیا تھا، انتہائی فراست اور سرعت سے کام لیتے ہوئے صرف ایک خبر کی بدولت لاکھوں ڈالر کمائے۔ لندن ٹائمز میں ایک خبر چھپی کہ شہزادہ البرٹ صاحب فراش ہے اور اس کے بچنے کی امید بہت کم ہے۔ یہ خبر پڑھ کر گرانٹ کے ذہن رسا میں ایک عجیب و غریب تدبیر آئی۔ اسنے لندن اور اس کے قرب و جوار کی تمام دکانوں سیاہ رنگ کا ماتمی کپڑا خرید لیا۔ چند دن بعد جب شہزادے کا انتقال ہو گیا تو لوگوں کو ماتمی کپڑے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن ماتمی کپڑا کہیں بھی نہ ملا۔ اس وقت گرانٹ اپنا تمام اسٹاک بازار میں لے آیا۔ اور اس طرح سے ڈھائی لاکھ ڈالر کی خطیر رقم کا مالک بن بیٹھا۔

"اور ایڈ کا باپ ایک بلند قامت شخص تھا۔ ہمارے جیسے کیسوں میں، میاں بیوی جنسی طور پر ایک دوسرے کے لئے ٹھیک نہیں ہوتے، وہ کبھی ایک دوسرے سے مطمئن نہیں ہوتے، جب ایک بڑے سے شخص کے سامنے چھوٹی سی عورت ہو تو وہ وحشی سا بن جاتا ہے وہ ایسے طور طریقے اختیار کرتا ہے جو بڑے ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں، تم سمجھتی ہو نا میرا مطلب کیا ہے۔ عورت کے لئے پھر وہ مرد بے حد تکلیف دہ بن جاتا ہے مرد کو مکمل آسودگی اس کے قد کی عورت بہم پہنچا سکتی ہے۔ میری باتوں پر توجہ دو، بچے کی پیدائش تو پستہ قد عورت کے لئے بڑی اذیتناک ہوتی ہے، تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں، ایڈ کو جنم دیتے وقت مجھے اتنی اذیت ہوئی تھی کہ آج بھی اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جسم پر کپکپی سی طاری ہونے لگتی ہے، تمہاری امی بھی تمہاری طرح پستہ قد تھیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں ـــ؟"

بے اختیار میں نے نفی میں سر ہلایا، میری حالت اس وقت ایسی تھی جیسے کسی نے مجھے ہپناٹائز کر دیا ہو، میں اس کی باتوں سے بری طرح ترو س ہو گئی تھی جیسے کوئی پرکٹا پرندہ بلی کو دیکھ لیتا ہے۔

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔" اس نے کہا "تمہاری امی بہت چھوٹی اور دبلی پتلی تھیں جبکہ بچہ کافی بڑا تھا، وہ بالکل اپنے باپ پر گیا ہے، مجھے کہنے دو ڈیبی، یہ ایک عذاب ہے جسے میں جھیل چکی ہوں۔"

آخر وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی "میرا اندازہ ہے کہ تم میرا مطلب بخوبی سمجھ گئی ہو گی۔" اس نے سرد مہری سے کہا "اگر نہیں سمجھیں تو سنو، میرے بیٹے کو چاہیئے کہ وہ اپنے سائز کی کوئی لڑکی تلاش کر لے۔" پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے ایک رخسار پر بوسہ دیا "اگر تم نے یہ عذاب جھیلنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تمہارے ملبوساتِ عروسی خود خریدوں گی۔ اپنے دل میں میرے لئے کسی بدگمانی کو جگہ نہ دینا، اور اگر تم کبھی اس جہنم سے نکلنا چاہو تو مجھے تمہاری مدد کر کے بڑی خوشی ہو گی۔"

جب وہ چلی گئی تو میں مکان کے پچھواڑے زینے پر جا کر بیٹھ گئی، کتنی پیاری ہے وہ، کتنی ہمدردی اور خلوص ہے اُسے مجھ سے، بالکل مجھے اپنی بیٹی کی طرح چاہتی ہے جبکہ میرا حلیہ کتنا خراب ہو رہا ہے، جو کچھ اس نے کہا تھا وہی رہ رہ کر میرے دماغ میں چکرا رہا تھا۔ جنس کے بارے میں، میں سب کچھ جانتی تھی اور میں کیا یورپ کی ہر لڑکی سنِ بلوغ تک پہنچتے پہنچتے ہی سب کچھ جان جاتی ہے اور عالمِ شباب میں لڑکیاں ان سب باتوں میں عملی طور پر بھی حصہ لینے لگتی ہیں، مجھے سب معلوم تھا کہ پیدائش کس طرح ہوتی ہے لیکن میں نے کبھی اس امکان پر غور نہیں کیا تھا کہ ایڈ اور میں اس معاملے میں کامیاب نہیں ہو سکتے، میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایڈ اور میں ایک دوسرے سے صحیح طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے، اس معاملے میں ناکامی کا تصور ہی روح فرسا تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہی عائد ہوتی ہے، کیونکہ ایڈ میں تو کوئی نقص تھا نہیں۔ اور مجھے معلوم تھا کہ ناکامی کی صورت میں کیا ہوتا ہے۔

سب سے پہلے میں نے پہلی چیز کو لیا، آئٹم نمبر ایک، میں ایڈ سے محبت کرتی تھی اور یہ بہت بڑی بات تھی۔ ممکن ہے یہ سب کچھ ایڈ کی امی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یعنی بچے کی پیدائش کے وقت ناقابلِ برداشت تکلیف، لیکن میری اپنی امی کے ساتھ بھی تو یہی کچھ پیش آیا تھا، پھر یہ کہ ان کی موت بھی زچگی کے دوران واقع ہوئی تھی، جو نقشہ ایڈ کی امی نے کھینچا تھا کیا وہ اتنا ہی خوفناک ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ آخر امی نے چار بچوں کو جنم دیا تھا۔

لیکن آخری بچے نے اُن کی جان لے لی۔

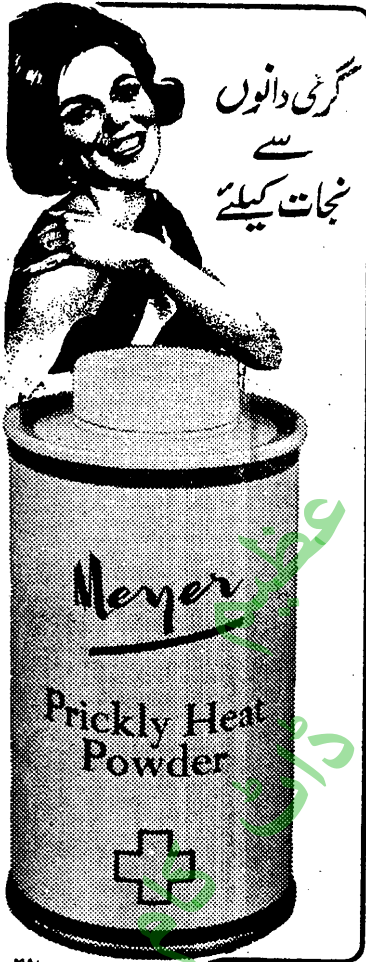
مجھے ایڈ سے محبت تھی اور میں اس سے شادی کرنا چاہتی تھی، یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ایڈ اور میں جنسی طور پر کامیاب رہیں گے یا نہیں۔

اس رات جب وہ آیا تو ہم نے شادی کی تاریخ طے کر لی۔ایڈ کی امی کی درخواست پر ہم نے شادی کی تاریخ میں دو دن کا اضافہ کر دیا تھا "ارے بھئی اتنی جلدی کیا ہے" اس نے کہا "آخر ملبوسات وغیرہ خریدنے میں بھی تو وقت لگے گا"

اگلے دو ہفتے بڑی مصروفیت میں گزرے، ایلن نے اپنے بیوٹی سیلون میں میرے لئے اپائمنٹ طے کرا لیا اور اپنے بال جیسے میرے بال بنوا دیئے میرے چہرے پر طرح طرح کے لوشن اور قسم قسم کی کریمیں ملی گئیں، میرے ناخن بڑی خوبصورتی سے تراش دیئے گئے اور ان پر بالکل نئے شیڈ کی پالش لگا دی گئی، ایلن نے جو ملبوسات میرے لئے خریدے وہ کسی اور دنیا کے معلوم ہوتے تھے۔اس سے پیشتر ایسے کپڑے میں چھوئے کیا کبھی دیکھے بھی نہ تھے۔بیش قیمت کپڑا، اعلیٰ ڈیزائن، شوخ اور دیدہ زیب رنگ۔جب پوری طرح بن ٹھن کر میں نے خود کو فل سائز کے آئینے میں دیکھا تو بمشکل اپنے آپ کو پہچان سکی،

میں نے اپنی پرانی جین کی پتلون اور سفید شرٹ الماری کے پیچھے ڈال دی اور سوچا کہ پہلی ہی فرصت میں کسی کو بطور خیرات دے دوں گی۔

گھر میں، مَیں بہت مشہور تھی۔ہر کوئی مجھ سے پیار کرتا تھا میری شادی پر تینوں بھائی حیران اور پریشان نظر آ رہے تھے انہوں نے مجھے کبھی لڑکی سمجھا ہی نہ تھا۔ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن میں انہیں چھوڑ کر اپنے شوہر کے گھر چلی جاؤں گی، اس بات نے انہیں برافروختہ کر دیا تھا۔تینوں بھائی اب مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہنے لگے تھے، کپ تو اب مجھ سے کسی



کام میں تعاون نہیں کرتا تھا" میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تم ایک
دم لڑکی کیسے بن گئیں، اب محلے کے بچے مجھے تنگ کریں گے تو ان
کی پٹائی کون کرے گا، بڑے بڑے لڑکے میری گیند چھین لیں گے
تو ان سے کون نمٹے گا، جاؤ ہم تم سے نہیں بولتے ہماری تمہاری
آج سے کٹی" اس نے ناک بھوں چڑھا کر بڑے بھولپن سے کہا۔
جس پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اور اس کا منہ چڑا دیا، "اچھا یہ
بات ہے" وہ یہ کہہ کر میرے پیچھے دوڑا۔ سارے گھر میں میں
نے ہنستے ہوئے خوب نچایا۔ آخر تھک ہار کر وہ صوفے پر منہ پھلا
کر بیٹھ گیا، میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔
اور اس کے سرخ و سفید رخساروں کو اتنا چوما کہ وہ اور بھی سرخ
ہو گئے۔ بالکل ٹماٹر کی طرح۔ "مجھے بڑا افسوس ہے کپی، تمہیں
چھوڑنے کو میرا جی تو نہیں چاہتا مگر میں اس معاملے میں مجبور
ہوں۔ ہر لڑکی کو جب وہ بڑی ہو جاتی ہے اپنا گھر چھوڑنا پڑتا
ہے۔"

"مگر یہ تو بڑی بُری سی بات ہے کہ لڑکی کو جب وہ بڑی
ہو جائے۔ اس کے والدین اور بھائیوں سے چھین لیا جائے؟"
کپ نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں کپ کہ یہ دنیا کی ریت ہے، یہ
خدا کا قانون ہے، کوئی لڑکی شوہر کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔
اسے اس کا شوہر خوب پیار جو کرتا ہے۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے
تو تم بھی کسی لڑکی کو اس کے والدین اور بھائیوں سے چھین
لاؤ گے۔"

"پیار تو میں بھی تمہیں خوب کرتا ہوں، پھر تمہیں کیا
ضرورت ہے کہ ہمیں چھوڑ کر چلی جاؤ؟"

میں نے پھر اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا، اب آپ ہی
بتائیے میں اسے کس طرح سمجھا سکتی تھی، میں نے پھر اس
سے افسوس کا اظہار کیا، لیکن میرے دل میں تو ایک طوفان برپا
تھا۔ مجھ پر ایک نئے سرور کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ مجھے
نہیں معلوم تھا کہ لڑکی کی جب شادی ہوتی ہے تو وہ اتنی
خوشی کیوں محسوس کرتی ہے۔

ایڈ نے جب مجھے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے
پھیل گئیں "خدا کی قسم تم بالکل بدل کر رہ گئی ہو، لیکن مجھے
یہ سب پسند نہیں ہے۔ زرق برق ملبوسات، مصنوعی بناؤ سنگھار
مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا، پہلے جیسی ڈیبی، تم بالکل نظر نہیں آ
رہیں۔ آخر امی نے اپنا رنگ تم پر چڑھا ہی دیا"

میں نے اس کا منہ بھی چڑا دیا "جب تک لڑکی کو بنایا
سنوارا نہ جائے وہ دلہن کس طرح کہلا سکتی ہے۔ پھر تو اس میں
اور عام لڑکی میں کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا، ہر جگہ دلہن کا خوب
بناؤ سنگھار کیا جاتا ہے" میں نے اس سے کہا "اور پھر میں
تمہارے لئے ہی تو اتنی خوبصورت بن رہی ہوں"

ایک دلچسپ بات تو میں بتانا بھول ہی گئی۔ جب میں
اور ایڈ کی امی آرڈن بیوٹی سیلون میں داخل ہوئیں تو وہاں کی
ایک نئی لڑکی نے آگے بڑھ کر مجھ سے پوچھا کہ "کیا میں اپنے بال
اپنی بہن جیسے بنوانا پسند نہیں کروں گی؟" میں نے جھٹ ایلن
کی طرف دیکھا اور اس نے اشارے سے کہا کہ اس کے تاثر کو قائم
رہنے دیا جائے، واقعی اب میں وہ ڈیبی بالکل نہیں رہی جسے
ایڈ نے درخت سے نیچے کمر سے پکڑ کر اتارا تھا۔

ہمیشہ شاپنگ سینٹر سے گھر جاتے ہوئے ایلن اس
شادی کے بھیانک نتائج مجھے سمجھاتی رہتی تھی اور ایک دن
تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، اس کی اس بات سے میرا
جسم سن ہو کر رہ گیا "مجھے ہرگز اس کی توقع نہیں"۔ اس نے
کہا "ڈیبی، تم اور ایڈ شادی سے پہلے جنسی طور پر ایک دوسرے
کو آزما لو تو بہت اچھا رہے گا۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے
اس سے یہ پتا چل جائے گا کہ دونوں ایک دوسرے سے مطمئن

ہوتے ہو یا نہیں، خاص کر ایڈ تم سے مکمل تسکین حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟"

میں نے اس کا بڑی شائستگی سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم میں سے کوئی یہ چیز شادی سے پہلے کرنا نہیں چاہتا ہیں نے اُسے پوری طرح یقین دلایا۔

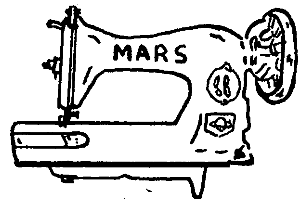
لیکن میں اپنے آپ کو یقین کس طرح دلا سکتی تھی؟ جوں جوں شادی کا دن قریب آ رہا تھا میری گھبراہٹ اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ بعض اوقات میرے جسم پر رعشہ طاری ہو جاتا تھا۔ اندر ہی اندر جانے مجھے کیا ہو رہا تھا، میرے ذہن میں ایلن کی شائستہ اور سرد آواز گونجتی رہتی تھی "پہلے تم کوشش کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اگر کوئی اور یہ کہتا تو میں جوتی اتار کر اس کے منہ پر دے مارتی، لیکن یہ تو میری ہونے والی ساس نے کہا تھا اور شادی سے پہلے ساس اور بہو میں جھگڑا ہو جائے، یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی، شادی سے تین دن قبل ایک رات ایڈ نے مجھے کار پر سیر کے لئے چلنے کو کہا۔ میں نے فوراً ہامی بھر لی۔

ہم نے شہر سے دور پارک کے سنسان گوشے میں گاڑی کھڑی کر دی جہاں سے شہر کی جگمگاتی بتیاں بڑا دلکش منظر پیش کر رہی تھیں، تارے تو بالکل قریب محسوس ہو رہے تھے۔

کار پارک کرنے کے بعد ایڈ چند لمحوں تک مجھے مبہوت کھڑا تکتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا "تم بہت خوبصورت نظر آ رہی ہو ڈیبی، تمہارے حسن و جمال نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے، سچ کہتا ہوں ڈیبی، مجھے اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو رہا ہے۔ دل چاہتا ہے ...... تم نے واقعی مجھے بے خود کر دیا ہے۔ میں تمہیں روند دینا چاہتا ہوں، بھنبھوڑ دینا چاہتا ہوں۔"

میں نے اپنے بالوں کے متعلق سوچا، ایلن کیا کہے گی اگر اتنی جلدی یہ بکھر گئے تو۔ جو کچھ ایڈ چاہتا تھا اس سے تو میرے سفید لباس کا ستیاناس ہو جائے گا۔ پھر میں نے سوچا ممکن ہے ایلن مجھے معاف کر دے جب اسے یہ پتا چلے کہ میں



نے اس کی تجویز پر عمل کر کے دیکھ لیا ہے، وہ بہت خوش ہو
گی اگر میں نے یہ ثابت کر دیا کہ ایڈ کو میں نے پوری طرح مطمئن
کر دیا ہے اور ہم دونوں خوش گوار ازدواجی زندگی گزار سکتے ہیں
میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف کر لیا اور کانپتے ہوئے کہا "چنانچہ
روند دو مجھے، بھنبھوڑ دو، اسی لئے تو میں ہوں، مجھے تم سے
محبت ہے ایڈ"

وہ میرے کچھ اور قریب کھسک آیا اور اپنے مضبوط بازو
میں جکڑ کر اس نے میرے ہونٹوں پر اپنے کپکپاتے اور تپتے ہوئے
ہونٹ رکھ دیئے اور بڑی سختی سے مجھے بھینچ لیا۔ میں عجیب
سا سرور محسوس کر رہی تھی۔ ایک آگ سی لگ رہی تھی۔ اس
کی شدتوں میں اور شدت آ رہی تھی۔

میں نے اس کی گرمجوشی کا جواب اثبات میں دیا "پلیز
ایڈ، جو تمہارا جی چاہے کرو، مجھے کوئی عار نہ ہوگا، میں تمہیں
چاہتی ہوں ایڈ"

اچانک میرے ذہن میں وہ بھیانک خیال جاگزیں ہو گیا
میرے جذبے سرد پڑ گئے، ساری گرمجوشی جاتی رہی جیسے کسی
نے مجھ پر گھڑوں پانی ڈال دیا ہو، مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے
میں اس پہاڑی پر اکیلی ہوں، ایک وحشی اور جنسی دیوانے
کے ساتھ، جو میرے پھول ایسے جسم کو مسل دینا چاہتا ہو، وہ
مجھے زخمی کرنے کے لئے اپنے لمبے لمبے ناخن میرے جسم میں کھبا
رہا ہو، گھسا رہا ہو، میرا لباس تار تار ہو کر رہ گیا ہو۔ جو لمحہ بہ لمحہ
مجھ پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ میں بری طرح چیخنے لگی، کراہنے لگی
اور مدافعت میں میرے ہاتھ پاؤں چلنے لگے۔

چند لمحوں تک تو ایڈ نے کوئی پروا نہیں کی مگر جب
میں اس کے قابو سے باہر ہو گئی تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔
اس کا سانس دھونکنی کے مانند چل رہا تھا، چہرہ کفن کی طرح
سفید پڑ گیا تھا۔ میں اس سے دور کار کے دوسرے دروازے
کے پاس دبک گئی جیسے کوئی چوہیا کسی خوفناک بلے سے بچنے
کے لئے کونے کھدرے میں دبک جاتی ہے۔ اب میں رونے
بھی لگی تھی، میرے آنسو رخساروں سے بہہ رہے تھے، وہ
مجھے سسکیاں لیتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ
اسٹیئرنگ پر رکھے ہوئے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ میرے چیخنے
چلانے سے غالباً اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

"میرا اندازہ ہے، ہم کبھی کامیاب نہ ہوں گے" میں
نے ڈری ڈری آواز میں کہا "ہم..... ہم ہر چیز منسوخ کر
دیں گے، میں تمہارے لئے موزوں عورت نہیں ہوں ایڈ خصوصاً
اس معاملے میں"

اس نے جواب دیا تو اس کی آواز کھردری سی تھی۔
بے اعتنائی اور بیزاری کی ہلکی سی جھلک اس کی آواز میں
نمایاں تھی "بے وقوف نہ بنو ڈیبی، تم بہت اچھی لڑکی ہو۔
بس اور کوئی بات نہیں، حقیقتاً تم نہیں چاہتیں کہ ایسا ہو۔
تمہیں یہ سب پسند نہیں۔ میرا مطلب ہے شادی سے پہلے
اور پھر کچھ بھی ہو پہلی مرتبہ میں تو یہ جھجک یہ مشکل پیش آتی
ہی ہے۔ ان حالات میں جبکہ تم بہت اچھی لڑکی ہو اور یہ
جگہ بھی اس کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا تو ہونا ہی تھا،
میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ڈیبی، تم آج کی لڑکیوں سے کتنی مختلف
ہو۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ تمہارا پہلا موقع ہے کیونکہ
آج تک جتنی لڑکیوں سے میرے تعلقات رہے ہیں کسی نے
ذرا سی مزاحمت نہیں کی۔ تم سمجھتی ہو نا میرا مطلب کیا ہے۔ جب
ہماری شادی ہو جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا"

میں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ میرا خیال نہیں
تھا کہ شادی کے لائسنس سے معاملہ کچھ بہتر ہو سکتا ہے۔ اس
رات پے در پے مجھے تین بھیانک خواب نظر آئے جن میں ہر
مرتبہ میں نے ایڈ کو وحشی، درندے اور جنسی دیوانے کے روپ

میں دیکھا، دوسری صبح پھر ہر چیز نارمل نظر آرہی تھی۔ میں نے اپنا سب سے اچھا لباس پہنا اور ایلین کے ساتھ ہوٹل میں لنچ کھانے کے لئے بناؤ سنگھار کرنے لگی، میں نے اپنے آپ کو خوش ظاہر کرنے کی کوشش کی، باتیں بھی میں ہلکی پھلکی کرتی رہی لیکن میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بتا سکتی تھی کہ وہ جان گئی ہے۔

دن گزرتے گئے، خواب پر خواب آتے رہے اور بالآخر شادی کا دن آپہنچا، گرجا میں لوگ حیرت سے ہم دونوں کی جوڑی دیکھ رہے تھے، میں اپنے دولہا کے برابر پادری کے سامنے سہمی سہمی کھڑی تھی۔ دولہا مجھ سے کہیں بڑا لگ رہا تھا میرا قد بمشکل اس کے سینے پر دل کے مقام تک پہنچتا تھا۔

ایڈ کا چہرہ سفید ہو رہا تھا، جب اس نے پادری کے سامنے مجھے چوما تو اس کے چہرے سے بے چینی کے آثار ہویدا تھے اس رات اس بھیانک خیال نے مجھے پھر آن گھیرا، میں نے ایڈ کو اپنے جسم پر ہاتھ بھی لگانے نہیں دیا۔ وہ بیچارا ساری رات بے چینی سے ٹہلتا رہا کئی بار اس نے میرے ساتھ بستر پر سونے کی کوشش کی، لیکن میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ تھک ہار کر وہ تکیہ لے کر صوفے پر سو گیا۔

میں ہنی مون سے واپس لوٹی تو میری دوشیزگی اسی طرح برقرار تھی جیسے کہ شادی سے پہلے تھی، ایڈ نے پرسکون رہنے کی کوشش کی، لیکن میں جانتی تھی کہ ایک شخص بھلا کب تک صبر کر سکتا ہے جبکہ اس کی بیوی قریب ہی موجود ہو؟ ایک شخص کب تک ایسی دلہن کو برداشت کر سکتا ہے جو اپنے دولہا کے ہاتھ لگاتے ہی چیخنے چلانے لگے؟

میں نے بھی پرسکون رہنے کی کوشش کی لیکن جب ایک دن ایڈ نے اپنے ہوش و حواس کھو دیئے تو میں نے اسے جنگلی، وحشی، درندہ اور جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔

اب ہم الگ الگ کمروں میں سوتے تھے، میں ہمیشہ اپنا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا لیتی تھی۔ راتیں ہم دونوں بیزاری سے الگ گزارتے تھے۔ دن میں ہم اس

طرح ساتھ رہتے کہ ہر کوئی ہمیں خوش باش میاں بیوی سمجھتا تھا، مگر ذرا سی تنہائی ملنے پر ہم پھر شائستہ اجنبی بن جاتے تھے میں نے سوچا ہم دونوں دوست کی حیثیت سے زندگی گزار دیں گے مگر ظاہر ہے یہ ناممکن تھا، بعض اوقات میرے دل میں یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہوتی کہ میں ایڈ کے کمرے میں چلی جاؤں، اپنے آپ کو اس کے بازوؤں میں دے دوں اور اسکا جو جی چاہے کرنے دوں لیکن وہی خیال مجھے جگہ سے حرکت کرنے سے بھی باز رکھتا تھا۔ اس کے کمرے میں جانے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔

ایلین سے میں نے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا اور اس نے کہا کہ اسے یہ سن کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی "یہی وجہ تو تھی کہ میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔" اس نے مجھ سے کہا "مجھ پر یہ سب بیت چکی ہے، میں اس جہنم سے گزر چکی ہوں اور میں تمہیں اس سے بچانا چاہتی تھی، مگر افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکی۔ میں نے سوچا تم اپنا اچھا بُرا مجھ سے بہتر سمجھ سکتی ہو، یاد رکھو، تم اب بچے کو جنم نہیں دے سکو گی۔"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، مجھے بچہ چاہیئے۔" میں نے بے اختیار کہا اور رونے لگی کیونکہ میں بچوں کو بہت چاہتی تھی۔

ایڈ بہت اچھا باپ ثابت ہو سکتا تھا، اگر اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ کیپ کے ساتھ اس کا رویہ کیسا تھا، شادی سے پہلے ایک دن ایڈ نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم اتنے بچے پیدا کریں گے کہ پوری بیس بال کی ٹیم بن جائے گی۔ تب تک ہم کسی بچے کو گود لے لیں گے، میں کسی بن ماں کے معصوم بچے کو اپنے گھر کی سرد اور شائستہ فضا میں لانا نہیں چاہتی تھی، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں اپنے حقیقی بچے کے سوا کسی اور بچے کو ماں کا پیار نہیں دے سکتی تھی میرا خیال ہے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عورت کسی دوسرے بچے کو ماں کی محبت دے سکی ہو۔ مجھے ایک مشرقی کہانی بخوبی یاد ہے کہ ایک بچے کے لئے دو عورتوں نے ماں ہونے کا دعویٰ کیا، منصف کو فیصلہ سنانے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد اس نے حکم دیا کہ بچے کے دو ٹکڑے کر کے دونوں عورتوں میں بانٹ دیا جائے، جس پر حقیقی ماں چیخ پڑی جبکہ دوسری عورت پر جو بچے کی ماں نہیں تھی، کوئی اثر نہ ہوا۔

"اس کے بارے میں اتنا نہ سوچو" ایلین نے کہا "تم اس کے بارے میں کر بھی کیا سکتی ہو؟ جب تک کہ تم ایڈ سے طلاق لے کر اپنے قد کے کسی لڑکے سے شادی نہ کر لو۔"

میں پھر رونے لگی، طلاق کے متعلق تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی، پھر سارے محلے میں میری بدنامی ہو جاتی۔ رشتے دار مجھ سے کترانے لگتے۔ طلاق کے بعد میں اپنے ابو اور بھائیوں کو کس طرح منہ دکھا سکتی تھی۔ ایک بار پھر میں اپنے غریب ابو پر بوجھ بن جاتی، نہیں، مجھے طلاق سے دور رہ کر کوئی اور حل اس مسئلے کا نکالنا تھا۔ ایڈ بھی طلاق پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ یہ بات شادی سے پہلے ہی اس نے مجھے بتا دی تھی اس نے کہا تھا کہ "ہماری جُدائی کسی ایک کی موت پر ہی ہو سکتی ہے۔"

اب میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایڈ بھی گھر کے کاموں میں میرا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ دیکھنے والے یہی کہتے تھے کہ میں بہت اچھی بیوی ثابت ہو رہی ہوں حالانکہ بات اس کے بالکل برعکس تھی۔ اب تک میں وظیفۂ زوجیت ادا کرنے سے قاصر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایڈ کی بیزاری میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔

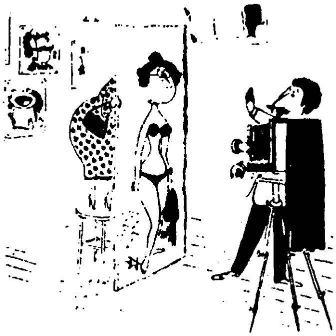
بڑی بدبختی کی زندگی گزار رہی تھی میں۔ ایلین کے لئے میں اپنے دل میں افسوس محسوس کرتی تھی۔ اب میں پچھتاتی تھی کہ اس کی بات میں نے کیوں نہ مانی۔ مگر اس وقت تو میں

جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی۔

اب وہ مجھے کچھ اور کہہ رہی تھی "ایڈ کے بارے میں تم کوئی فکر نہ کرو" اس نے کہا "وہ اپنے باپ کی طرح ہے جنسی آسودگی کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ جلد ہی وہ کسی لڑکی کو اپنا دوست بنا لے گا اور پھر وہ تمہیں تنہا چھوڑ دے گا"

اس خیال نے مجھ پر کپکپی طاری کر دی، یقیناً ایڈ جنسی تسکین حاصل کرنے کے لئے کسی عورت کو تلاش کر لے گا۔ آج کل ایسی عورتوں کی کمی نہیں ہے، آپ جہاں کہیں بھی نکل جائیں، رنگ برنگی تتلیاں آپ کو اڑتی نظر آئیں گی۔ یورپ کے ہر علاقے میں آپ کو پھولدار رنگ برنگے چست مختصر اور مشتعل کر دینے والے لباس میں ملبوس لڑکیاں آپ کو مسکراتی اور اٹھکھیلیاں کرتی نظر آئیں گی، آپ "ایکسکیوزمی" کہہ کر انہیں جہاں مرضی چاہے لے جا سکتے ہیں۔ ایڈ تو پھر بہت جذباتی نوجوان تھا لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ مجھ سے بے وفائی کرے گا۔ ان دنوں میں اس کے بھڑکے ہوئے جذبات سے خوفزدہ سی رہنے لگی، ٹھیک ہے کہ شادی کے بعد سے اب تک میں نے ایڈ کو اپنے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ لیکن کوئی دوسری عورت اس کی باہوں میں ہو مجھے یہ کسی صورت میں گوارا نہ تھا اور میں کیا دنیا کی کوئی بھی عورت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کے شوہر کی باہوں میں کوئی غیر عورت ہو۔

اور پھر ایک دن ایک عجیب و غریب بات وقوع پزیر ہوئی۔ ایڈ شرابی کبابی نہیں تھا لیکن اس رات جب وہ گھر آیا تو پئے ہوئے تھا۔ میں باورچی خانے میں الماری کے پاس پنجوں کے بل کھڑی اوپری خانے میں گلاس رکھ رہی تھی کہ میں نے ـــ اپنے پیچھے اس کے قدموں کی آہٹ سنی اور جب اس کی گرم گرم سانسیں اپنی گردن پر محسوس کیں تو گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور فرش پر گر کے چکنا چور ہو گیا "آج میں



وہی کروں گا جو میرا جی چاہے گا۔ چاہے تم اسے پسند کرو یا نہ کرو" وہ غرّایا۔

اس نے مجھے اٹھا لیا اور خواب گاہ کی طرف لے جانے لگا۔ میرے کپڑے پھاڑ کر اس نے مجھے بستر پر پھینک دیا۔ میں سسکیاں لینے لگی۔ میرے جسم پر رعشہ طاری تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ آج ایڈ کے جذبات قابو سے باہر ہو گئے تھے، وہ وحشیانہ انداز میں مجھے اذیت دے رہا تھا۔

"ایلن" میں حلق پھاڑ کر چیخی "ایلن! خدا کے لئے میری مدد کرو!"

اس پر وہ مجھے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا، میں انتظار کرنے لگی لیکن اس نے مجھے نہیں چھوا۔

میں بستر پر نیم عریاں لیٹی ہوئی اس کے ٹوٹ پڑنے کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ وہ .... مگر اس نے مجھے نہیں چھوا۔ آخر میں نے اپنی آنکھیں کھولدیں اور سہمی سہمی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایڈ کے سارے جذبات سرد پڑ گئے تھے۔ اس کے چہرے پر شدید بیزاری جھلک رہی تھی۔

"بڑی مضحکہ خیز بات ہے" اس نے کہا "میں نے بچپن سے طے کر لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو، کسی لڑکی سے محبّت

نہیں کروں گا کہ ساری لڑکیاں بناوٹ اور تصنع کا لبادہ اوڑھے ہوتے ہوتی ہیں۔ پھر جب تم سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے سوچا، اپنی امی اور آج کل کی لڑکیوں سے قطعی مختلف لڑکی مجھے مل گئی ہے، لیکن اس لڑکی نے کیا کیا؟ مجھے رات رات بھر تڑپایا۔ مجھے شراب پینے پر مجبور کر دیا۔ تم نے کبھی ایک اچھی بیوی بننے کی کوشش نہیں کی۔ تمہیں نہیں معلوم جب ایک عورت کسی مرد کو دھتکارتی ہے تو اس کی انا اور خودداری کو کس قدر ٹھیس پہنچتی ہے۔" وہ اپنی ایڑیوں پر مڑا اور دروازے کے پاس جانے لگا۔ مجھے بستر پر سسکتا اور بلکتا چھوڑ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں بعد اس نے کمرے میں پھر جھانکا "مجھے امید ہے کہ تم اور امی ایک ساتھ خوش رہو گی۔" اس نے کہا "اب میں واپس نہیں آؤں گا۔"

وہ واپس نہیں آیا اور ایلن مجھ سے یہ کہنے کے لئے آگئی کہ وہ کہاں گیا ہے، وہ للی نامی ایک فاحشہ عورت کے پاس گیا تھا جو اس شہر کی سب سے بدصورت عورت تھی، اپنی فحاشی کا مظاہرہ وہ سرِعام کرتی تھی، ہر ایک سے کہتی پھرتی تھی کہ میں فاحشہ عورت ہوں۔ وہ تصنع اور بناوٹ کا لبادہ اوڑھے ہوئے نہیں تھی۔ میں نے ہسٹریائی انداز میں سوچا کہ آخر ایڈ کو وہ عورت مل ہی گئی جس قسم کی وہ چاہتا تھا۔

دو راتیں گزر گئیں مگر وہ نہ آیا۔ ان دو راتوں میں مجھے جو اذیت اور پریشانی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ وہ عورت کون تھی، بات تو یہ ہے کہ وہ ایک غیر عورت تھی جس کے پاس میرا شوہر گیا تھا۔ ٹھیک ہے کہ میں وظیفۂ زوجیت اب تک ادا نہ کر سکی تھی لیکن مجھے اس سے محبت تو تھی۔

آخر جمعرات آن پہنچی اور وہ وقت بھی آن پہنچا، جب مجھے ایلن کے ساتھ آرڈن بیوٹی سیلون جانا تھا۔ ایلن نے مجھے فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ ٹھیک چار بجے گھر کے سامنے اپنی کار میں بیوٹی سیلون لے جائے گی۔ میں نے اپنا موڈ خوشگوار بنا لیا، میں نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا۔ اس امید پر کہ ممکن ہے ایڈ مجھے گلی میں دیکھے اور اسے احساس......

احساس کیا ہو؟ یہی کہ میں ایک کھوکھلی اور سرد لڑکی ہوں، بالکل برف کی طرح سرد، جو سیکس سے نفرت کرتی ہے جو کبھی اس کی بیوی نہیں بن سکتی؟ ہماری شادی اس سڑک کی طرح تھی جس کے شروع میں ہی بورڈ لگا ہو کہ "سڑک بند ہے۔ آگے جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

جب میں نے ایلن کی کار باہر رکنے کی آواز سنی، تو میں نے دستانے اٹھالئے اور پہننے لگی تب ٹیلیفون کی گھنٹی چیخنے لگی، میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف کیپ تھا۔ اس کی آواز گھبرائی ہوئی اور خوفزدہ سی تھی "باجی" اس نے کہا "کیا تم یہاں آسکتی ہو؟ ہمیں تمہاری ضرورت ہے جلدی! ایک خطرناک بات ہو گئی ہے۔"

یقیناً اس نے اپنی گیند سے کسی کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا ہو گا، میں نے سوچا اور پھر میں نے کہا "تم کچھ توقف نہیں کر سکتے کیپ؟ دراصل میرا ایک اپائنٹمنٹ....."

اس کی بے چین سی آواز نے میری بات کاٹ دی "یہ بات ابو سے متعلق ہے ڈیبی۔ وہ گر پڑے ہیں اور وہ بیمار ہو گئے ہیں۔ مارک اب اوپر ان کے پاس ہے اور پال گھر کے باہر کھڑا ڈاکٹر بیل کا انتظار کر رہا ہے۔"

میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ پانچ سیکنڈ کے بعد دوبارہ میرا سانس معمول کے مطابق چلنے لگا "کیپ" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "او کیپی، میں ابھی وہاں پہنچتی ہوں، ابو کا خیال رکھنا! اوہ میرے خدا، پلیز ابو کا

خیال رکھنا۔" میں آدھی بات کیپ سے کر رہی تھی۔ اور آدھی خدا سے۔

میں نے ایلین کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اس نے کہا "خیر پیاری، مجھے اپائنٹمنٹ منسوخ کرنے سے بڑی نفرت ہے، تم تو جانتی ہو، بیوٹی سیلونوں میں ان دنوں وقت لینا کتنا مشکل ہوتا ہے اور پھر آرڈن بیوٹی سیلون میں تو باری ایک ہفتے بعد آتی ہے، لیکن میرا خیال ہے تمہیں چلا جانا چاہیئے، میں تمہیں وہاں تک چھوڑ آؤں گی۔"

اس نے مجھے میرے پرانے اور بوسیدہ گھر کے دروازے پر چھوڑ دیا "میری یہ خواہش تھی کہ میں تمہارے ساتھ اندر چل کر تمہارے ابّو کی مزاج پرسی کروں۔" اس نے سرد مہری سے کہا "لیکن مجھے اپنے بال بنوانے بھی بہت ضروری ہیں چاہے کچھ بھی ہو، پھر یہ کہ بیمار آدمی کے پاس جانا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔" یہ کہہ کر اس نے کار آگے بڑھا دی اور میں بے یقینی سے اس کی کار کو جاتے ہوئے دیکھنے لگی 'بیمار آدمی؟ مگر وہ کوئی غیر آدمی تو نہ تھے، یہ تو میرے ابّو تھے۔ میرے ابّو۔"

ڈاکٹر بیل کی جانی پہچانی کار گھر کے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور کیپ خوفزدہ سا ہال میں بیٹھا تھا۔ میں نے ہال میں داخل ہوتے ہی اسے اپنی آغوش میں لے کر بھینچ لیا تھا اور گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں سوچنے لگی جب اسے اپنی آغوش میں لے کر پریشانی کے وقت اسے آرام اور سکون پہنچایا کرتی تھی۔ جب اس کا کتا کھو گیا تھا۔ جملے نہ بنانے پر استاد نے جب اس کی پٹائی کی تھی۔ محلے کے ایک لڑکے نے جب اس کی گیند چھین لی تھی جس دن اس کی سائیکل چوری ہو گئی تھی۔

"فکر نہ کرو کیپ" میں نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا "ابو اچھے ہو جائیں گے، انہیں اچھا ہونا ہی پڑے گا"



جب ڈاکٹر بیل نیچے آئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ ابّو کو زیادہ چوٹ نہیں آئی، ہڈی پسلی سب درست ہے بس جسم پر معمولی سی خراشیں ہیں۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں" ڈاکٹر بیل نے کہا "ایسے چھوٹے موٹے حادثات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ بہرحال حفظِ ماتقدم کے طور پر ان کا ایکسرے لے لیا جائے تو بہت اچھا ہے، مجھے ان کا تفصیلی معائنہ کرنا ہوگا۔ میرا مطلب ہے سازوسامان سے لیس ہوکر۔ انہیں کچھ عرصے کے لئے مکمل آرام کرنا ہوگا۔ انہیں آرام کی سخت ضرورت ہے ڈیبی تمہیں کھانا پکانے اور دوسرے گھریلو کام کاج کے لئے کسی عورت کو ملازم رکھ لینا چاہیئے۔ دیکھو نا عورت کے بغیر یہ گھر کباڑ خانہ لگ رہا ہے۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور میں نے خود کو کچھ بہتر محسوس کیا۔

"گھریلو کام کاج کے لئے ایک لڑکی موجود ہے" میں نے ان سے کہا "اور وہ میں ہوں۔"

میں دروازے تک ان کو چھوڑنے گئی، جب وہ چلے گئے تو میں نے گرد وپیش کا جائزہ لیا۔ واقعی سارے گھر میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ٹوٹا ہوا بلّا، ہاکی، بیس بال، میلے کچیلے کپڑے اور پرانے کاغذات چاروں طرف بکھرے پڑے تھے ڈرائنگ روم میں میز کرسیاں الٹی پڑی تھیں، ادھ الٹے قالین پر کیلیں، ہتھوڑا اور دو تین اسکروڈرائیور بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے۔

میں نے اوپر جا کر ابّو کو دیکھا، وہ سو رہے تھے۔ چند لمحوں تک میں انہیں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہی پھر میں نیچے ہال سے ہوتے ہوئے اپنے پرانے کمرے میں آگئی، میری پرانی پتلون اور شرٹ کا بنڈل جو میں نے الماری کے پیچھے پھینک دیا تھا، بدستور موجود تھا۔ میں نے پرانا لباس پہن کر چہرے سے میک اپ کی تہیں اتار دیں۔ آرڈن بیوٹی سیلون سے بنوائے ہوئے گیسو بکھرا کر میں نے سیدھے سادے طریقے سے انہیں باندھ دیا۔ جب اپنے پرانے حلیے میں، میں ہال کے اندر داخل ہوئی تو کپ مجھے دیکھ کر اچھل پڑا۔

"ارے تم پھر لڑکا بن گئیں، اوہ بوائے، اب مزا آئے گا" اس نے کہا "سنو یار وہ گلی میں مجھ سے ایک بڑا لڑکا آیا ہوا ہے مجھے بہت تنگ کرتا ہے، تمہیں اس سے نمٹنا ہوگا۔"

میں نے اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا، پھر میں نے شرٹ کو اوپر کر کے آگے گانٹھ لگائی اور گھر کی صفائی میں جُت گئی اور مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میں اس گھر سے گئی ہی نہیں تھی۔

اس رات کھانا کھانے کے بعد میں مکان کے پچھواڑے کپ کے ساتھ گئی اور گیند سے ہم دونوں لان پر کھیلنے لگے۔ جس کے بدلے میں اس نے وعدہ کیا تھا کہ برتن خشک کرتے وقت مدد کی ضرورت پڑی تو وہ کردے گا۔ مارک اور پال پھر مجھے چھیڑنے لگے، میں پھر ہنستے ہوئے یہاں سے وہاں دوڑنے لگی۔

اس رات اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ گزرا ہوا وقت لوٹ آئے، میں نے ان راتوں کو یاد کیا جب میں یہاں لیٹی دریچے کے ذریعے چاند تاروں کو تکتی رہتی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں بس یہ خیال ہوتا تھا کہ میری اور رایڈ کی ازدواجی زندگی کس قدر خوشگوار گزرے گی۔

اچانک میں نے ایڈ کے چہرے کو چاند میں دیکھا۔ یہ کسی ظالم شخص کا چہرہ نہ تھا جو ہر وقت یہ مطالبہ کرتا رہتا تھا کہ میں ......

نہیں نہیں یہ کسی جنسی دیوانے اور وحشی شخص کا چہرہ

نہ تھا بلکہ یہ تو ہنستے مسکراتے لڑکے کا چہرہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں پیار تھا، وحشیانہ چمک نہیں تھی۔

ایڈ اپنے باپ کی طرح نہیں ہے اور میں ایلین کی طرح نہیں ہوں، اگر یہ بات شادی سے پہلے اپنے ذہن میں بٹھا لیتی تو حالات اس کے قطعی برعکس ہوتے۔

میں بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر کے رونے لگی حتیٰ کہ میرا تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا، مجھے ایڈ کی یاد ستا رہی تھی۔ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

روزانہ میں اپنے پرانے لباس میں ملبوس صفائی کرنے کھانا پکانے، ڈھیر سارے کپڑوں کو دھونے اور استری کرنے میں لگی رہتی، میری غیر حاضری میں کپڑوں کے جو بٹن ٹوٹ گئے تھے، وہ میں نے ٹانک دیئے اور سارے گھر کو میں نے شیشے کی طرح چمکا دیا۔ گھر میں آ کر میں بہت خوش تھی۔ میں نے ایلین کے بارے میں نہیں سوچا، سوائے اس کے کہ اس نے فون کر کے مجھ سے بیوٹی سیلون چلنے کے بارے میں پوچھا، حسب معمول میں نے نفی میں جواب دے دیا۔ اس نے شاپنگ کرنے کے لئے مجھ سے پوچھا مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ان فضول چیزوں کے لئے میرے پاس وقت بھی نہ تھا۔ میں پوری طرح گھریلو کام کاج میں مصروف رہتی تھی اور اسی سے مجھے سکونِ قلب محسوس ہوتا تھا پھر یہ کہ ایڈ کی یاد بھی میں غافل رہتی تھی، ایلین اس عرصے میں مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ بیمار آدمی کے پاس جانا اسے پسند جو نہ تھا۔

ایک روز کپ باہر پڑوس کے ایک بچے کے ساتھ گیند سے کھیل رہا تھا۔ مارک اور پال کام پر گئے تھے کہ ابّو نے مجھے آواز دی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا اب وہ تھوڑی بہت چہل قدمی کر سکتے ہیں اگر انہیں یہ پسند ہو تو۔ اگر وہ چاہیں تو دریچے کے پاس

بھی بیٹھ سکتے ہیں۔

"ڈیبی" ابّو نے کہا "مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں اسی بستر پر پیدا ہوا اور اسی پر پلا بڑھا ہوں اور اسی بستر پر میری موت واقع ہو جائے گی۔ رومت میری بچّی، موت کا کوئی وقت متعین نہیں ہے اور پھر انسان کو ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا، اگر ہم دونوں کوشش کریں تو میں اس کرسی پر بیٹھ سکتا ہوں؟"

ایک ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر انہوں نے اپنا سارا وزن پیروں پر ڈال دیا۔ بڑی احتیاط سے میں نے بمشکل انہیں کرسی پر بٹھا دیا اور ایک کمبل بھی ان کے گھٹنوں پر ڈال دیا۔

انہوں نے محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تمہیں دیکھ کر مجھے تمہاری امّی یاد آ جاتی ہے" انہوں نے کہا "تم ہو بہو اس کی تصویر ہو۔ میں اُسے اپنے انگوٹھے سے بھی بڑی نہ سمجھتا تھا، لیکن بڑے سے بڑا کام وہ اس مستقل مزاجی سے کرتی کہ اس کی پیشانی پر شکن تک پیدا نہ ہوتی تھی۔ مجھے اُمید ہے کہ تمہارا شوہر تمہارے ساتھ خوش ہو گا بلکہ میرا خیال ہے وہ تمہارا شوہر ہونے میں اپنی خوش قسمتی تصوّر کرتا ہو گا۔"

میں دوڑتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل گئی۔ چنانچہ وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ میں رو رہی ہوں۔ یقیناً انہوں نے سمجھا ہو گا کہ میں شرما گئی ہوں، انہیں کیا معلوم کہ میرا شوہر مجھ سے کتنا بدظن ہے، اتنا کہ مجھے سرد پا کر ایک بدصورت اور فاحشہ عورت کے پاس چلا گیا۔

ڈاکٹر بیل روزانہ دوپہر کے کھانے کے بعد کلینک جاتے ہوئے ابّو کو دیکھ جاتے تھے، ایک دن میں انہیں دروازے تک رخصت کرنے گئی۔ خدا حافظ کہہ کر وہ جانے لگے تو میں نے ان کا بازو آہستگی سے پکڑ لیا۔

"میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے!"

آنسو پھر میرے رخساروں پر بہنے لگے۔ ڈاکٹر بیل نے جیب سے ایک صاف ستھرا رومال نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ "مجھے افسوس ہے ڈاکٹر بیل" میں نے کہا "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیئے۔ ہر چیز خلافِ توقع غلط ثابت ہو گئی ہے۔ میری ازدواجی زندگی ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے ڈاکٹر، اتنے دن ہو گئے شادی کو اور اب تک"

میں نے اب تک کے واقعات انکے گوش گزار کر دیئے ایڈا اور میں ایک دوسرے سے کتنے ناخوش ہیں۔ شادی سے پہلے میری ساس نے مجھے کیا بتایا تھا۔ میں بحیثیت ایک بیوی کے اپنے شوہر سے کس قدر خوفزدہ تھی۔

"میں اچھی نہیں ہوں۔" میں نے کہا "مجھ میں غالباً کسی قسم کا نقص ہے۔"

بڑے غور سے انہوں نے میری باتیں سنیں اور پھر کہا "نہیں ڈیبی، کیا تم جانتی ہو میرے آدھے مریضوں کے امراض کی وجہ بیوقوف بوڑھی عورتیں ہوتی ہیں؟ ایک عورت دوسری عورت سے معمولی سی کھانسی پر یہ کہتی ہے کہ تمہیں تپدق ہو گئی ہے یا ذرا سے درد پر ایک عورت دوسری عورت سے جو یقیناً نو آموز اور نا تجربہ کار ہوتی ہے، یہ کہتی ہے کہ تمہیں کینسر کا مرض لاحق ہے۔ فلاں مکسچر پیو اور فلاں گولیاں کھاؤ۔ کسی سے بس اتنا کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ تمہیں فلاں مرض لاحق ہے اور وہ اس پر یقین کرنے لگتا ہے سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے یہی خیال اس کے ذہن میں چکر لگانے لگتا ہے وہ حقیقی درد محسوس کرنے لگتا ہے۔ بعض اوقات اس وہم میں مریض کی موت واقع ہو جاتی ہے جو یقیناً مریض نہیں ہوتا۔ تمہارا معاملہ بھی بس اسی قسم کا ہے۔ خدا کی قسم ڈیبی، میں تو تمہیں بہت ذہین سمجھتا تھا۔

میں نے احتجاج کرنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا "میں تمہارا معائنہ کرنے سے پہلے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں تم تفصیلی معائنہ کرانے میری کلینک پر آجاؤ پھر اگر میں یہ کہوں کہ تم میں کوئی نقص نہیں ہے تو کیا تم یقین کرو گی؟"

شام کو جب کیپ آگیا تو میں نے اُسے ایوب کے پاس ٹھہرنے کی ہدایت کی اور ڈاکٹر بیل کے کلینک پر جا پہنچی۔ ڈاکٹر بیل کا کہنا بالکل درست ثابت ہوا۔ مجھ میں واقعی کوئی نقص نہیں تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

پھر میں نے امّی کے بارے میں پوچھا "اور کیا یہ میرے لئے خطرے سے خالی نہیں کہ میں ایک بلند قامت شخص کے بچّے کو جنم دوں" اس پر انہوں نے کہا کہ "امّی کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی اگر وہ سیڑھیوں سے گر نہیں پڑتیں۔ وہ اس دن سیڑھیوں سے گری تھیں جس دن کیپ نے جنم لیا تھا اور اس بات کو سوائے ڈاکٹر بیل کے کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ ابّو نے سیڑھیوں کی مرمت کرنے کے بعد ہتھوڑا وہیں چھوڑ دیا تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے امّی کا پاؤں پھسل گیا۔ انہوں نے ڈاکٹر سے وعدہ کر لیا تھا کہ اس بات کو ہمیشہ راز رکھیں گے۔ تاکہ ابّو خود کو مجرم نہ سمجھیں۔

"میرا خیال ہے اب اس بات کو راز میں رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "میں اب بھی تمہیں یہ بات نہ بتاتا لیکن تمہاری امی اگر زندہ ہوتیں تو وہ بھی اس کی اجازت دے دیتیں۔ بہرحال اگر تم اب بھی اس بات کو راز میں رکھو تو بہت اچھا ہے۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بارش کے بعد آفتاب طلوع ہو گیا ہو۔ میں نے سوچا، میرے والدین ایک دوسرے کو کتنا چاہتے تھے اور میں نے اپنی ساس کے بارے میں سوچا جس نے شادی رکوانے کے لئے یہ چکّر چلایا تھا۔

ڈاکٹر بیل کے کلینک سے میں جیسے اُڑتی ہوئی گھر آگئی دنیا مجھے بے حد خوبصورت نظر آرہی تھی۔ ہر پتّہ، ہر شاخ، ہر پھول مجھے بہت حسین نظر آرہا تھا۔ میں اپنے آپ کو پھر سے نوعمر محسوس کر رہی تھی، میں ایڈ سے ملنا چاہتی تھی، لیکن کوئی میرے کان میں کہہ رہا تھا "انتظار کرو، وہ خود ہی تم سے ملنے آجائے گا"

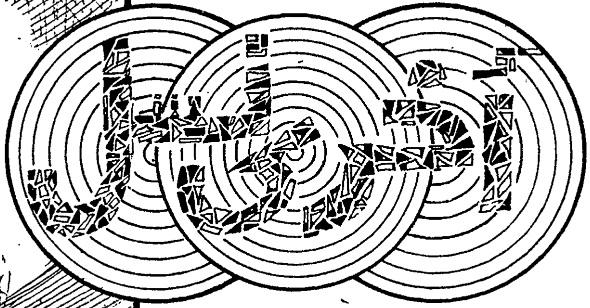
ایک ہفتے بعد وہ واقعی آگیا۔ میں نے صدر دروازہ کھول دیا۔ وہ دہلیز پر کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی "میں نے آج ڈاکٹر بیل سے ان کے کلینک پر ملاقات کی تھی۔" اس نے کہا "انہوں نے خود فون کر کے مجھے بلایا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے ابّو بہت بیمار ہیں چنانچہ میں نے سوچا چلو ان کی مزاج پرسی کر لوں۔"

اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے وہی جین کی پتلون اور سفید بشرٹ پہن رکھی تھی۔ میرے پاؤں ننگے تھے، شرٹ میں نے حسبِ معمول اوپر کر کے آگے سے گانٹھ دے لی تھی۔ بال میرے شانے پر بکھرے ہوئے تھے۔

ایک منٹ تک میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک عیاں تھی۔

"او ڈیبی" اس نے کہا "اوہ ڈیبی، مجھے معاف کر دو" آگے بڑھ کر اس نے مجھے اپنی مضبوط باہوں میں جکڑ لیا، میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس نے میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ میں رونے اور ہنسنے لگی "ڈیبی نہیں" میں نے کہا "میں ڈیبی نہیں ہوں۔ جین ہوں۔ ٹارزن کی بیوی۔"

پھر جب اس نے مجھے اپنی آغوش سے الگ کر دیا، تب میں نے کہا "اوہ ایڈ۔ ایڈ ڈارلنگ، سب ٹھیک ہو جائے گا سب ٹھیک ہو جائے گا"



زبیدہ فریدی

جو واقعات ابھی آپ پڑھنے والے ہیں ممکن ہے وہ بعید از فہم ہوں اور عقلِ سلیم انھیں تسلیم کرنے پر تیار نہ ہو۔ لیکن یہ سب کچھ حقیقت ہے اور اس تلخ حقیقت سے ہمارا خاندان آج تک دوچار ہے۔ یہ برسوں پہلے کا ذکر ہے جب ہم لوگ اپنے آپ میں گم تھے اور اپنے دادا ابّا کے ساتھ وطن سے دور اُن کے حویلی نما مکان میں بہت پرسکون زندگی گزار رہے تھے کہ ہمارے سکون اور ہماری مسکراہٹوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔

اصل واقعے کو بیان کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ میں اپنا خاندانی پس منظر بتاتی چلوں۔ ہمارے دادا ابّا ڈپٹی کلکٹر تھے، اور ابا جان محکمۂ جنگلات میں ملازم تھے۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا جنگلات کے محکمے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے والد کی رہائش عموماً گھنے جنگلوں میں ہوا کرتی تھی۔ وہ جب جنگلوں سے واپس لوٹتے تو اپنے عجیب و غریب تاثرات بیان کرتے۔ والد صاحب کی زبانی ان جنگلوں کا پراسرار ماحول سُن کر ہم بھائی بہنوں کو کبھی ہمت نہ ہوئی کہ ہم ان کے ساتھ جانے اور جنگل کے ماحول کا لطف اٹھانے کے لئے اصرار کرتے چھٹی کے دنوں کے سوا کبھی ہمیں موقع نہیں ملا کہ ہم والد صاحب کی زندگی میں ان کے ساتھ رہتے۔ بات یہ تھی کہ دادا ابّا کی شفقتوں نے ہمیں والد صاحب سے کسی قدر



بے نیاز کر دیا تھا۔ ہم انکی محبتوں کے سائے میں مگن اپنے بچپن کے سب سے خوبصورت سب سے رنگین دن گزار رہے تھے کہ ایک واقعے نے ہمارے گھر کی خوشیاں ہم سے چھین لیں۔

یہ ایک چمکیلی دوپہر کا ذکر ہے ـــــ جب ہم بچے دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ ابا جان کا اردلی آتا دکھائی دیا۔ ہم اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے ــــ بھیّا دور ہی سے چلائے "رفیق آ گئے۔ رفیق آ گئے" اردلی کا یہ دستور تھا کہ وہ گھر آتے ہی کسی نہ کسی بچے کو اپنے کاندھوں پر اٹھالیتا، کسی کے سر پہ ہاتھ پھیرتا اور کسی کی بلائیں لیتا۔ ہم سب اس سے بُری طرح چمٹ جاتے۔ لیکن آج وہ بے حد خاموش تھا، جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ وہ سکتے کے سے عالم میں کھڑا ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی اجنبی شخص ہو اور چھوٹی بی بی، بھیّا، بے بی سب کو اس نے پہلی بار دیکھا ہو۔ اس کی اس غیر متوقع خاموشی کو دیکھ کر ہم سب نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ابا جان کہاں ہیں؟ وہ کب آئیں گے؟"

ہمارے سوال کے جواب میں اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور منھ دوسری طرف پھیر کر رُندھی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"دادا جان کہاں ہیں؟"

"دادا ابا، دادا ابا" ہم لوگ چیخنے چلانے لگے اور بغیر کچھ کہے سنے اُسے گھسیٹتے ہوئے دادا ابا کے کمرے کی طرف لے چلے، لیکن کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رفیق نے بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا ہم سب حیران پریشان کھڑے تھے۔ یہ تو ہمیں اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ رفیق کوئی بُری خبر لے کر آیا ہے۔ مگر ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ خبر اس قدر ہولناک ہوگی۔ رفیق ابا جان کی موت کی خبر لے کر آیا تھا۔ ابا جان کی موت ہمیں غم کے مفہوم سے آشنا کر گئی۔ وہ ہم سے دور رہتے تھے مگر وہ ہم سے کسقدر قریب تھے اس کا اندازہ ہمیں ان کے مستقل جدا ہونے پر ہوا۔ ابا جان کو جنگلوں کے زہریلے باسی نے ڈس لیا تھا۔ جن سے انھیں بے حد پیار تھا۔ عجیب بات تھی کہ ابا جان کی موت کے صدمے پر دادا ابا نے بڑی برداشت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اپنے طور پر پوری کوشش کی کہ وہ ہمیں ابا جان کی کمی محسوس نہ ہونے دیں اور وہ اس میں کامیاب رہے۔

سال گزر گئے ـــــ رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آ گئی۔ گھر میں ـــــ کوئی نئی تبدیلی نہیں آئی تھی، بس گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہوا تھا۔ یہ ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ جو دادا ابا کو انہی ویران پہاڑوں پر کہیں مل گئے تھے، دادا ابا نے ان سے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور وہ یہ کہتے ہوئے کہ "میرے لئے یہی حکم ہے" دادا ابا کے ساتھ گھر آ گئے۔ زنان خانے سے خاصی دور مردانے حصّے میں ایک کمرہ انکے لئے مخصوص کر دیا گیا اور وہ اپنے اسی حجرے میں گھُسے شب و روز عبادت میں مشغول رہتے۔ زمینوں کے سلسلے میں دادا ابا طویل عرصے تک غیر حاضر رہتے۔ ان کی غیر موجودگی میں ہماری حفاظت کی تمام ذمہ داری انہی بزرگ کے سپرد ہوتی۔ جب دادا ابا دورے پر جانے لگتے تو ایک ہلکی سی دستک ان کے دروازے پر دیتے جسے سن کر وہ فوراً دروازہ کھول دیتے۔ دادا ابا دست بستہ سلام عرض کرتے اور کہتے۔

"حضرت میں باہر جا رہا ہوں۔ بچے تنہا ہیں۔"

نہ اس سے زیادہ انھوں نے کبھی کچھ کہا اور نہ ان بزرگ نے اس سے زیادہ کبھی کچھ سُنا۔ وہ الٹے پاؤں کمرے میں واپس چلے جاتے۔ اسکے بعد ان کے حجرے کا دروازہ اس وقت تک کھُلا رہتا جب تک دادا ابا دورے سے واپس نہ آ جائیں۔

درمیانی عرصہ سب پر بڑا شاق گزرتا یوں لگتا جیسے گھر کے ہر حصے میں دو طلسماتی آنکھیں ہمیں گھور رہی ہوں، ہر غلط بات پر تنبیہ کر رہی ہوں۔ دادا ابا کی عدم موجودگی میں ہم گھر کے پرانے ملازموں کے ساتھ لمبے لمبے پروگرام بنا لیا کرتے۔ جی بھر کے باغوں کی

سیر ہوتی، خوب غل غپاڑا ہوتا۔ دادا ابا کی موجودگی میں بھیّا جس گھوڑے کو تنہا چھو نہ سکتے تھے، اب اس پر خوب سواری ہوتی گھریلو ملازم کے ہمراہ گرد و نواح کے تفریحی مقامات کی اچھی طرح چھان بین کی جاتی۔ یہ سب اس خیالِ خام میں ہوتا کہ شاید اس طرح ہم ان آنکھوں کے طلسمی اثر سے بچ سکیں۔ مگر وہ آنکھیں۔

ایسے ہی ایک دن کا ذکر ہے۔ دادا ابا ایک ہفتے سے باہر تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ تقریباً اتنا ہی عرصہ انھیں اور باہر گزارنا ہے۔ بھیّا نے بڑی رازداری سے گھوڑ سواری کا پروگرام بنایا۔ ظاہر ہے دادا ابا کے ساتھ سواری میں وہ مزہ کہاں سے آتا جو اُن کی عدم موجودگی میں تھا۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ یہاں تک نہ جاؤ، وہاں تک نہ جاؤ۔ سینکڑوں پابندیاں تھیں۔ بھیّا نے مجھے اپنا ہم راز بنایا شاید اکیلے سواری کی ہمت ان میں ابھی نہ آئی تھی۔

"میری پیاری بھنّو۔ کچھ دُور تک گھوم آئیں۔"

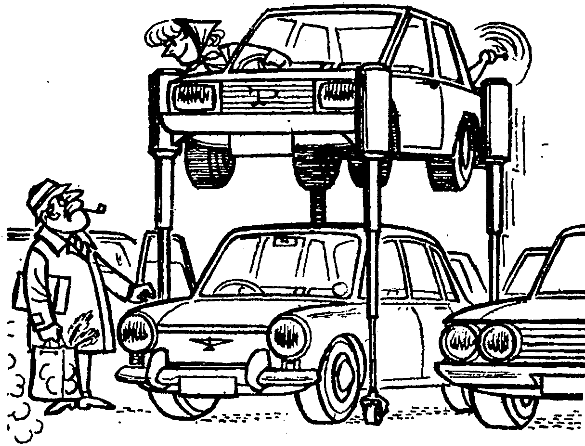
ان کی خوشامد پر میں نے اِتراتے ہوئے کہا "چلئے بھئی۔" اور مصنوعی غصّے کا اظہار کرتے ہوئے میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ خیال تھا کہ ابھی ایک گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔ لیکن کھلی فضا میں آتے ہی بھیّا ترنگ میں آگئے۔ گھوڑے کو جو سرپٹ دوڑایا تو دوڑاتے چلے گئے۔ وہ ایک ایسے انجانے راستے پر ہو لیئے جس پر جانے کی انھیں ایک عرصے سے خواہش تھی۔ دادا ابا کے ساتھ سواری کرتے کرتے بھیا خاصے مشاق سوار بن چکے تھے۔ ہم اپنی دُھن میں مگن شاہانہ انداز میں گرد و نواح کے دلکش نظاروں سے لطف اندوز ہوتے آگے بڑھ رہے تھے۔ گھر سے نکلے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ وقت کا کوئی احساس ہی نہ تھا۔ اچانک بھیّا چلائے "زبیدہ اِدھر دیکھو، وہ کیا ہے؟" میں نے نظر دوڑائی لیکن سرسراتی جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ دیکھ سکی۔ میں نے مجسّم سوال بن کر بھیّا کی طرف دیکھا "وہ، وہ" انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"اُفوہ! حد ہو گئی بھئی" میں زور سے ہنس پڑی "واقعی بہت خاص چیز ہے۔" یہ دو جنگلی خرگوش تھے جو معصومیت سے اِدھر اُدھر اُچھل کود رہے تھے۔ قبل اس کے کہ میں کچھ بولوں۔ بھیا خرگوش کے پیچھے گھوڑا ڈال چکے تھے وہ انھیں پکڑ کر اور چھو کر دیکھنا چاہتے تھے، لیکن خرگوش گھوڑے سے ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ یکا یک دونوں خرگوش اچھلے اور قلانچیں بھرتے ہوئے دُور نکل گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لے کر بھیا کی طرف دیکھا اور انھیں یاد دلایا کہ ہمیں گھر چھوڑے بہت دیر ہو گئی ہے۔ کہیں میاں صاحب کو خبر نہ ہو جائے لیکن بھیا کے کان پر جوں نہ رینگی۔ ان کی دیوانگی میں اور شدت آگئی تھی۔ انھوں نے زور سے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ عربی النسل گھوڑا مالک کے اشارے پر آگے بڑھا، غالباً اس کا پیر کسی سوکھی ہوئی جھاڑی سے الجھا، وہ رکا، اُچھلا اور پھر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ یہ سب اس قدر آناً فاناً ہوا کہ ہم کچھ بھی نہ سمجھ سکے ہمارے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو چکی تھی۔ گھوڑے پر بھیا کی گرفت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ ہم اچھلتے کودتے فراٹے بھرتے گھوڑے کی پیٹھ سے چمٹے اندھا دھند آگے بڑھ رہے تھے اور آنے والے بھیانک لمحوں کے منتظر تھے۔ کچھ دیر پہلے کے دلکش مناظر ہماری آنکھوں میں سمٹ کر رہ گئے تھے، اب تو ہر طرف طوفان کا سا شور تھا اور ہر لمحے کوئی خطرناک بات واقع ہونے کا خوف ہم دونوں نے دعائیں پڑھنی شروع کر دیں۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے اس طوفان کی شدت میں کمی آگئی ہو، کانوں میں سائیں سائیں کی آواز ہلکی ہوتی ہوتی بالکل ختم ہو گئی۔ میں نے واہمہ سمجھ کر ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو میں اور بھیا بیک وقت خوشی سے چلّائے "ارے یہ کیا!" ہم تو اپنی حویلی کے پھاٹک پر کھڑے تھے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ہمارے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے۔ میاں صاحب گھوڑے کی راسیں تھامے اپنی لال لال آنکھوں سے ہمیں گھور رہے تھے، وہی آنکھیں جو سارے گھر میں گردش کرتی رہتی تھیں، وہی پُر جلال آنکھیں ـــــ اور سرکش گھوڑا خوفزدہ بلّی کی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا۔

اس واقعے کے بعد میاں صاحب کے لئے ہمارے دلوں میں

خوف و دہشت کے بجائے ہمدردی اور محبت کے جذبات نے جگہ لے لی
دن ان کی نگرانی میں اسی طرح گزرتے رہے۔ مارچ اور اپریل کے
دنوں میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ مجھے یاد ہے یہ وہ زمانہ تھا جب
آموں کے درخت بور سے لد گئے تھے۔ ہوا میں ایک سحر انگیز خوشبو
بسی ہوئی تھی۔ یہ زمانہ ہمارے علاقے کے شباب کا زمانہ تھا ـــــ
علاقے کے لوگ طرح طرح سے اس خوشگوار موسم کو مناتے، میلے لگتے،
ناچ رنگ ہوتا، نوٹنکی ہوتی۔ میلوں میں ابھرتے ہوئے نوجوانوں کو
اپنے اپنے فن کی مہارت دکھانے کا موقع دیا جاتا۔ اس بار بھی پہلے
سے تیاریاں ہوئیں۔ برسوں پرانے قاعدے کے مطابق جیتنے والوں
کو ہمارے باغوں کے سب سے عمدہ درختوں کے آم پیش کیے جاتے۔
اور دو درختوں کے آم ٹھاکر بلرام سنگھ کی طرف سے جو ہمارے ہم رتبہ
تھے ـــ روایت کے مطابق ریس میں صرف ٹھاکر صاحب اور ہمارے
خاندان کے افراد حصہ لے سکتے تھے۔ گزشتہ برس تک ابا جان اس
مقابلے میں شریک ہوتے رہے تھے لیکن اب .... اب وہ نہ تھے۔
پھر کیا ہوگا؟ یہ سوال ہمارے سامنے ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ ایسی
صورت میں دادا ابا کا یہ فیصلہ کچھ کم خطرناک نہ تھا کہ بھیا اس ریس
میں حصہ لیں گے۔ گزشتہ مہینوں سے وہ بھیا کی شہسواری پر خاص
توجہ دیتے رہے تھے۔ جہاں اس فیصلے سے ہم سب ہراساں تھے،
وہاں بھیا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انھوں نے اپنی سرگرمیاں
اور تیز کردی تھیں۔ دونوں طرف مقابلے کی تیاریاں کی جارہی تھیں
اور مقابلے میں صرف دو ہفتے باقی تھے کہ ایک دن اچانک بھیا کو
بخار چڑھ آیا، اور ایسا چڑھا کہ دو دن میں بھیا برسوں کے بیمار
نظر آنے لگے۔ دوا علاج کیا گیا لیکن ان کی حالت گرتی گئی۔ اور تو
اور ریس میں حصہ لینے والے گھوڑے کی حالت بھی یہی کچھ تھی، سارا
دن کھانا پینا چھوڑے وہ زمین پر یوں بیٹھا رہتا جیسے اس کی
بے مثال قوت ختم ہورہی ہو، یا اسے کوئی انجانی شے گھن کی طرح
چاٹ رہی ہو۔ دادا ابا کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ ایسے میں انھیں
میاں صاحب کا خیال آیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ دستک پر حسب معمول
جب میاں صاحب باہر آئے تو دادا ابا ان کے پیروں پر گر پڑے اور
بُری طرح رونے لگے۔ میاں صاحب نے انھیں بازو سے پکڑ کر اٹھایا
اور بغیر کچھ کہے سنے بھیا کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ کمرے میں پہنچ کر
ان کی متجسس نظریں بھیا کے سارے جسم پر ہوتی ہوئی ان کے زرد
چہرے پر رک گئیں۔ ایک لمحے میاں صاحب نے کچھ سوچا اور اصطبل
کی طرف چل پڑے۔ گھوڑا زمین پر بے سُدھ پڑا تھا اسکی طرف
غور سے دیکھنے کے بعد وہ پہلی بار دادا ابا سے مخاطب ہوئے انھوں
نے صرف اتنا کہا "میرے ساتھ چل!"

طویل راہداریوں کو طے کرتے ہوئے وہ گھر کے قریب پرانے مندر
کی طرف چل پڑے۔ گھر کے ملازمین اور ہم سب بھی ان کے قدم بہ قدم
تھے، مندر کی قدیم باؤڑی پر جاکر میاں صاحب رک گئے۔ اِدھر اُدھر
دیکھا۔ جھٹکے سے ایک پتھر اُٹھایا اور اس کے نیچے سے کوئی چیز اُٹھا
کر دادا ابا کے سامنے کردی۔ یہ ایک پرانی قمیص تھی جس میں کچھ چیزیں
لپٹی ہوئی تھیں "اسے کھولو" میاں صاحب کے لہجے میں غصہ اور
جلال تھا۔ دادا ابا نے کانپتے ہاتھوں سے اسے کھولا، سب لوگ حیرت
سے چیخ پڑے یہ بھیا کا پتلا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھے۔ گھوڑے اور
بھیا کے جسم میں سرتاپیر اس طرح سُوئیاں چبھوئی گئی تھیں کہ خالی
جگہ مشکل ہی سے نظر آتی تھی۔ دادا ابا اور دوسرے لوگ سکتے کے
عالم میں کھڑے اس پُتلے کو گھور رہے تھے کہ میاں صاحب نے آگے
بڑھ کر دونوں چیزیں اپنے ہاتھ میں لے لیں اس وقت ان کی نگاہوں
میں شعلے لپک رہے تھے۔ انھوں نے غضبناک نظروں سے قمیص کو
دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر قمیص پر پھونک دیا۔ پھر مجمع کو عالمِ
حیرت میں چھوڑ کر گھر کی طرف چل پڑے ـــ یکایک مندر کی طرف سے چیخوں
کی آوازیں آنے لگیں اور سب نے دیکھا کہ مندر کا بڑا پجاری بھاگتا ہوا آیا
اور باؤڑی میں کود پڑا، جب وہ ابھرا تو یہ دیکھ کر سب دنگ رہ گئے کہ اس
پجاری کا سارا بدن جھلسا ہوا تھا۔ وہ کرب کے عالم میں چیخ رہا تھا ـــ



اس واقعے کے بعد بھیا کی حالت بہتر ہوتی گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ریس ہوئی اور بھیا نے شاندار کامیابی حاصل کی، ٹھاکر صاحب اپنی سازش کی طرح اس میدان میں بھی ہار گئے۔

میاں صاحب کا چرچا اس واقعے کے بعد سارے علاقے میں پھیل گیا۔ لوگ انھیں ایک نظر دیکھنے کے لیے گھنٹوں کھڑے رہتے۔ کئی غرض مند کسی نہ کسی طرح حجرے تک پہنچ جاتے۔ بہرحال کوئی کامیاب ہوتا اور کوئی مایوس چلا جاتا۔ مایوس شخص لاکھ جتن کرتا مگر کامیابی نہ ہوتی۔

اس ماحول میں ہمارا لڑکپن آہستہ آہستہ گزر رہا تھا اور یونہی گزر جاتا اگر ہماری دبے پاؤں گزرتی کم سنی کو یہ واقعہ جھنجوڑ کر نہ رکھ دیتا۔

علی الصباح ہم بھائی بہن ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر حسب معمول میاں صاحب کے عقیدت مندوں کا جائزہ لینے ان کے حجرے کے قریب جا پہنچے۔ حجرہ کھلا ہوا تھا۔ دادا ابا کی موجودگی میں حجرے کا کھلا ہونا ہمیں حیرت زدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اندر سے دادا ابا کی گلوگیر آواز آ رہی تھی۔ ہم آگے بڑھے بغیر نہ رہ سکے۔ حجرے میں دادا ابا میاں صاحب کے آگے دو زانو تھے اور کہہ رہے تھے "حضرت! یہ آپ نے کیا ارادہ کر لیا۔ میرے بچے اب کس پر رہیں گے، آپ کی وجہ سے میں بچوں کی فکر سے آزاد تھا۔ ان بچوں کی خاطر آپ یہاں سے نہ جائیں میں تو یہ سمجھتا تھا کہ اسی طرح آپ کی خدمت کرتا رہوں گا، مجھے اپنی خدمت سے محروم نہ کیجیے" دادا ابا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

میاں صاحب حسب دستور خاموش تھے۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہہ رہے تھے۔ یہ باتیں ہماری عقل و فہم سے بالاتر تھیں۔ ہم منہ کھولے انھیں دیکھ ہی رہے تھے کہ یکایک میاں صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک لمحے کو اپنی سحر انگیز آنکھیں اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ خوف کی ایک سرد لہر ہمارے جسموں میں دوڑ گئی۔ آگے بڑھ کر انھوں نے ایک تھیلا اٹھایا۔ کچھ سوچا اور واپس اپنی جگہ رکھ دیا اور حجرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے۔ درمیانی عرصے میں دادا ابا ہذیانی انداز میں یہی کہتے رہے "حضرت، اپنا فیصلہ بدل دیجیے ان بچوں کی خاطر، مجھے تنہا نہ چھوڑیے۔" مجھے وہ لمحے اب تک یاد ہیں شدید گرمی کے باوجود ہمارے جسم کپکپا رہے تھے، ماحول بڑا پُراسرار تھا۔ کچھ توقف کے بعد میاں صاحب کی آواز گونجی۔ وہ دادا ابا سے مخاطب تھے "میں رک نہیں سکتا۔ میرے لیے یہی حکم ہے، مجھے ان بچوں سے بے حد پیار ہے، مگر میں مجبور ہوں۔ ہاں جانے سے پہلے ایک چیز دیے جاتا ہوں شاید یہ ان کے کام آئے۔" یہ کہہ کر انھوں نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور ایک گُڑی مُڑی سی چیز نکال کر فرش پر ایک طرف پھینک دی اور تحکمانہ لہجے میں بولے "لال میرے بعد اس گھر کی حفاظت تمہارے ذمے ہے، میرا کام ختم ہوا۔"

ایک ساتھ ہماری نظریں اس طرف اٹھیں جس طرف میاں صاحب کا تحفہ پڑا ہوا تھا۔ اف خدا! ہماری رگوں میں خون جمنے لگا۔ میاں صاحب کا تحفہ گز بھر کے ایک لمبے سانپ کی شکل میں ہمارے سامنے لہرا رہا تھا۔ ہم تو خیر کم سن تھے لیکن خود دادا ابا دہشت زدہ ایک کونے میں سمٹے کھڑے تھے، ہمارا سحر دھیرے دھیرے ٹوٹ رہا تھا۔ وہ یوں مست بیٹھا تھا جیسے برسوں سے یہیں کا باسی ہو۔ میاں صاحب روانہ ہو چکے تھے کسی نامعلوم منزل کی طرف اپنا وہ عجیب وغریب تحفہ چھوڑ کر جس نے ہمیں الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کی آنکھیں میاں صاحب کی طلسمی آنکھوں سے زیادہ چمکدار تھیں۔

کئی سال گزر گئے۔ دنوں کے اس ہیر پھیر میں 'لال' ہم سے اور ہم لال سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ اب ہم چار بھائی بہنوں کے درمیان لال پانچویں فرد کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا۔ وہ ہمارے سامنے ایسے کھیلتا جیسے بچے مل کر آپس میں کھیلتے ہیں۔ اس کے کھانے کا برتن وہیں رہتا جہاں ہم سب کھانا کھاتے۔ اسکا سارا دن ہمارے ساتھ گزرتا۔ اسکی عادت تھی کہ وہ شام کو ہم سے علیحدہ ہو جاتا، گرمیوں میں اس کا ٹھکانا ہمارے گھر کا کوئی سرد ترین گوشہ ہوتا اور سردیوں میں چولھے کی نیم گرم راکھ اس کا بستر ہوتی بعض اوقات اس کی حرکات و سکنات سے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ سانپ نہ ہو کوئی ماورائی مخلوق ہو جو کسی طلسمی اثر کے تحت ہمارے درمیان چل پھر رہی ہو۔ عام سانپوں سے ہمارے ڈر کا وہی عالم تھا لیکن لال ــــ لال تو ہمیں سب سے مختلف نظر آتا۔ سب سے جُدا۔ دادا ابا اب بھی دورے پر جاتے بالکل بے فکر ہو کر ــ کیونکہ ہم لوگوں کی حفاظت کے لئے لال جیسا مضبوط محافظ موجود تھا۔

ایسی ہی ایک شام جب دادا ابا باہر گئے ہوئے تھے ــ اور ہم لوگ ملازمین کے ساتھ تنہا تھے۔ ہم دیر تک کھیلتے رہے پھر پڑھنے بیٹھ گئے اور پڑھتے پڑھتے نہ جانے کس وقت نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔ لیکن رات کے پچھلے پہر اچانک ہماری آنکھ کھل گئی۔ یہ کون تھا جو ہماری ڈیوڑھی پر زور زور سے بول رہا تھا۔ بہ یک وقت کئی آوازیں تھیں۔ ان میں چوکیدار کی آواز سب سے نمایاں تھی ــ یہ شور کیسا ہے؟ ہم سوچ میں پڑ گئے۔ سب بہن بھائی جاگ گئے تھے اور دہشت زدہ سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھیا کو اکسایا "بھیا، ذرا چل کے دیکھئے تو سہی، یہ شور کیسا ہے؟" اور شبنم چیخنے لگی "لال کہاں ہے؟" ہم سب بھاگتے ہوئے لال کے مسکن پر پہنچے لیکن وہ موجود نہیں تھا۔ پھر کہاں گیا؟ کسی انجانے خطرے کے احساس سے ہمارے دل لرز اٹھے۔ آخر جانور ہے! کہیں اس کی فطرت عود نہ کر آئی ہو۔ ہم بے دھڑک ڈیوڑھی کی طرف بڑھے جہاں کا شور دبی دبی سرگوشیوں میں بدل گیا تھا ــ

"بابا" بھیا نے چوکیدار کو آواز دیتے ہوئے دروازے میں قدم رکھا لیکن ٹھٹھک کر رک گئے، دروازے کے بیچوں بیچ لال اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ پھن پھیلائے کھڑا تھا اور خوفناک انداز میں یوں جھوم رہا تھا جیسے آج اس نے کسی کو نہ بخشنے کی ٹھان لی ہو۔

"لال" بھیا نے اسے پکارا۔ اس نے مڑ کر بھیا کی طرف دیکھا اور رینگتا ہوا صحن میں رکھے ہوئے گھڑوں کے پاس چلا گیا ہم چوکیدار سے صورتحال معلوم کرنے کے لئے ڈیوڑھی سے آگے آ گئے اور وہاں ایک عجیب ہولناک منظر دیکھا۔ بیرونی راہداری میں دو آدمیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے منہ پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ اور یہ لال کے غیظ و غضب کا شکار ہوئے تھے۔ ان کے ایک ساتھی کو چوکیدار نے باندھ رکھا تھا۔ یہ علاقے کا مشہور ترین ڈاکو اور اس کے ساتھی تھے، جو ٹھاکر بلرام سنگھ کے ایما پر یہاں آئے تھے۔ وہ نہ جانے کیا چاہتے تھے مگر لال نے ان کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ اس منظر کو دیکھ کر میری تو گھگی بندھ گئی۔ ٹھاکر صاحب گویا اب اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے تھے اس دن ہمیں لال پر بڑا پیار آیا ــــ اب ہمیں یقین ہو گیا کہ لال کوئی سانپ نہیں کوئی اور ہی چیز ہے اور آخر ایک دن ہمیں اسکا ثبوت مل گیا۔ قریبی علاقے کے جاگیردار جو اپنے علاقے میں راجا کے لقب سے

مشہور تھے، دادا ابا کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ اس مرتبہ موسم بہار میں دادا ابا کو ان کا پیغام ملا۔ انھوں نے ہم سب کو اپنے ان باغات کی سیر کے لئے بلوایا تھا جو انھوں نے حال ہی میں لگوائے تھے اور جن کی دُور دُور تک دھوم تھی۔ ہم بھی بہت دنوں سے انھیں دیکھنے کے مشتاق تھے۔ جب جانے کا ارادہ کیا تو لال ہمارے پیروں کی زنجیر بن گیا۔

"دادا ابا، لال کیسے جائے گا" ہم سب اداس تھے۔

"نہیں بیٹا، وہ نہیں جا سکے گا" دادا ابا نے دھیمی آواز میں کہا۔ غرضیکہ جانے کی تیاریاں مکمل ہوگئیں اور ہم راجا صاحب کے علاقے کی طرف روانہ ہوگئے۔ واقعی خوبصورت علاقہ تھا وہ۔ بہت دلکش مناظر تھے وہاں۔ ہم نے خوب سیر کی، دھما چوکڑی مچائی ___ راجا صاحب نے ایک خوبصورت کاٹیج باغات سے ملحق ہی بنوایا تھا۔

دوسرے دن علی الصباح بیدار ہوتے ہی میرا جی پھر باغ کی سیر کو چاہا۔ میں تنہا ہی باغات کی طرف چل پڑی۔ صبح کے دھندلکے میں درخت بہت حسین منظر پیش کر رہے تھے۔ میں پرندوں کی چہچہاہٹ اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو میں محو آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ خودرو پھولوں کے قریب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی ہو، کوئی بُری طرح میرے پیروں کو جکڑ رہا تھا ___ میں گھبرا کر پیچھے ہٹی اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "لال ___ ارے تم کہاں" لیکن وہ تو مجھے مزید پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہا تھا ___ چند قدم پیچھے ہٹنے پر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور فاتحانہ انداز سے جھومتا ہوا آگے بڑھا اور اس جگہ جا کر رک گیا جہاں چند لمحے پیشتر میں موجود تھی۔ وہ ایک کنوئیں کے دہانے پر کھڑا تھا جو غالباً باغ کی سینچائی کے لئے کھودا گیا تھا اور اسے خودرو جھاڑیوں نے میری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا ___ لال نے مجھے موت کے منہ سے بچا لیا ___ میری آنکھیں جذبۂ تشکر سے بھر آئیں "لال" میں نے اسے دل کی تمام گہرائیوں سے آواز دی لیکن اس کا دُور دُور کوئی پتا نہ تھا۔

دو سال اور گزر گئے ___ اس عرصے میں اَن گنت واقعات ہوئے بار ہا اس نے پیش آنے والے حادثات سے ہمیں بچایا۔ وہ ہمارے ساتھ رہتا، کھیلتا، کودتا اور ہماری گردنوں میں جھولتا رہتا۔ اس سے مجھے ایک خاص قسم کا التفات تھا۔ جہاں یہ سب کچھ تھا وہاں ہم بعض اوقات اپنے احساس تنہائی سے بھلا بھی جاتے۔ لال ہمارے لئے مصیبت بن گیا تھا۔ یہی تو سب کچھ نہیں! ہم سوچتے، ہماری سماجی زندگی ختم ہوگئی تھی، ہماری سہیلیاں آتے ہوئے کتراتیں۔ رشتے دار بہانے تراشتے ___ لال کی موجودگی ہمیں بہت سے لوگوں سے دُور کئے ہوئے تھی۔ اب ہم شعور کی منزلوں میں تھے۔ بھیا نے خوب رنگ و روپ نکالا تھا۔ دادا ابا کو اب ان کی شادی کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ وہ اکثر کہتے "ہم ٹھہرے چراغِ سحری، کون جانے کب گُل ہو جائے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارا بیٹا نوشہ بنے تو ہمیں سکون ملے گا" اور بھیا اسی شدت سے ان کی بات مسترد کر دیتے "دادا ابا ابھی جلدی کیا ہے۔"

لیکن ہم دادا ابا کی ہاں میں ہاں ملاتے اور کہتے کہ "ہاں دادا ابا آپ کا خیال درست ہے۔ اب اس گھر میں ایک چاند سی دلہن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ برسوں ہوگئے کوئی خوشی ہی نہیں ہوئی اس یکسانی سے جی اُکتانے لگا ہے" غرضیکہ بھابی کی تلاش زور و شور سے شروع کر دی گئی۔ مگر یہاں بھی لال ہماری خوشیوں کی راہ میں دیوار بن گیا۔ جس جگہ بھی بھیا کا پیغام بھیجا جاتا جواب نفی میں ملتا۔ کوئی بھی گھرانا ایک خطرناک سانپ کی موجودگی میں اپنی لڑکی دینے پر آمادہ نہ تھا، یہ صورتحال بڑی تکلیف دہ تھی۔ نہ تو ہم میاں صاحب کے تحفے، سانپ کو علیحدہ کر سکتے تھے اور نہ بھیا کی شادی ملتوی کرنے کو جی چاہتا تھا۔ گھنٹوں ہم بیٹھے سوچا کرتے "دادا ابا اب کیا کیجئے گا" ہماری سوالیہ نظریں دادا ابا کے مضمحل چہرے پر اپنے سوال کا جواب تلاش کرتیں، لیکن ان کے بالوں پر بچی برف اور ان کے چہرے کا تدبر ہمیشہ ہمیں تقویت پہنچاتا۔ تنگ آ کر ہم کبھی یہ مطالبہ کرنے لگتے "دادا ابا آپ لال سے کہہ دیجئے۔ کہیں چلا جائے" بھیا کی خوشیاں

ہمیں لال سے زیادہ عزیز تھیں۔

دادا ابا ہمارے اس مطالبے پر ہمیں ڈانٹتے "خبردار ایسی بات پھر نہ کہنا، یہ درویش کا تحفہ ہے" ان کے لہجے میں درشتی ہوتی۔

بالآخر بہت سوچ سمجھ کر دادا ابا کے ایک دور دراز کے ملاقاتی کے ہاں پیغام بھیج دیا گیا، جو حسب توقع فوراً ہی منظور ہو گیا۔ لال کا وجود راز میں رکھا گیا۔ ہماری مسرتیں لوٹ آئیں۔ ہم رات گئے تک پروگرام بناتے کہ شادی کا جشن کس اہتمام سے منایا جائے۔

اُن دیکھی دلہن کی مختلف شکلیں بنا بنا کر بھیا کو چھیڑتے۔ ہم نے بھیا کے چہرے پر کئی بار سہرا سجایا۔ گیت گائے اور شادی کی رسموں کو شادی ہونے سے پہلے انجام دیا۔ ہمارے اس تماشے میں لال برابر کا شریک ہوتا۔ وہ جھومتا، بَل کھاتا اور پھن لہرا کر اپنی مسرتوں کا اظہار کرتا۔ ایسے موقعوں پر اس کی زبان باہر نکل آتی اور وہ مستی میں آکر میرے گلے میں جھول جاتا۔ اپنے جسم پر مجھے اس کی سرسراہٹ سے گدگدی ہونے لگتی اور میں بے تحاشا ہنسنے لگتی "لال خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو" اور وہ اپنی آنکھوں کو نچاتا ہوا کسی اور کو اپنی شرارتوں کا ہدف بناتا کبھی وہ مسرت سے سرشار بھائی جان کے قدموں سے لپٹ جاتا، کبھی شبنم کی گود میں آ بیٹھتا۔ "لال" میں اس کے سرسراتے وجود سے مخاطب ہوتی "تم بھابی کے سامنے مت آنا، وہ ڈر جائینگی" وہ اس بات پر ہماری گود سے نکل کر کسی گوشے میں چھپ جاتا۔ جیسے یہی میری بات کا جواب ہو۔

بھیا کی شادی ہوئی اور بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ بڑی رونقیں رہیں۔ بھابی کیا آئیں مسرتیں سمٹ آئیں، عجیب چہل پہل رہتی۔ ہمارا زیادہ وقت بھابی کے کمرے میں گزرتا، ہم انھیں ہر طرح سجاتے، سنوارتے اور پھر دل ہی دل میں بھابی پر رشک کرنے لگتے۔

شادی کو دو تین دن ہی گزرے تھے لیکن اتنے مختصر سے عرصے میں ہم نے بھابی کو خاصا بے تکلف کر لیا تھا۔ اب ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ عرصے سے ہمارے ساتھ رہ رہی ہوں۔ خوشی کی ان ساعتوں میں ہم لال کو بھی فراموش کر بیٹھے تھے، وہ تو جیسے کہیں گم ہو گیا تھا۔ تپتی دوپہریا میں وہ گھر کے کسی کونے کھُدرے میں چھپا رہتا۔ دن میں وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ اس نے روپوشی ہی اختیار کر لی تھی ہم بھابی سے خوش گپیوں میں ایسے غرق رہتے کہ لال کا خیال تک نہ آتا مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے لال ہمارے درمیان موجود ہو، جیسے وہ ہمیں مسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہو۔ جیسے وہ ہم سب میں گھُل مِل جانا چاہتا ہو۔ مجھے اس پر بے حد ترس آتا۔ میں اسے تلاش کرتی اور اسے بڑے پیار سے بلاتی۔ لال ملتجی نظروں سے مجھے دیکھتا۔ ان نظروں میں میری بے مہری کی شکایت ہوتی۔ میں اسے بڑھ کر ہاتھ میں اُٹھا لیتی اس کے جسم کو بوسہ دیتی۔ لیکن وہ ایک چھلاوے کی طرح میرے ہاتھ سے نکل کر کسی پناہ گاہ کی تلاش میں چل دیتا۔

اور وہ ایک گرم رات تھی، اس رات کو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ ہم دیر تک کمرۂ عروس میں بیٹھے بھابی سے گفتگو کرتے رہے پھر بھابی کی آنکھوں میں غنودگی دیکھ کر سبھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب ہم واپس آئے تو میں نے لال کو کھڑونچی کی طرف رینگتے دیکھا۔ وہ رات گزارنے اپنی پسندیدہ جگہ جا رہا تھا۔ "بے چارہ" میں نے رحم طلب نظروں سے اسے دیکھا "بالکل قیدیوں کی سی زندگی گزار رہا ہے، کچھ دن اور گزریں تو بھابی سے اس کا تعارف کرا دیا جائے گا۔ ہم اس کے متعلق سب کچھ بتا دیں گے" میں نے شبنم سے کہا۔ میں اس کی وکالت کے لئے دلیلیں سوچنے لگی۔ کمرے میں آکر ہم دونوں بہنیں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے ایک کتاب اٹھا لی۔ گرمی اور حبس سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ اچانک ایک بھیانک چیخ نے مجھے چونکا دیا۔ ساتھ ہی کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز نے ہماری وحشت اور بڑھا دی میں اور شبنم بغیر کچھ سوچے سمجھے صحن کی طرف بھاگے۔ آنگن میں بھابی دہشت زدہ کھڑی تھیں، جیسے انھوں نے نہ بولنے کی قسم کھالی ہو۔ ان کے اردگرد دادا ابا سمیت گھر کے تمام افراد بھابی سے چیخنے کا

سبب معلوم کر رہے تھے۔ بھابی نے سہمی ہوئی نگاہوں سے زمین کی طرف دیکھا، وہ گھگھیائی آواز میں بولیں "سا۔ سانپ یہاں سانپ تھا۔"

"مگر وہ کہاں گیا؟" ہم سب مطمئن ہوکر مسکرائے۔

"میں — میں نے" بھابی رک رک کر بول رہی تھیں "اسے مار دیا ہے۔ اس لوٹے سے اس کا سر کچل دیا ہے۔"

وحشت سے ہماری چیخیں نکل گئیں۔ شبنم بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

"بھابی — آہ یہ آپ نے کیا کیا۔ آپ نے ہمارے لال کو مار دیا، وہ سانپ نہیں تھا، وہ تو ہمارے گھر کا ایک فرد تھا۔ لیکن وہ گیا کہاں؟" میرا حال اس صدمے سے بہت برا تھا۔ میں ہذیان بک رہی تھی۔ ہماری آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کیا — کیا وہ سانپ؟" بھابی نے بے ہوش ہوتے ہوئے کہا اور قبل اس کے کہ وہ گریں۔ بھیا نے بڑھ کر انھیں سنبھال لیا وہ بے ہوش ہوچکی تھیں۔ گھر کے ہر کونے میں لال کو تلاش کیا گیا مگر وہ کہیں نہ ملا۔ وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ یہ اسرار ہماری سمجھ سے بالاتر تھے، لال کی طرف سے مایوس ہوکر ہم بھابی کے کمرے میں گئے انھیں کچھ کچھ ہوش آچلا تھا۔

"کچھ نہیں بھابی — یہ آپ کا وہم تھا، ہم نے ہر طرف دیکھ لیا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا" میں نے بھابی کو دلاسا دینے کے لئے کہا۔

لیکن بھابی بہت خوفزدہ تھیں۔ ہم سب دیر تک انھیں بہلاتے رہے۔ ان کے سونے پر سبھی اپنے اپنے کمروں میں جاکر سوگئے۔ صبح دن چڑھے میری آنکھ کھلی تو رات کا واقعہ ایک خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ لال اب اس گھر میں نہ تھا مگر اس کی مانوس سرسراہٹ ہر طرف سنائی دیتی تھی۔ مجھے معلوم تھا یہ سب میرا وہم ہے — لال نہ جانے اب کہاں ہوگا۔ میں بہت اداس تھی۔ لال کی گمشدگی ہمارے لئے کوئی معمولی واقعہ نہ تھی، بہت بڑا سانحہ تھی۔ میں نے پھر لال کو تلاش کیا اور تھک ہار کر مایوس سی بھابی کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ بھابی ابھی تک سو رہی تھیں۔ میں نے بڑے پیار سے آواز دی "بھابی"۔ ان کے منہ سے میں نے چادر ہٹانا چاہی لیکن میرا ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا "دادا ابا" میں چیختی ہوئی دادا ابا کے کمرے میں گئی۔

بھابی کا سارا جسم اکڑا ہوا تھا، رنگت نیلی ہو رہی تھی اور وہ مرچکی تھیں۔ سارے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ ڈاکٹر بلائے گئے جنھوں نے بتایا کہ دہشت سے ان کا ہارٹ فیل ہوگیا ہے۔ دادا ابا کے اثر و رسوخ کی وجہ سے پوسٹ مارٹم کی نوبت نہیں آئی۔ یہ بھیا کی شادی کا پندرہواں دن تھا۔ ہم جس بھابی کو بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لائے تھے وہ اندھیروں میں گم ہوگئی۔

بھابی کیا رخصت ہوئیں اس گھر سے خوشیاں رخصت ہوگئیں۔ اس کے بعد ہمیں کبھی سکون نہیں ملا۔ پھر غموں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ دادا ابا نے پہاڑوں پر میاں صاحب کو بہت تلاش کیا مگر وہ کہیں نہ ملے — ہم سب سہم سے گئے تھے۔ اب حویلی میں شوخیاں تھیں نہ سرگرمیاں۔ حویلی ماتم کدے میں تبدیل ہوگئی تھی۔ عرصے تک ہم اپنے غموں کو سینے سے لگائے رہے۔ بھیا کی حالت ہم سب سے خراب تھی — انھیں صدمے نے پاگل سا بنا دیا تھا وہ خاموش اپنے کمرے میں بند رہتے۔ کئی کئی وقت کھانا نہیں کھاتے تھے۔ دادا ابا انھیں کمرے سے پکڑ کر باہر لاتے اور اپنے ہاتھ سے کھلاتے۔ بھیا کی یہ حالت ہم سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ اور ہم نے ایکبار پھر کوشش کی کہ بھیا کی شادی کہیں ہوجائے۔ بڑی مشکل سے ایک غریب شخص ہماری مسلسل درخواست پر آمادہ ہوا۔ اس بار شادی میں وہ دھوم تو نہ تھی جو پہلے تھی مگر پھر بھی شادی کا ہنگامہ تھا۔ ہمیں ایسا معلوم ہوا جیسے اب مصائب کا زمانہ ختم ہوا۔ شادی ہوئی اور نئی بھابی گھر آگئیں۔

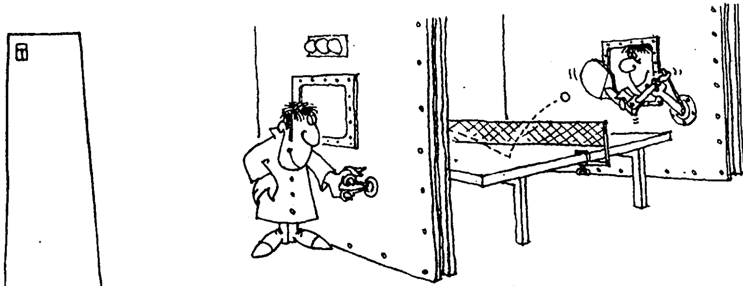
اور پندرہ دن گزر گئے۔ صرف پندرہ دن، اس کے بعد نئی

بھابی کے ساتھ بھی وہی ہوا۔ وہ بھی شادی کی پندرھویں صبح اپنے
کمرے میں مردہ پائی گئیں۔ اب ہم پر کیا کیا الم نہ گزرے ہوں گے؟
کون ہمارے غموں کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اور کیا آپ یقین کریں گے
کہ ایک بار پھر ہم نے بھیا کی شادی کا جوا کھیلا۔ ہم نے اس حویلی کو خیرباد
کہا جہاں ہم نے اپنی زندگی کے حسین ترین دن گزارے تھے۔ ایک
دوسرے شہر میں ہم مایوس بھائی بہنوں نے اپنی زندگی نئے سرے
سے گزارنا چاہی۔ بھیا کی شادی کی ایک بار اور کوشش کی گئی۔
مگر وہی ہوا جو ہمارے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔ تیسری بھابی بھی
پندرھویں دن انتقال کر گئیں۔

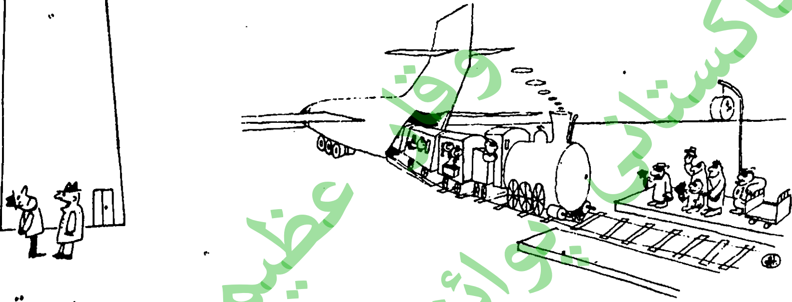
مجھ سے مزید نہیں لکھا جاتا۔ اب کبھی بھیا سے شادی کا
ذکر کرو تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ ان کو چپ لگ گئی ہے۔ اب
بھیا سے کوئی شادی کا ذکر کرے تو کس طرح کرے۔ رہے چھوٹے
بھیا تو وہ بھیا کے انجام کو دیکھ کر کبھی شادی نہ کرنے کا عہد کر چکے
ہیں۔ ہماری زندگی میں دور دور تک روشنی کا نشان نہیں۔ دنیا
میں ہم وہ چار بھائی بہن ہیں جو سب سے زیادہ غمزدہ ہیں۔ ہمیں
اپنے مستقبل میں کوئی کرن خوشی کی نظر نہیں آتی۔ ہم زندگی گزار رہے
ہیں کہ ہم زندہ ہیں۔ ہمارے کان شہنائی کی آواز سے محروم رہیں گے
کون اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر ہمارے موت کے گھر اپنی ڈولیاں
لائے گا۔ اور ہم خود دوسروں کی زندگیاں داؤں پر لگانے پر آمادہ
نہیں۔ زندگی گزر رہی ہے گزر جائے گی۔

دادا ابا کا انتقال عرصہ ہوا ہو چکا ہے۔ رہے ہم تو اب
ہمارے ہاں کیا رہ گیا ہے۔ ہمیں مصائب چاٹ گئے۔ ہمارے
سروں پر برف جمنے لگی ہے اور چہرے پر جال بُنے ہوئے ہیں۔ ہم
وقت سے پہلے مر رہے ہیں۔ بس ایک یہی بات ہمارے لئے مسرت
کی ہے۔ اب تو یہ جاننے کی تڑپ بھی نہیں رہی کہ آخر ہم نے کونسا
ایسا گناہ کیا تھا۔ اگر یہ لال کا انتقام ہے تو کیسا انتقام ہے۔ کسی
نے ہمیں نہیں بتلایا اور کوئی ہمیں نہیں بتلا سکتا۔ یہ بات ہم اچھی طرح
جانتے ہیں۔

نئے عہد کے نئے کارٹون

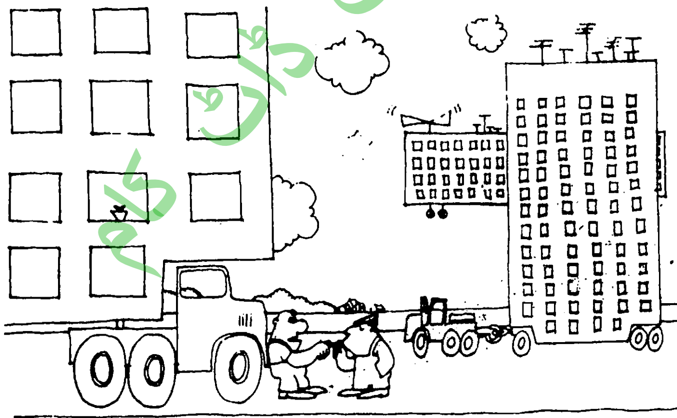


نئے زمانے کا کھیل



جدید طرزِ تعمیر

ہوابازی پرانی روایات کی خدمت میں



حرکت میں برکت ہے

شاہد علی کا ایک چھوٹا سا خاندان تھا، ماں باپ اور ایک معصوم بہن۔ مکان ان کا اپنا تھا۔ وہ بڑی عسرت مگر عزت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہد علی نے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے دو ایک ٹیوشنیں کر رکھی تھیں۔ وہ خود ایف اے کے دوسرے سال میں پڑھتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے ایک مالدار بیرسٹر راشد حسین نے دو سو روپیہ ماہوار پر اپنی نوجوان لڑکی کو پڑھانے کے لئے ملازم رکھ لیا۔ رشیدہ بڑی آزاد خیال اور ماڈرن لڑکی تھی۔ اس نے پڑھا پڑھایا تو خاک نہیں البتہ شاہد علی سے اظہار اُلفت شروع کر دیا، اس نے شاہد علی سے بہت آگے کی باتیں کیں اور شادی کے لئے اصرار کیا۔ اصل میں وہ اپنا ایک سنگین اور حیا سوز جُرم شاہد علی سے شادی کر کے چھپانا چاہتی تھی۔ مگر شاہد علی نے اسے سختی سے مسترد کر دیا اور نتیجۃً اس کی ملازمت جاتی رہی۔ رشیدہ نے اپنی اس توہین کا بڑا ہولناک



دوسری قسط

گزشتہ قسط کے مکمل خلاصے کے ساتھ

غلام روحیں

شاہد علی درّانی — تحریر: اکبر حسین آفندی


سب رنگ ڈائجسٹ کا ایک نیا
پُراسرار سلسلہ

انتقام لیا۔ اس نے اپنے زیورات شاہد علی کے گھر رکھوا کر اُسے سات سال کی قید کرادی۔ شاہد علی اور اس کے غریب والدین کی ایک نہ سُنی گئی، اس کی ماں اس صدمۂ جانکاہ کی تاب نہ لاسکی، مرگئی۔ اس کی نوجوان بہن پر مجرمانہ حملے کئے گئے اور اس نے خودکشی کرلی۔ باپ بھی چل بسا۔ سات سال بعد جب وہ رہا ہوا تو اس کے دوست اکبر کے سوا کوئی اسے خوش آمدید کہنے والا نہ تھا، کوئی گھر نہ تھا۔ وہ اکبر کے ہاں رہا اور اب اسے کہیں ملازمت نہ مل سکی، یہ دنیا اس کے لئے تنگ ہوگئی۔ رشیدہ اس عرصے میں شادی کرکے لندن چلی گئی تھی اور رشیدہ کے باپ کے تموّل اور تکبّر میں کوئی فرق نہ آیا۔ شاہد علی کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مگر وہ ایک بے بس شخص تھا پھر اسکے دوست اکبر حسین نے اسے مشورہ دیا کہ وہ میاں صاحب کے پاس جائے۔ سُنا ہے جن کے پاس روحیں آتی ہیں۔ ان کی دعا میں بڑی تاثیر ہے۔ اکبر حسین نے میاں صاحب کا تذکرہ کچھ اس عقیدت سے کیا کہ شاہد رات کو اسے اطلاع دیئے بغیر اس پہاڑی کی جانب چل پڑا جہاں میاں صاحب مقیم تھے۔ حالانکہ اکبر نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ چراغ جلنے کے بعد پہاڑی کا رُخ نہ کرنا ——— اب آپ آگے پڑھیئے۔

کالا رُوحیا

رات نصف گزر چکی تھی لیکن میرا تجسس میرے حوصلے بلند کئے ہوئے تھا۔ ہر طرف تاریکی کا دَور دورہ تھا۔ گلیوں میں میونسپلٹی کی جانب سے لگے ہوئے لیمپ پوسٹ کی روشنیاں بھی مدھم مدھم نظر آرہی تھیں۔ میں نے دل میں خدا کا نام لیا اور اپنی منزل کی سمت ہو لیا۔

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ تعویذ گنڈوں اور پیری مُریدی سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی لیکن میرے دوست اور غم گسار اکبر حسین نے شیخ شوکت علی کا ذکر اس عقیدت سے کیا تھا کہ میں اپنے تجسس کو دبا نہ سکا اور یہی وجہ تھی کہ اس وقت یہی جذبہ مجھے کشاں کشاں اس پہاڑی کی طرف کھینچے لئے جارہا تھا جہاں اکبر کے بیان کے مطابق میاں صاحب گزشتہ آٹھ سال سے ایک نیم پختہ کوٹھری میں مقیم تھے اور ان روحوں کے ذریعے جو ان کے قبضے میں تھیں۔ مظلوم لوگوں کے لئے انہوں نے ناقابلِ یقین کارنامے انجام دیئے اور دے رہے تھے۔

اکبر حسین کی قیام گاہ سے اس پہاڑ کا فاصلہ چار میل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ میں نے یہ فاصلہ بمشکل طے کیا۔ راستے میں ایک دو بار میں نے سوچا بھی کہ میں کیوں خواہ مخواہ وقت برباد کررہا ہوں ان باتوں سے کیا حاصل۔ لیکن جب میں آبادی کے آخری سرے پر پہنچا اور تاریکی میں لپٹی ہوئی پہاڑی کو اپنے قدموں میں پایا تو میری ساری تکان دُور ہوگئی۔ میں نے یوں ہی ایک نظر متوسط طبقے کے افراد کے کچے پکے مکانوں پر ڈالی پھر جھجکتا اور خوف کھاتا پہاڑی کے قریب گیا اور اوپر کی سمت بڑھنے لگا۔ کوئی بیس منٹ تک میں برابر آگے بڑھتا رہا پھر روشنی کی ان کرنوں کو دیکھ کر مجھ پر خوف کا غلبہ ہوا۔ وہ روشنی تقریباً سو گز دُور نظر آنے والی ایک کوٹھری سے پھوٹ رہی تھی۔ اس ویرانے میں یہ کرنیں بڑی پُراسرار لگ رہی تھیں۔

اپنی نظروں کے سامنے اپنی منزل دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا تھا میں رُک گیا اور چند لمحوں تک ان کرنوں کو دیکھتا رہا پھر دوبارہ آگے بڑھنے لگا۔ پہاڑی راستہ ناہموار تھا اور بار بار میرا پاؤں چھوٹے موٹے پتھروں پر پڑ کر رپٹ رہا تھا اس لئے میں نے اپنی رفتار کم کردی۔ پھر بھی جوں جوں میری منزل قریب آتی گئی۔ مجھے اپنے دل پر ایک بوجھ اور سر میں درد سا محسوس ہونے لگا۔ ابھی تک میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا مگر مجھے اکبر حسین کی بات یاد تھی کہ چراغ جلے بعد اس پہاڑی کا رُخ کرنے والے پُراسرار حالات سے دوچار ہوجاتے ہیں اور جب تک میاں صاحب ان کے حق میں دُعا نہ کریں وہ کرب،

اور بے چینی کی حالت سے دوچار رہتے ہیں۔

نیم پختہ کوٹھری کا دُھندلا پن اب ختم ہو چکا تھا۔ میں اس کوٹھری سے بمشکل چالیس گز کے فاصلے پر ہوں گا کہ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے ——

میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی تو دُور دُور تک کسی آدم زاد کا پتا نہیں تھا۔ میں نے اپنے احساس کو اپنے اعصاب کی کمزوری پر محمول کیا پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگا۔ ابھی میں کچھ دُور ہی آگے گیا ہوں گا کہ ایک بار پھر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے تعاقب میں سرسرا رہا ہے۔ اس بار میں نے رُکنے کے بجائے مضطرب نظروں سے دائیں بائیں گھوم کر دیکھا اور کسی کو موجود نہ پا کر پھر اپنی نظریں روشنی کی ان کرنوں پر جما دیں جو میرے خیال کے مطابق میاں صاحب کی کوٹھری میں جلنے والی کسی بڑی لالٹین یا بہت سے لیمپوں سے پھوٹ رہی تھیں۔ دو بار چونکنے کے بعد میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد میاں صاحب کی کوٹھری تک پہنچ جاؤں اور دیکھوں کہ رُوحوں کے بارے میں جو واقعات ان سے منسوب ہیں وہ کہاں تک صداقت پر مبنی ہیں۔

اکبر حسین کے بجائے اگر میاں صاحب کے بارے میں یہ معلومات مجھے کسی اور ذریعے سے معلوم ہوتیں تو شاید میں ان کی صحت پر کبھی بھی یقین نہ کرتا ——

میں اپنے خیالات میں محو آگے بڑھ رہا تھا لیکن پھر اچانک میرے قدم تھم گئے اور میں دھوئیں کے اس سفید بادل کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا جو میرے اور میاں صاحب کی کوٹھری کے درمیان بڑی سرعت سے اُبھر کر ایک نقطے میں پھیلنے لگا تھا۔ پہلی نظر میں، میں اسے دھواں ہی سمجھا تھا اور حقیقت بھی غالباً یہی تھی لیکن دوسرے لمحے جب میں نے اس پر غور کیا تو یہ دیکھ کر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ سفید بادل یا دھوئیں کے

اس ٹکڑے نے سمٹ سمٹا کر انسانی ہیولے کی شکل اختیار کر لی تھی اور اب وہ ہیولا آہستہ آہستہ ہوا میں تیرتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے حلق سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ میں نے راہ فرار اختیار کرنی چاہی لیکن قبل اس کے کہ میں اپنے ارادے کی تکمیل کرتا' سفید انسانی ہیولا تیزی سے میرے قریب آیا۔

"چلے جاؤ —— بزرگوں کے کام میں مخل ہونا اچھا نہیں۔"

ایک مدھم سی سرگوشی میرے کانوں سے ٹکرائی پھر وہ ہیولا ہوا کے تیز جھونکے کی طرح میرے جسم سے ٹکراتا ہوا نکل گیا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر دیکھا لیکن اطراف میں کہیں کچھ بھی نہیں تھا ہر طرف گہرا اندھیرا طاری تھا۔ میں نے گھوم کر میاں صاحب کی کوٹھری کی سمت نظر ڈالی۔ دراڑوں سے پھوٹتی ہوئی کرنیں صاف طور پر نظر آ رہی تھیں۔ میں سکتے کے کسی مریض کی طرح اپنی جگہ کھڑا حالات پر غور کرتا رہا پھر یہ سوچ کر کہ یقیناً میرے ذہن میں بیٹھے ہوئے کسی لاشعوری واہمے نے شعوری طور پر نمودار ہو کر مجھے ڈرانے کی کوشش کی ہے۔ میں حوصلہ کر کے پھر آگے بڑھنے لگا۔ مجھے خود پر ہنسی بھی آ رہی تھی کہ ایک طویل عرصہ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے گزارنے اور اذیت ناک حالات سے گزرنے کے باوجود میں اپنے ہی منتشر خیالوں کی ایک دُھندلی پیداوار سے خوفزدہ ہو گیا۔

میں نے اپنی رفتار اب بڑھا دی تھی۔ میاں صاحب کی کوٹھری کا فاصلہ ہر لمحہ گھٹتا جا رہا تھا —— تیس گز ..... بیس گز ..... دس گز ..... اور پھر اچانک مجھے ایک بار پھر ایسا ہوا جیسے کوئی میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ میں نے احتیاطاً اس احساس کی تصدیق کرنے کے لئے بائیں سمت نظر ڈالی۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا لیکن داہنی جانب نظر گھماتے ہی میں اُچھل پڑا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر چیخنا چاہا لیکن آواز میرے حلق میں گھُٹ کر رہ گئی۔ اس بار مجھے جو کچھ نظر آیا وہ صد فی صد حقیقت تھی۔

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس نورانی چہرے والے شخص کو دیکھ رہا تھا جو مجھ سے محض ایک گز کے فاصلے پر کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر سے پاؤں تک سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بھی مجھے روئی کے گالوں کی طرح سفید نظر آ رہے تھے۔ اس نے بڑی جمی ہوئی اور ٹھوس آواز میں مجھے مخاطب کر کے کہا:

"شاہد میاں ـــــ اتنی رات گئے اس پہاڑی پر کس مقصد سے آئے ہو؟"

"میں ـــــ میں میاں صاحب سے ملاقات کا متمنی ہوں۔" میں سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

"ملاقات کرنا چاہتے ہو یا کچھ حقیقتوں کو جاننے کے لئے آئے ہو؟"

"جی ـــــ" میں چونک پڑا۔ میرا دل بہت شدت سے دھڑکنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ گمان ہوا کہ کہیں یہ خود میاں صاحب ہی تو نہیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے مجھے کوٹھڑی تک پہنچنے سے روکنے کے لئے یہ روپ اختیار کر لیا ہو۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ سفید ریش بزرگ نے بڑی نرم آواز میں کہا:

"وہ لوگ جنھوں نے نیکی کمائی ہے۔ انھیں شبے کی نظروں سے دیکھنا بُری بات ہے میاں صاحبزادے ـــــ جو تم سوچ رہے ہو وہ درست نہیں۔ میں تو میاں صاحب کے قدموں کی خاک بھی نہیں ہوں۔"

"پھر ـــــ پھر آپ کون ہیں؟" میں نے غیر اختیاری طور پر سوال کر ڈالا۔

"میں ان کا غلام ہوں۔" سفید لباس میں ملبوس بزرگ نے کہا، پھر بولے: "تم نے اس وقت یہاں آ کر نادانی کی ہے۔ تم نے بزرگوں کے جلال کو نہیں دیکھا۔ انہوں نے بڑے بڑے سورماؤں اور بادشاہوں کے تخت اُلٹ دیئے ہیں۔ تم میاں صاحب کی عظمت دیکھنے آئے ہو۔ شاہد علی تمہارے پاس وہ آنکھیں نہیں کہ تم اسے دیکھ سکو۔ اور وہ ذہن نہیں کہ تم اسے محسوس کر سکو ـــــ چلے جاؤ ـــــ جاؤ ـــــ"

"بزرگ محترم۔ میں میاں صاحب کا دیدار کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔ کوئی بُری نیت لیکر نہیں۔" میں نے اپنے اوسان بحال کرتے ہوئے کہا۔

"مگر عزیز من۔ یہ وقت مناسب نہیں ـــــ" سفید پوش بزرگ نے نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔ اور پھر کچھ سوچ کر بولے ـــــ "اچھا ٹھیک ہے ـــــ جاؤ ـــــ اور میاں صاحب کے بارے میں اپنے مبہم خیالات کی تصدیق کر لو لیکن میری ایک نصیحت یاد رکھنا ـــــ جو کچھ تمھیں نظر آئے اس کا تذکرہ کبھی کسی اور کے سامنے نہ کرنا۔ ورنہ تباہیاں پھر تمھارے عقب میں ہوں گی۔ جاؤ اور دیکھ سکتے ہو تو دیکھو۔"

میں حیرت سے اپنے مخاطب کو تکتا رہا پھر میں نے دبی آواز میں پوچھا:

"اگر رات کے وقت اس پہاڑی پر آنا مناسب نہیں تو آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"شاہد علی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے ـــــ" سفید ریش بزرگ نے زیر لب مسکرا کر کہا پھر سنجیدہ ہو کر بولے "میں کون ہوں اور کیا ہوں یہ جاننے کی کوشش مت کرو ـــــ تم اس کے متحمل نہیں ہو پاؤ گے۔ تم ابھی بچے ہو ـــــ بہت بچے ہو۔ بس جو میں نے نصیحت کی ہے اس کا خیال رکھو۔"

اتنا کہہ کر نووارد بزرگ نے ایک نظر میاں صاحب کی کوٹھڑی پر ڈالی پھر عقیدت کے جذبے سے سر کو ذرا سا خم کیا اس کے بعد دوسری سمت چل دیئے۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے ان کو دیکھتا رہا اور اس وقت تک اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی جب تک وہ میری

نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئے۔ مجھ پر اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ میرا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی حالت کو سنبھالا کہ جب مجھے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی اور جب دُنیا تیرے لئے تنگ ہے تو پھر موت سے خوف زدہ ہونا چہ معنی دارد۔ چنانچہ میں نے اس پُراسرار ماحول سے خوف زدہ ہو کر واپس لوٹنے کا ارادہ ترک کر دیا اور دل مضبوط کر کے آگے بڑھا۔ میری حالت اس وقت کسی ایسے شخص کی سی تھی جس پر جادو کر دیا گیا ہو۔ جیسے اپنا کوئی ہوش نہ ہو۔

میاں صاحب کی کوٹھری سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ کر میں ایک بار پھر رُکا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے قرب وجوار کا جائزہ لیا پھر جب مجھے یقین ہوگیا کہ کوئی میری نگرانی نہیں کر رہا ہے تو میں پنجوں کے بل کھسکنے لگا اور کوٹھری کی ایک جھری سے آنکھیں لگا دیں۔

اندر کا ماحول کچھ اس قدر ہیبت ناک اور ناقابلِ یقین تھا کہ میں دنگ رہ گیا۔ اندر صرف دو چراغ جل رہے تھے۔ میری نظروں کے سامنے میاں صاحب ٹھوڑی سینے سے لگائے مراقبے میں بیٹھے تھے اور تسبیح پر کوئی وظیفہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان کا چہرہ مجھے پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جسم پر نظر آنے والے کپڑوں پر جا بجا پیوند نظر آ رہے تھے۔ جس پلنگ پر وہ بیٹھے تھے اس پر بستر نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ سامنے چھت سے ایک پنجرہ لٹک رہا تھا جس میں دو طوطے بند تھے۔ زمین پر ایک میلی سی دری بچھی تھی جس پر غالباً ایک عرصے سے جھاڑو نہیں دی گئی تھی۔ میں نے ایک نظر میں پوری کوٹھری کا جائزہ لے ڈالا لیکن جو بات میرے لئے سب سے زیادہ تعجب خیز تھی وہ اس بے پناہ حسین وجمیل لڑکی کی موجودگی تھی جو میاں صاحب کے سامنے میلی دری پر ہاتھ باندھے باادب انداز میں سر جھکائے کھڑی تھی۔ لڑکی کا حسنِ جہاں سوز اور اس کے قیمتی ملبوسات کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ اتنی رات گئے ایک حسین وجمیل لڑکی کو میاں صاحب کی کوٹھری میں تنہا دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ "یہ کون ہو سکتی ہے۔؟" میں نے سوچا۔ "ممکن ہے کوئی ضرورت مند ہو جو رات کے اندھیرے میں حاجت روائی کی غرض سے میاں صاحب کے قدموں میں چلی آئی ہو۔" لیکن پھر میں نے خیال کیا کہ کہیں یہ کوئی اور معاملہ نہ ہو۔ پیروں فقیروں کے بارے میں مختلف اور متضاد خبریں اخباروں میں آئے دن شائع ہوتی ہی رہتی ہیں۔ کہیں ......

میں ابھی ادھیڑ بن میں تھا کہ پنجرے میں بند ایک طوطے نے اچانک کریہہ آواز میں زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ چیخنے کے ساتھ ساتھ وہ پنجرے میں ادھر ادھر اُچھل کود بھی رہا تھا اور دوسرے طوطے کو ٹھونگے دے رہا تھا جو ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ خوبصورت لڑکی جو میاں صاحب کے روبرو ہاتھ باندھے کھڑی تھی چونک پڑی۔ اس نے اپنی غزالی آنکھیں

نیم واکیں اور حیرت سے طوطے کو گھورنے لگی پھر اس نے
جن نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا اس سے
صاف ظاہر تھا کہ وہ وہاں کسی نو وارد کی موجودگی کو محسوس
کر رہی ہے۔ اس کی حسین آنکھوں میں پیدا ہونے والی اُلجھن
بے معنی خیز تھی لیکن میاں صاحب کی حالت میں کوئی فرق
نہیں آیا۔ وہ بدستور مراقبے میں بیٹھے رہے لیکن طوطے کی چیخ
کم نہ ہوئی تو انہوں نے اپنا اُلٹا ہاتھ فضا میں بلند کر دیا۔ میاں صاحب
کا ہاتھ اٹھانا تھا کہ طوطے نے چیخنا بند کر دیا۔ سامنے کھڑی مہ جبیں
نے بھی جلدی سے دوبارہ ہاتھ باندھ کر سر جھکا لیا۔ یکلخت میرے
ذہن میں ایک نیا خیال در آیا ۔۔۔ کہیں وہ مہ جبیں کوئی روح تو نہیں
جو میاں صاحب کے حکم پر حقیقت کے جامے میں اس وقت ان
کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ کیا ایسا ممکن ہے ۔۔۔۔ مگر
سب کچھ ممکن ہے۔

میں سانس روکے باہر کھڑا اُس حسین ترین لڑکی کو دیکھتا
رہا اور آنے والے لمحوں کا منتظر رہا کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے ۔۔
کوٹھڑی میں کچھ دیر تک مکمل سکوت طاری رہا میاں صاحب نے
آہستہ آہستہ سر اٹھا کر آنکھیں کھول دیں۔ میں ان آنکھوں کا
جلال دیکھ کر کانپ گیا۔ میاں صاحب کی آنکھوں میں نہ جانے کیا
سحر تھا کہ ان کی ایک جھلک دیکھتے ہی میں لڑکھڑا گیا۔ میاں صاحب
کی توجہ کا مرکز وہی لڑکی تھی جو ان کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔

اچانک میاں صاحب نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں اس حسین
دوشیزہ کو مخاطب کیا:

"اے خوبصورت اور نیک سیرت دوشیزہ ۔۔۔۔ کیا تجھے
علم ہے کہ تجھے یہاں کس لئے طلب کیا گیا ہے؟"

"جی! ۔۔۔۔ مجھے یہاں آنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے
کہ میں آپ کو مطلوبہ حقائق سے آگاہ کروں۔"

لڑکی کی آواز بیحد سُریلی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آواز
کہیں بہت دُور سے آ رہی ہو۔

میاں صاحب نے پُرجلال لہجے میں کہا۔ "چودھری
امام دین کے بارے میں کہو۔"

دوشیزہ نے اسی شیریں آواز میں نیازمندی سے جواب دیا۔

"چودھری امام دین کے بچنے کا اب یہی طریقہ ہے کہ وہ
آئندہ سُود پر رقم دینے کا کاروبار بند کر دے اور عدالت کے
سامنے اقبالِ جرم کر کے معافی کی درخواست گزارے۔"

"کیا اصل مجرم وہی ہے؟" میاں صاحب کی آواز اُبھری۔

"نہیں! ۔۔۔۔ اصل مجرم وہ نہیں ہے۔ اس نے صرف
مجرم کو روپوش ہو جانے کا موقع فراہم کر کے خود کو مقدمے میں
ملوث کر لیا ہے۔ پولیس کو جب یہ معلوم ہوا تو چودھری امام دین کو
بھی اس لئے ملزمین میں شمار کر لیا۔"

"اصل مجرم کون ہے اور کہاں ہے؟"

لڑکی نے یہ سوال سُن کر ایک جھرجھری لی پھر آنکھیں بند
کر لیں۔ چند سیکنڈ تک وہ خاموش رہی۔ پھر اس نے دوبارہ
آنکھیں کھول کر کہا۔

"جس نے گناہ کیا ہے اس کا نام شبیر خاں ہے۔ چودھری
امام دین نے اسے اپنے گودام میں پناہ دی ہے۔ شبیر خاں اس
وقت اسی گودام میں موجود ہے۔"

میاں صاحب یہ سُن کر تھر تھر کانپنے لگے۔ ان کا ہاتھ
تسبیح کے دانوں پر بڑی روانی سے چل رہا تھا۔ بار بار وہ اپنے سر
کو یوں جھٹک رہے تھے جیسے کسی کو سرزنش کر رہے ہوں۔ ان کی
آنکھوں سے جلال ٹپک رہا تھا اور چہرہ غصے سے سُرخ ہو رہا تھا۔
کافی دیر تک وہ اسی حالت سے دوچار رہے پھر رفتہ رفتہ
پُرسکون ہو گئے۔

"میرے لئے اب کیا حکم ہے؟"

"جا سکتی ہو ۔۔۔ جا سکتی ہو۔" میاں صاحب نے

بڑبڑاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

میں بدستور کوٹھری کی جھری سے لگا کھڑا یہ سب کچھ سُن اور دیکھ رہا تھا لیکن اس وقت میری آنکھیں حیرت سے اُبل آئیں جب میں نے اس خوبصورت لڑکی کو اچانک ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھا۔ یوں لگا جیسے کوئی بڑی طاقت اسے نگل گئی ہو ـــ "رُوح ـــ رُوح ـــ رُوح" میرے ذہن نے اس ایک لفظ کی تکرار شروع کی تو میں سرتا پا لرزنے لگا۔ مجھے اب اپنا وجود خطرے میں نظر آرہا تھا۔ میں نے میاں صاحب کی شخصیت پر شبہ کرکے یقیناً حماقت کی تھی۔ اکبر حسین نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف درست تھا۔

"تو کیوں چلا رہا تھا ـــ کیوں اپنی مکروہ آواز مجھے سُنا رہا تھا؟"

میاں صاحب کی کرخت آواز میری قوت سماعت سے ٹکرائی تو میں نے دوبارہ کوٹھری کی جھری سے آنکھ لگا دی۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ میاں صاحب نے وہ جملہ پنجرے میں بند طوطے سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ وہ بڑی حقارت اور نفرت بھری نظروں سے طوطے کو گھور رہے تھے۔ میں نے طوطے پر نظر ڈالی جو اپنا سر گردن میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"منہ چھپانے کی کوشش کیوں کر رہا ہے احمق ـــ میرے سُوال کا جواب دے۔"

"معاف کر دو میاں صاحب ـــ مجھ سے بھول ہو گئی تھی۔"

طوطے کے پنجرے سے کسی اکھڑ قسم کے مرد کی کھردری، بے ربط اور بے ہنگم آواز اُبھری تو مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ مجھے اس کا شبہ ہونے لگا کہ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔

"میری بات کا جواب دے گناہ گار ـــ تو میرے وظیفے میں مخل کیوں ہوا تھا۔" میاں صاحب گرجے تو طوطے کے پنجرے سے پھر وہی بے ہنگم قسم کی مردانہ آواز آنے لگی۔

"میاں صاحب! ـــ میں آپکو یہ بتانا چاہتا تھا کہ کوئی اور بھی آپکے سکون میں مخل ہو رہا ہے۔"

یہ اشارہ غالباً میری طرف تھا۔ میں نے جس وقت اندر جھانکنا شروع کیا تھا اسی وقت طوطے نے شور و غل مچایا تھا۔

"میرے خدا ـــ یہ سب کیا اسرار ہے۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا پھر اچانک خوف زدہ ہو کر پلٹا اور بے تحاشا واپسی کے راستے پر دوڑنے لگا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میاں صاحب کی بڑی بڑی جلالی آنکھیں برابر میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ میں نے ڈر کر رفتار اور تیز کر دی۔ میں جلد از جلد اس پُراسرار ماحول سے بہت دُور نکل جانا چاہتا تھا لیکن شاید قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا جس کا تذکرہ میں آگے چل کر کروں گا۔ فی الحال میں واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے اتنا بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ میں نے اندھیرے میں بھاگتے بھاگتے کسی پتھر سے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل زمین پر گر کر نیچے کی جانب لڑھکنے لگا تھا اور میرے احساسات نے میرا ساتھ چھوڑ کر میری نظروں کے سامنے سیاہی بکھیر دی جو گہری ہوتی چلی گئی اور میں اس میں گُم ہوتا رہا ـــ

میں کس طرح اکبر حسین کے گھر واپس آیا یہ بات مجھے بُری طرح پریشان کئے ہوئے تھی۔ آنکھ کھلنے پر میں نے خود کو اکبر حسین کی خوابگاہ میں اپنے بستر پر پڑا پایا۔ رات کے واقعات ابھی تک میرے ذہن میں تازہ تھے میں نے ان خوفزدہ مناظر کو بھول جانے کے لئے خود کو فریب دینا چاہا۔ یہ سوچ کر اپنے اُلجھے اُلجھے خیالات کو بہلانے کی کوشش کی کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ محض خواب تھا لیکن جب میرا ہاتھ اپنی پیشانی پر پڑا تو میں ایکبار پھر

سر تا پا لرز گیا۔ میری پیشانی کا زخم ہاتھ لگنے سے دُکھنے لگا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ رات جب گرا تھا تو میری پیشانی کسی پتھر سے ٹکرائی تھی۔ میں نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی جو جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ اکبر حسین نے غالباً میرے لباس اور میری پیشانی کو نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ یقیناً مجھ سے اس کی وجہ دریافت کرتا۔ دراصل وہ منہ اندھیرے اُٹھنے کا عادی تھا اس لئے یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے سرے سے مجھ پر توجہ ہی نہ دی ہو۔ اور میں ادھر رات کے انوکھے اور حیرت انگیز واقعات میں بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ گرنے کے بعد میں بیہوش ہو گیا تھا۔" تو پھر مجھے میرے بستر تک کون لایا؟ — کیا میں کسی وقت بیہوشی ہی کی حالت میں اٹھ کر یہاں تک آیا تھا یا پھر مجھے بستر تک پہنچانے میں بھی میاں صاحب کی پُراسرار قوت کا ہاتھ تھا؟"

میں ابھی اسی گتھی کو سلجھانے میں منہمک تھا کہ اکبر حسین ناشتہ لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ حسبِ معمول وہ آج بھی بڑے اچھے موڈ میں تھا لیکن پھر جیسے ہی اس کی نظر میری پیشانی اور میرے لباس پر پڑی اس کا منہ حیرت سے کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر وہ قریب آتا ہوا بولا!

"یہ کیا ہو گیا تمہیں؟" — یہ پیشانی پر زخم اور پھٹے ہوئے کپڑے — یہ سب کیا ہے میاں؟"

"اکبر — رات میں ......" میں نے اکبر کو اصل حالات سے باخبر کرنا چاہا لیکن — معاً میری نظروں کے سامنے انہی سفید ریش بزرگ کا چہرہ اُبھر آیا جنہوں نے رات مجھے اس بات کی سختی سے تاکید کی تھی کہ جو کچھ میں میاں صاحب کی کوٹھری میں دیکھوں اس کا تذکرہ کسی اور سے نہ کروں — یہ نصیحت یاد آتے ہی میں نے جلدی سے اپنی زبان بند کر لی۔ اکبر نے میرے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے تو گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آخر معاملہ کیا ہے — تم کچھ کہتے کہتے خاموش کیوں ہو گئے! — رات کو کیا ہوا تھا؟"

"مجھے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ صبح اپنی یہ حالت دیکھ کر خود مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔"

"میں نہیں مان سکتا۔" اکبر نے تیزی سے کہا۔ "تم ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔"

"نہیں میرے دوست! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں بالکل صحیح ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس حالت کو کس طرح پہنچ گیا۔"

اکبر کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ میں اس کی آنکھوں کی بدلتی رنگت کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ وہ میرے اس سفید جھوٹ پر خوش نہیں ہے۔ کچھ دیر تک وہ یونہی مجھے شکایت کی نظروں سے دیکھتا رہا پھر کوئی بات سوچ کر ناراضی کے لہجے میں بولا؛

"کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہو — زندگی سے اتنی بیزاری کیوں — میں بھی تو موجود ہوں۔ شاہد — میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک بار میاں صاحب سے مل لو اس کے بعد جو تمہارے دل میں آئے کرو لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم نے میری بات نہ مانی۔"

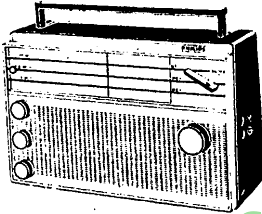
میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جس طرح سوچ رہا تھا، ٹھیک تھا۔ میاں صاحب کے ذکر پر میں نے اکبر سے کوئی تردید نہیں کی۔ چُپ چاپ لیٹا اکبر کو دیکھتا رہا۔ اکبر میری خاموشی سے اُکتا کر بولا؛

"میں جانتا ہوں شاہد۔ زندگی تمہارے لئے عذاب ہو گئی ہے — لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اتنی جلد ہمت ہار دو اور غلط راہ کو اختیار کر لو۔ ابھی تمہارے سامنے عمر پڑی ہے مجھے یقین ہے رات تم بہک گئے تھے۔ میرے دوست کوئی گندا اور غیر شریفانہ پیشہ یا مشغلہ اختیار کرنے سے پہلے تمہیں اتنا سوچ لینا چاہئے تھا کہ تمہارا تعلق

ریڈیو کا انتخاب بھی کوئی مسئلہ ہے؟

فلپس

خریدیئے اور کئی دیگر فوائد حاصل کیجئے!

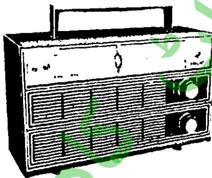


فلپس ۳ بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو

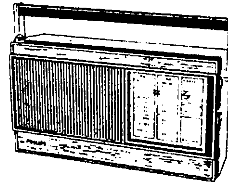


فلپس ۴ بینڈ ٹرانزسٹر ریڈیو

فلپس کوالٹی
فلپس گارنٹی
فلپس سروس



فلپس ایک بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو



فلپس ۲ بینڈ ٹرانزسٹر پورٹیبل ریڈیو



ہمیشہ فلپس کی مصنوعات طلب کیجئے

کس خاندان سے ہے اور تمہاری اس حرکت سے تمہارے
والدین کی روح کو کس قدر صدمہ پہنچا ہوگا۔"
"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اکبر۔" میں نے کہا۔
"حالات انسان کو بے بس بنا دیتے ہیں اکبر۔"
"کیا تم میرے کہنے سے میاں صاحب سے ملاقات
کرنا نہیں پسند کرو گے؟"
"یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔" میں نے جلدی سے کہا
"میں میاں صاحب سے ضرور ملوں گا۔"
"اچھا۔ اٹھو! کپڑے تبدیل کرو اور منہ ہاتھ دھو کر
ناشتہ کر لو۔" اکبر مایوس لہجے میں بولا۔
میں اکبر کے دل کی حالت کا بخوبی اندازہ لگا رہا تھا
لیکن اپنی صفائی میں کچھ کہنے سے مجبور تھا۔ اکبر کے مشورے
پر میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو میرے جسم کی ایک ایک
ہڈی چیخ اٹھی۔ اتنی شدید ٹیسیں اٹھیں کہ میں کراہ کر رہ
گیا۔ سارا جسم جیسے پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ میں
نے نقاہت سے دوبارہ اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔ اکبر
نے میرے چہرے سے میری ابتر حالت کا اندازہ لگایا تو
آگے بڑھ کر مجھے اٹھانے میں مدد کرنی چاہی مگر اچانک
وہ گھبرا گیا اور پریشان لہجے میں بولا۔
"ارے تمہیں تو بہت شدید بخار ہے شاید۔"
"فکر مت کرو۔ جاتا رہے گا۔" میں نے ہمت کرکے
دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی تو میری آنکھوں کے نیچے
اندھیرے لپکنے لگے۔ تب مجھے اکبر کے کہنے سے پہلی بار احساس
ہوا تھا کہ میرا جسم اس وقت تندور کی مانند دہک رہا
تھا۔ میں کراہ کر دوبارہ لیٹ گیا تو اکبر بولا۔
"تم لیٹے رہو۔ میں ابھی ڈاکٹر کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔"
اکبر اتنا کہہ کر پلٹا ہی تھا کہ میں نے اسے آواز دے
کر روکنا چاہا لیکن نقاہت کی وجہ سے الفاظ میرے
منہ میں رہ گئے۔ میرے دماغ پر بوجھل بوجھل سی غنودگی
طاری ہونے لگی۔ میں نے اکبر کے جانے کے بعد رات
والے حالات پر پھر غور کرنا چاہا لیکن بے ہوشی کا غلبہ
مجھ پر اتنی تیزی سے ہوا کہ میں بے سُدھ ہو گیا۔ میری
پلکیں آہستہ آہستہ بند ہوتی چلی گئیں۔ پھر مجھے کچھ یاد
نہیں رہا۔
چار روز تک میں بخار کی شدت سے بے حال
رہا۔ اکبر نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ وہ بیچارہ سارا
سارا دن اور ساری ساری رات میرے سرہانے
بیٹھا رہتا اور حتی الامکان میری تیمارداری میں مصروف
رہتا۔ دوا علاج میں بھی اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا
رکھی تھی لیکن میرا بخار کسی طرح ٹوٹنے کا نام نہ لیتا تھا
پانچویں روز مجھے ذرا ہوش آیا تو یہ بات مجھے اکبر کی
زبانی معلوم ہوئی کہ میں بخار کی حالت میں ہذیان
بکتا رہا ہوں۔ میری زبان سے بار بار میاں صاحب
کا نام بھی ادا ہوا تھا۔
"اکبر تم میرا ایک کام کر سکتے ہو؟" میں نے نقاہت
میں ڈوبی آواز میں کہا تو اکبر جھٹ بولا۔
"کہو۔ کیا بات ہے؟"
"مجھے میاں صاحب کے پاس لے چلو۔"
"لیکن تمہاری حالت ابھی ٹھیک نہیں آبادی
تک تو خیر سواری ہو جائے گی لیکن پہاڑی پر دو فرلانگ
پیدل چلنا پڑتا ہے۔"
"میں ہر قیمت پر میاں صاحب کی قدم بوسی کرنے
کو تیار ہوں۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں جواب
دیا۔ "تم مجھے پہاڑی تک لے چلو وہاں سے پیدل

چل لوں گا۔"

"خیال ہے تمہارا۔" اکبر بولا۔ "تمہاری حالت دو قدم چلنے کی بھی نہیں رہی دو فرلانگ کیسے چل سکتے ہو۔"

"تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں میاں صاحب سے ملے بغیر ہی مر جاؤں۔"

"خدا نہ کرے"۔ اکبر نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔ "ایسی بد فال کیوں زبان سے نکال رہے ہو۔ ذرا اپنی حالت سنبھل لینے دو پھر اطمینان سے مل لینا میاں صاحب سے۔"

"نہیں میرے دوست"۔ میں ایک آہ سرد بھر کر بولا "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ جب تک میں میاں صاحب سے نہ ملوں گا میری حالت ٹھیک ہونے کے بجائے اور بدتر ہوتی جائے گی۔ تم اسی وقت مجھے ان کے قدموں تک پہنچا دو۔ بڑی مہربانی ہوگی تمہاری پیارے جہاں اتنے احسان کئے ہیں وہاں ایک احسان اور کرو۔"

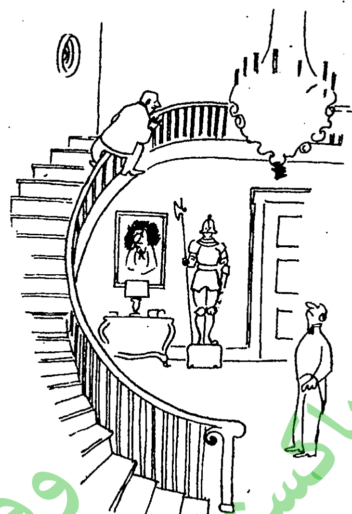
اکبر مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن میرا اصرار حد سے بڑھا تو وہ طوعاً وکرہاً تیار ہو گیا اور سواری کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ اکبر کا خیال غلط نہیں تھا میں خود بھی اپنی حالت سمجھ رہا تھا۔ کمزوری کی وجہ سے جب مجھے بات کرنی مشکل ہو رہی تھی تو دو فرلانگ چلنا تو بڑا ناممکن کام تھا مگر مجھے اب اس کا بخوبی احساس تھا کہ میاں صاحب کی قدم بوسی حاصل کئے اور ان سے معافی مانگے بغیر میرا ٹھیک ہونا مشکل ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اکبر واپس آ گیا۔ اس غریب نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور باہر لے جا کر تانگے میں بٹھا دیا میری کیفیت یہ تھی کہ بار بار بیہوشی کے دورے پڑتے تھے۔ اکبر مجھے پکڑے بیٹھا تھا۔ تانگے کو ذرا بھی جھٹکا لگتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ بس اب کسی لمحے میری روح قفس عنصری سے پرواز کیا چاہتی ہے پہاڑی کے قریب جہاں تک سڑک تھی وہاں تک تانگا مجھے لے گیا۔ اکبر نے مجھے تانگے سے اتارا تو تانگے والے نے جو صورت شکل سے کوئی بھلا مانس لگتا تھا اکبر سے پوچھا۔

"بھیا۔ کیا تم اکیلے مریض کو میاں صاحب تک لے جا سکتے ہو۔"

"کوشش تو کرنی ہی ہے بھائی"۔ اکبر نے بڑی ہمت سے جواب دیا۔

تانگے والا غالباً میاں صاحب کے مریدوں میں سے تھا، جھٹ اکبر کا ہاتھ بٹانے کو آمادہ ہو گیا۔ مجھ پر رہ رہ کر غشی طاری ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک اکبر مجھے گود میں لئے پہاڑی پر چڑھتا رہا پھر جب اس کا سانس پھولنے لگا تو تانگے والے نے مجھے کولی بھر کر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ اسی طرح وہ دونوں مجھے میری منزل مقصود تک لے گئے۔ یہی کوئی عصر کا وقت رہا ہوگا جب میاں صاحب کی کوٹھری پر پہنچا۔ عقیدتمندوں کی اچھی خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ایک وقت میں صرف ایک آدمی اندر جاتا تھا پھر دوسرے کی باری آتی تھی۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کے افراد بھی اپنی باری کے انتظار میں پہاڑی پر ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ اکبر نے مجھے صاف سی جگہ پر بٹھا دیا۔ تانگے والا صورت سے زیادہ شریف انسان ثابت ہوا۔ اکبر نے اس کا شکریہ ادا کر کے زیادہ دام دینے چاہے تو اس نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اس بات پر بھی از خود آمادہ ہو گیا کہ وہ واپسی پر بھی اکبر کا ہاتھ



میرا خیال تھا میں گھر میں تنہا ہوں

بٹائے گا اور مجھے گھر تک چھوڑ کر جائے گا۔

میں اکبر کے سہارے بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک شخص اکبر کے قریب آکر بولا۔

"کیا آپ کے مریض کا نام شاہد علی درانی ہے؟"

"جی ہاں۔ کیوں؟" اکبر نے تعجب سے پوچھا۔

"میاں صاحب آپ دونوں کو یاد فرماتے ہیں۔"

مجھے ایک لمحے کے لئے اس بات پر حیرت ہوئی کہ آخر میاں صاحب کو میری آمد کا علم کس طرح ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میرا سر عقیدت سے جھک گیا۔ اکبر نے مجھے جھک کر گود میں اٹھایا اور میاں صاحب کی کوٹھری میں لے گیا۔ میاں صاحب اس وقت بھی اپنے کھردرے پلنگ پر پیوند لگا لباس پہنے بیٹھے تسبیح پر کسی وظیفے کا ورد کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر نور ہی نور بکھرا ہوا تھا۔ آنکھوں سے محبت اور اپنائیت کے جذبے کا اظہار ہو رہا تھا۔ اکبر نے مجھے میاں صاحب کے سامنے دری پر بٹھا دیا اور پھر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میاں صاحب نے ہاتھ اٹھا کر چپ رہنے کا اشارہ کیا میرے اوپر کچھ ایسی دہشت طاری تھی کہ میں گردن جھکائے اور نظریں نیچی کئے بیٹھا تھا۔ اس خیال سے میرا دل دھڑک رہا تھا کہ دیکھیں میاں صاحب اب مجھے کس انداز میں سرزنش کرتے ہیں کوٹھری میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر میاں صاحب بڑے نرم لہجے میں بولے۔

"تمہیں کب سے بخار ہے شاہد میاں؟"

"جی" نہ جانے کیوں میاں صاحب کی آواز سن کر میں سر تا پا لرز اٹھا۔ بڑی مشکل سے میں نے نظر اٹھا کر میاں صاحب کے نورانی چہرے کو دیکھا پھر یکلخت میری آنکھیں چھلک آئیں۔ میں میاں صاحب کے سوال کا جواب بھی نہ دے سکا۔

"پریشان مت ہو۔ جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو میں جان گیا ہوں" میاں صاحب بڑی شفقت سے بولے۔

"غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں لیکن سچا انسان وہ ہے جو اپنی غلطی پر پشیمان ہو اور دوسروں کو پریشان نہ کرے۔"

میاں صاحب کی بات سمجھ کر میری گردن شرمندگی کے احساس سے دوبارہ جھک گئی۔ میں اپنے کئے پر نادم تھا۔ دل ہی دل میں میں نے عہد کر لیا تھا کہ اب چراغ جلنے کے بعد پہاڑی کا رخ بھی نہ کروں گا۔ اکبر بدستور مجھے سہارا دیئے بیٹھا تھا۔

"خدا کی مشیت میں کسی کو دخل ہے۔" میاں صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "اس کا کوئی اشارہ مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر پریشانیاں آتی ہیں تو آرام اور سکون بھی وہی دینے والا ہے ہمیں ہر حال میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ اس زندگی میں سخت امتحان آتے ہیں مایوسی

کفر ہے۔"

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ میاں صاحب کچھ توقف کے بعد بولے۔

"مجھے علم ہے میرے بچے کہ زمانے نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے لیکن تمہیں اس حال میں بھی خدا کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس نے تمہیں امتحان کے قابل سمجھا۔ کیا عجب کہ اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہو اور تمہاری بھلائی کا کوئی پہلو منظور ہو۔"

میاں صاحب بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ مجھے نصیحتیں کرتے رہے میرے دل پر ان کی باتوں کا کچھ اتنا گہرا اثر ہوا کہ میری آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ میں ہچکیوں سے رو پڑا۔ میاں صاحب کی ایک ایک بات میرے ذہن پر اثر چھوڑ رہی تھی میں اپنی کمزوری اور بخار کی شدت کو بھول کر میاں صاحب کی باتوں کے سحر میں کھو گیا۔ مجھ پر گریہ کا عالم تھا۔ اکبر خاموشی سے مجھے پکڑے بیٹھا رہا۔ اس نے بھی بڑی عقیدت سے اپنا سر خم کر رکھا تھا۔

"تم نے اچھا کیا جو میرے پاس چلے آئے۔ میں خدا سے تمہارے حق میں دعا کروں گا کہ وہ تمہیں صبر و شکر کی توفیق عطا فرمائے اور تمہاری پریشانیاں دور کرے۔" میاں صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم گھر جاؤ اور آرام کرو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں خدا نے چاہا تو تمہاری طبیعت بھی جلد ہی سنبھل جائے گی۔"

اکبر نے جھک کر میاں صاحب کو سلام کیا پھر مجھے گود میں اٹھا لیا۔ میں نے رخصت ہوتے وقت میاں صاحب کے نورانی چہرے پر نظر ڈالی تو وہ آنکھیں بند کئے

ہوتے تھے اور منہ اوپر اٹھاتے غالباً میرے حق میں دعا
فرما رہے تھے اکبر مجھے گود میں لئے الٹے قدموں کوٹھڑی
سے باہر آگیا پھر وہ تانگے والے کی مدد سے گھر واپس لے
آیا۔ گھر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر تانگے والے کو اس
کی زائد خدمت کے عوض زیادہ کرایہ دینا چاہا لیکن اس
نے صرف اپنی اصل اجرت لی اور خاموشی سے چلا گیا اس
کے جانے کے بعد اکبر میرے قریب آکر بیٹھ گیا اور میرا سر
سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ زیادہ تکان تو
نہیں محسوس کر رہے؟"

"نہیں" میں نے خاموشی سے کہا پھر اکبر سے ایک
گلاس پانی مانگ کر پیا اور آنکھیں بند کرکے دوسری طرف
کروٹ لے لی۔ اکبر نے میرے آرام کے خیال سے پھر مجھ
سے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ دیر بیٹھا آہستہ آہستہ میرا سر
سہلاتا رہا پھر اٹھ کر اندر چلا گیا۔

جس روز سے میاں صاحب کی قدم بوسی کا شرف
حاصل کیا اس کے دوسرے ہی روز سے میری طبیعت
سنبھلنی شروع ہوگئی۔ پانچویں روز میں بالکل بھلا چنگا
ہوگیا۔ اب نہ نقاہت باقی تھی اور نہ کمزوری، یہ سب
میاں صاحب کی دعاؤں کا نتیجہ تھا ورنہ میرا بخار اول
تو اتنی جلدی نہ اترتا اور اگر اتر بھی جاتا تو کمزوری مہینوں
باقی رہتی۔ اکبر کو میرے صحت مند ہونے پر بیحد خوشی
تھی جس روز میں نے غسل صحت کیا اس روز اکبر نے کہا۔

"اب کیا پروگرام ہے تمہارا۔ کیا میاں صاحب سے
مل لینے کے بعد بھی تم اپنے پرانے خیالات پر قائم رہو گے"

"کچھ نہ کچھ تو بہرحال کرنا ہوگا" میں نے جواب دیا۔ "رہا
میاں صاحب کا سوال تو میں ان کی عظمتوں کا قائل ہو
چکا ہوں اگر وہ مجھے قدم بوسی کی اجازت نہ دیتے تو
شاید میرا بچنا بھی مشکل ہو جاتا۔"

"گویا اب تم راہ راست پر آگئے ہو۔"

"یہ سب میاں صاحب کی دعاؤں کا نتیجہ ہے"

اکبر اور میں بہت دیر تک میاں صاحب کی بات
کرتے رہے پھر اکبر نے مجھے کریدتے ہوئے پوچھا۔

"شاہد۔ کیا تم اب بھی مجھے نہ بتاؤ گے کہ اس رات
تمہیں کیا حادثہ پیش آیا تھا؟"

"مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلے میں اپنی زبان
کھولنے سے قاصر ہوں لیکن تمہیں اتنا ضرور یقین دلا سکتا
ہوں کہ اس حادثے کے بارے میں جو قیاس آرائی تم
نے کی تھی وہ غلط ہے۔"

"کیا کوئی ایسی ہی خاص بات ہے جو تم مجھ سے
بھی نہیں کہہ سکتے" اکبر نے اصرار کیا تو میں نے مجبور ہو کر کہا۔

"تم اگر بضد ہو تو میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ اس
رات میں تمہارے منع کرنے کے باوجود میاں صاحب
کی اصلیت کا راز جاننے کے لئے پہاڑی پر چلا گیا تھا
وہاں میں نے کیا دیکھا اور کیا سنا اس کے بارے میں
تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا اگر میں نے ایسا کیا تو میرا دل
گواہی دیتا ہے کہ میں ضرور کسی مصیبت میں گرفتار
ہو جاؤں گا۔"

اکبر نے میری بات سنی تو اس کا منہ حیرت سے کھلا
کا کھلا رہ گیا۔ وہ مجھے تعجب خیز نظروں سے گھورتا ہوا بولا

"مجھے خود بھی حیرت تھی کہ آخر تمہارا بخار ٹوٹنے کا
نام کیوں نہیں لے رہا۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اب
تم میاں صاحب کی دعاؤں کی بدولت تندرست ہوگئے
لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ اب تم دوبارہ کبھی مغرب کی

نماز کے بعد اس پہاڑی کی طرف بھول کر بھی رُخ نہ کرنا۔"

"ظاہر ہے کہ ایک بار اپنے کئے کی سزا بھگت لینے کے بعد اب میں دوبارہ وہی غلطی نہیں کر سکتا" میں نے صدقِ دل سے کہا پھر گفتگو کا رُخ بدلنے کے لئے بولا۔" میرے نزدیک اب صرف "تلاش معاش" کا مسئلہ رہ گیا ہے۔ میں کل سے دوبارہ روزگار کی تلاش میں نکلوں گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ خدا تمہیں اس بار ضرور کامیاب کرے گا لیکن میری مانو تو تم اس سلسلے میں بھی میاں صاحب سے ملو، مجھے قوی امید ہے کہ وہ تمہاری مدد فرمائیں گے۔"

"میرا خیال بھی یہی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ کچھ دن اور اپنی قسمت آزمالوں اگر کامیابی ہوگئی تو ٹھیک ورنہ پھر میاں صاحب کی قدم بوسی کے لئے ان کے دربار میں حاضری دوں گا۔"

دوسرے روز سے میں نے پھر ملازمت کے سلسلے میں بھاگ دوڑ شروع کر دی جہاں جہاں بھی ذہن نے مشورہ دیا۔ درخواست گزار دی۔ مجھے توقع تھی کہ کہیں نہ کہیں قسمت ضرور یاوری کرے گی لیکن ایک ہفتے تک متواتر صبح سے شام تک اِدھر اُدھر بھاگے پھرنے کے باوجود ملازمت نہ ملی۔ اکبر برابر میری دلجوئی کرتا اور ہمت بڑھاتا رہتا۔ میاں صاحب سے مِل لینے کے بعد میرے خیالات بڑی حد تک بدل گئے تھے۔ میں نے طے کیا تھا کہ اب محنت مزدوری کر کے ایماندارانہ زندگی گزاروں گا مگر ایک روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا رُخ پھیر دیا۔ میں ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ دُنیا میں عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے جس کے پاس دولت ہے اور دولت کے ساتھ طاقت بھی۔ غریب انسانوں کو اس جہاں میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

اس روز کپڑے کے ایک بیوپاری نے ترس کھا کر مجھے اپنا حساب کتاب لکھنے اور دوکان کا تھوڑا بہت کام کرنے پر ملازم رکھ لیا تھا۔ تنخواہ پچھتر روپے ماہوار طے کی۔ ہر چند کہ یہ تنخواہ بڑی قلیل تھی لیکن میں نے یہ سوچ کر اسے قبول کر لیا کہ بیکار گھومنے سے بہتر ہے کہ کہیں ٹک جاؤں۔ بعد میں اگر کوئی اچھا موقع ملا تو اس ملازمت کو اپنا لوں گا۔ ویسے بھی پچھتر روپے مجھ تنہا آدمی کے لئے کافی تھے۔

دن بھر میں بڑی تندہی سے دوکاندار کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ شام ہوئی تو اس نے مجھے کچھ کاغذات دے کر کہا کہ میں ان کا اندراج بہی کھاتے میں کر دوں۔ میں اس کے حکم کی تعمیل میں رجسٹر لے کر بیٹھ گیا اور سنبھال سنبھال کر کاغذات کا اندراج کرنے لگا۔ ابھی میں

اپنے کام میں منہمک تھا کہ میری قوت سماعت سے ایک جانی پہچانی آواز ٹکرائی۔ پلٹ کر دیکھا تو میرا سب سے بڑا دشمن بیرسٹر راشد حسین جس کی وجہ سے میں اس حالت کو پہنچا تھا بیٹھا دوکان کے مالک سے کسی مقدمے کی بات کر رہا تھا۔ میری اور راشد حسین کی نظریں چار ہوئیں تو میرے زخم تازہ ہو گئے۔ میرا دل چاہا کہ اٹھوں اور اٹھ کر موذی کا خون کر دوں جس نے میری زندگی سے تمام خوشیاں چھین لی تھیں مگر مجھے محسوس ہوا جیسے اس اقدام سے کسی نے مجھے روک لیا ہو۔ میں حقارت سے منہ پھیر کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ راشد حسین نے مجھے ایک طویل عرصے کے بعد دیکھا ہے اس لئے شناخت نہ کر سکا ہو گا۔ راشد حسین نے مجھے نہ صرف دیکھ لیا بلکہ پہچان بھی لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد دوکان کے مالک نے مجھے آواز دے کر بلایا اور مجھ سے نفرت انگیز لہجے میں مخاطب ہوا۔

"یہ جو بیرسٹر ابھی میرے پاس بیٹھے تھے کیا تم انہیں جانتے ہو؟"

"جی ہاں"۔ میں نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

"ان کا نام بیرسٹر راشد حسین ہے کسی زمانے میں ان ہی کے محلے میں رہا کرتا تھا۔۔۔۔"

"تم نے راشد حسین کے ہاں ملازمت بھی کی تھی کیوں۔ ؟"

"جی ہاں۔"

"اس کے بعد کیا ہوا تھا؟" دوکان کے مالک نے نفرت و حقارت سے پوچھا۔

"میں نے کچھ دنوں بعد ان کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔"

"بکواس کرتے ہو۔" دوکاندار نے گرج کر کہا "تم نے بیرسٹر کے ہاں چوری کی تھی۔ اس کی لڑکی کا سارا زیور پار کر دیا تھا جس کے عوض تمہیں سات سال تک جیل کی سیر کرنی پڑی تھی۔"

"یہ سب جھوٹ ہے"۔ میں احتجاجاً چیخ اٹھا "راشد حسین نے میرے اوپر جھوٹا کیس بنایا تھا"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے اور اگر پھر کبھی دوکان کے سامنے نظر آئے تو اچھا نہ ہو گا۔"

میرا دل تو بہت چاہا کہ اس ساہوکار کے بچے کو کھری کھری سنا دوں۔ ملازمت تو بہرحال چھوڑنی تھی لیکن خیال کر کے کہ بات بڑھانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا میں اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلا آیا۔ پھر ایک بار میرا جی اس دنیا کو آگ لگانے کو چاہا۔ میں قتل عام کرنا چاہتا تھا۔ میرے سینے کے تمام زخم جو وقت نے رفتہ رفتہ رفو کر دیئے تھے ایک بار پھر ہرے ہو کر رسنے لگے۔ میں نے خود اپنے آپ سے کہا۔

"شاہد علی۔ اگر تم دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کے لئے تمہیں اپنی روش بدلنی ہو گی۔ تمہارا ماضی ہمیشہ تمہارے حال پر اسی طرح اثر انداز ہوتا رہے گا۔ تم جہاں بھی جاؤ گے جس سے بھی ملازمت کی درخواست کرو گے وہ تم سے تمہاری سابقہ زندگی کے بارے میں ضرور دریافت کرے گا۔ تم اپنے ماضی کو آخر کب تک اور کس کس سے چھپاتے رہو گے۔ وقت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ دنیا والوں کو جو خوشیاں اور نعمتیں میسر ہیں ان میں تمہارا بھی حصہ ہے لیکن تمہیں اپنا حصہ حاصل کرنے کے لئے اپنے تیور بدلنے ہوں گے۔ دولت اور طاقت کے حصول کے لئے تمہیں ہر اقدام کرنا ہو گا۔ لوہے پر لوہے سے

ضرب دینا ہوگا۔ ورنہ تم یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گے"
میرا ذہن مجھے کچوکے لگاتا رہا۔ ماضی کی تلخ یادیں مجھے جھنجھوڑتی رہیں اور پھر۔ پھر میں نے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ میں نے طے کر لیا کہ میں دُنیا والوں سے اپنے حصّے کی خوشیاں زبردستی چھین لوں گا۔ لیکن اس انداز میں کہ انہیں اس کا احساس نہ ہو سکے۔ گھر پہنچکر جب میں نے اکبر حسین کو حالات سے آگاہ کیا تو اسے بھی صدمہ ہوا۔ مجھے سمجھانے کے لئے بچوں کی طرح اس نے طرح طرح کی دلیلیں پیش کیں مگر میں نے ان نصیحتوں کو ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دیا۔ اب میں نے عزم مصمم کر رکھا تھا کہ اپنی متعین کردہ راہوں پر کوئی قدم اُٹھانے سے پیشتر ایک بار میاں صاحب سے ضرور ملوں گا۔

رات بھر میں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا اور بے چینی سے جاگتا رہا۔ صبح ہوتی تو میں نے ناشتہ کیا اور میاں صاحب سے ملنے کے لئے روانہ ہو گیا اکبر کو میں نے نہ تو اپنے فیصلوں سے مطلع کیا تھا نہ ہی اسے یہ بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں میرا فیصلہ یہ تھا کہ میں آخری بار میاں صاحب کی قدم بوسی کرنے کے بعد چپ چپاتے اس شہر سے کہیں دور چلا جاؤں گا اور نئے سرے سے اپنی زندگی گزاروں گا۔"

میاں صاحب کی کوٹھری کے باہر حسب معمول عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ میں ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گیا۔ شام کو کوئی پانچ بجے میری باری آئی۔ میں سر جھکائے اندر داخل ہوا۔ بھوک پیاس سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ ذہن کو پریشان خیالات نے پراگندہ کر رکھا تھا لیکن جیسے ہی میں نے کوٹھری

> ایک صاحب نے دیکھا کہ ان کا گوالا (دودھ والا) ہر تیسرے چوتھے دن اپنا خط پوسٹ کرنے شہر چلا جاتا ہے۔ انھیں تعجب ہوا کہ جب گاؤں میں ڈاک خانہ اور لیٹر بکس موجود ہے تو یہ شہر کیوں جاتا ہے۔ ایک دن انھوں نے گوالے کو روک لیا اور پوچھا "بھائی جب گاؤں میں ہی ڈاک خانہ اور لیٹر بکس موجود ہیں تو تم خط پوسٹ کرنے شہر کیوں جاتے ہو؟"
>
> گوالے نے معصومیت سے جواب دیا "بھائی اپنی تو یہ عادت نہیں ہے کہ کسی سے بدلہ لیں لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ ڈاک خانے کے بابو مجھ سے دودھ نہیں لیتے اور میری جگہ دوسرے دودھ والے کو لگا لیا ہے تو مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ ان کے لیٹر بکس میں اپنا خط ڈالوں، میں شہر جا کر ڈال آتا ہوں۔"

میں قدم رکھا لوبان کی خوشبو نے میرے دل و دماغ کو تازہ کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ذہن کی پریشانیاں چھٹ گئی ہوں۔ میں بڑی عقیدت سے آگے بڑھا اور میاں صاحب کو سلام کر کے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"آج کس لئے آئے ہو مبارک پاس؟"

میاں صاحب کی آواز سُن کر میں نے نظر اُونچی کی تو لرز اُٹھا۔ ان کی آنکھوں میں آج پھر وہی جلالی کیفیت موجود تھی جو میں ایک بار پہلے بھی چھپ کر دیکھ چکا تھا۔ آنکھیں دہکتے انگاروں کی مانند سرخ ہو رہی تھیں اور جسم تھر تھر کانپ رہا تھا چہرے پر شدید غصّے کے تاثرات نمایاں تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ میاں صاحب جو پچھلی ملاقات پر بڑی نرمی سے پیش آئے تھے آج مجھ سے اس قدر ناراض کیوں ہیں۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ میاں صاحب نے دوبارہ مجھے خوفناک نظروں سے گھورتے ہوئے کڑک کر پوچھا۔

"مردود۔ کس لئے آیا ہے میرے پاس؟"

"میاں صاحب ۔ میں اس شہر سے جا رہا ہوں۔ آخری بار آپ کا دیدار کرنے حاضر ہوا ہوں"۔ میں نے بڑی آہستگی سے جواب دیا تو میاں صاحب تلملا کر بولے۔

"بزدل! ۔ انسانوں سے ڈرنے کے بجائے خدا سے ڈر۔ کیوں اپنی مٹی پلید کر رہا ہے بیہودے"۔

میں خاموش رہا تو میاں صاحب نے جھلا کر کہا۔

"اندھا ہو گیا ہے کیا ۔ دولت کی ہوس نے تجھے بھی اندھا کر دیا ہے۔ ابے مردود تجھے خوش ہونا چاہیئے تھا کہ خدا نے تجھ کو اپنے نیک بندوں میں شمار کر کے پریشانیاں بخش دیں۔ اگر تو پہلے ہی قدم پر ڈگمگا گیا تو آگے چل کر کیا کرے گا"۔

میں نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا تو میاں صاحب چیخ کر بولے۔

"احسان فراموش۔ جہنمی ۔ بول کتنی دولت چاہیئے تجھے ۔ اگر تو خود کو برباد کرنے کے درپے ہے تو میں تجھے اتنی دولت دے سکتا ہوں کہ تو اپنی تمام زندگی کسی کوٹھے پر بڑے آرام سے گزار دے ۔ جواب دے او مستانے ۔ عیاشی کرنے کی ٹھانی ہے۔ چوری اور ڈکیتی کرے گا؟ ۔ کیا حرام کے مال سے اپنے پیٹ کا دوزخ بھرے گا؟"

میاں صاحب کے لہجے میں نہ جانے وہ کون سا جادو تھا کہ میں موم کی طرح پگھل گیا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ میں بے اختیار اٹھا اور میاں صاحب کے پاؤں پکڑ لئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کوٹھری میں صرف میرے رونے کی آواز ابھر رہی تھی۔ میاں صاحب کے ہاتھ تیزی سے تسبیح کے دانوں پر چل رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ جلالی کیفیت میں اپنا سر جھٹکتے رہے پھر انہوں نے پُرسکون ہو کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور نرم آواز میں مخاطب ہوئے۔

"شاہد علی ۔ مت گھبراؤ ۔ عزیزم دیر ہے ۔ اندھیر نہیں ۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے ۔ وہ جب رسی کھینچتا ہے تو بڑے بڑے ظالم تباہ و برباد ہو جاتے ہیں ۔ تمہیں وقت کا انتظار کرنا ہو گا میرے بچے۔ وقت کا انتظار ۔ خود کو سنبھالو"۔

میرے اوپر رقت کا عالم طاری تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی حقیر تنکے کی طرح تیز و تند موجوں پر بہا جا رہا ہوں۔ میں میاں صاحب کے قدموں پر پڑا سسک رہا تھا۔ انہوں نے مجھے پیار سے مخاطب کیا تو میری ہچکی بندھ گئی۔ میاں صاحب مجھے نصیحت کرتے رہے۔ جب وہ خاموش ہوئے تو میں نے ڈبڈبائی ہوئی نظریں اٹھا کر ان کے نورانی چہرے کو بڑی پُرامید نظروں سے دیکھا اور بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میاں صاحب ۔ مجھے اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت دے دیجئے۔ میں تمام عمر آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ مجھے دنیا والوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں اس ماحول میں واپس نہیں جانا چاہتا جہاں میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مجھے اپنے قدموں میں رکھ لیجئے میاں صاحب۔ اگر آپ نے میری التجا نہ قبول کی تو میں برباد ہو جاؤں گا"۔

میاں صاحب میری اس اچانک درخواست پر ششدر رہ گئے۔ مجھے کچھ دیر تک گھورتے رہے پھر آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلے گئے۔ بڑی دیر تک وہ اسی حالت میں بیٹھے رہے۔ دوبارہ آنکھ کھولی تو

ان کی آنکھوں میں حسرت بھری ہوئی تھی۔ مجھے سپاٹ نظروں سے گھور کر قدرے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اللہ کو جو منظور ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ ــــ تم اگر میرے پاس رہنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن تمہیں سچے دل سے مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔"

"میں آپ کا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"تم یہاں رہو گے تو میرے ہر کام اور عمل سے واقف ہوتے رہو گے لیکن اگر تم نے اس کا تذکرہ کسی اور سے کیا تو تمہارے حق میں بہت برا ہو گا۔"

میں نے فوری طور پر حامی بھر لی پھر کچھ دیر بعد میاں صاحب سے دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے ان کی کوٹھری نما حجرے سے باہر آگیا۔ میاں صاحب کے قدموں میں زندگی گزارنے کی اجازت مل جانے کے بعد مجھے جس روحانی مسرت کا احساس ہو رہا تھا اس کا بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ میں خوشی خوشی گھر کی سمت واپس جا رہا تھا کہ معاً میرے ذہن میں ایک خیال بڑی تیزی سے ابھرا ــــ اگر میاں صاحب کے پاس رہ کر میں روحوں کو قبضے میں کرنے کا عمل سیکھ لوں تو مجھے دنیا کے تمام آرام اور تمام آسائشیں میسر آسکتی ہیں۔ میں راشد حسین کے علاوہ ان تمام لوگوں سے اپنا انتقام لے سکتا ہوں جنہوں نے مجھے کمزور سمجھ کر میرے اوپر ظلم و ستم توڑے ہیں۔" ــــ میرے قدم الٹے سیدھے پڑ رہے تھے ــــ

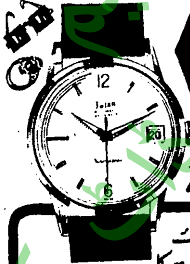
میاں صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر شاہد علی درّانی نے کیا کیا صلہ کیا ــــ؟

اس پراسرار داستان کے باقی واقعات کے لئے غلام روحیں کی تیسری قسط پڑھیئے۔

ایک مشہور ادیب کے ننھے سے بچے میں بے تکلفی بلا کی پائی جاتی تھی۔ ادیب کے دوست احباب یا عزیز رشتے دار جب ان کے گھر تشریف لاتے تو ننھے میاں ان کی خاطر مدارات کی اشیاء میں بغیر اجازت اور بغیر اطلاع کے شریک ہو جاتے۔ باپ نے کئی بار سمجھایا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ادیب نے ننھے میاں کو ان کی ماں کے حوالے کرتے ہوئے کہا "بھئی اسے سنبھالو! اس نے تو بے تکلفی کی حد کر دی۔ کوئی کچھ کھائے یا نہ کھائے یہ حضرت بغیر پوچھے اور انتظار کئے بغیر ہی کھانے پینے میں لگ جاتے ہیں!"

ماں نے ننھے میاں کو خوب سمجھایا اور بتلایا کہ "بیٹے ایسا کرنا سخت بدتمیزی میں داخل ہے تم شریف ماں باپ کے بیٹے ہو، اور شریف بچے ایسی حرکتیں نہیں کرتے!"

اسی دوران ادیب نے چند شاعروں اور ادیبوں کی دعوت کی، مشاعرے کے آغاز سے پہلے ان حضرات کی پھلوں اور چائے سے تواضع ہونے لگی۔ لیکن ایک شاعر الگ تھلگ بیٹھا کسی سوچ میں گم تھا۔ وہ نہ تو چائے پی رہا تھا نہ کوئی اور چیز کھا رہا تھا۔ میزبان ادیب نے کئی بار ان کی خوشامد کی اور اصرار کیا کہ وہ تکلف کو بالائے طاق رکھ کر لوگوں کے ساتھ کھانے پینے میں شریک ہو جائیں، لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ ننھے میاں اس تماشے کو بغور دیکھ رہے تھے۔ جب انھوں نے اچھی طرح یقین کر لیا کہ یہ دبلا پتلا شاعر کھائے گا کچھ بھی نہیں تو ننھے میاں نے شاعر کی وکالت کی اور فرمایا "ابا جان انھیں مجبور نہ کیجئے یہ نہیں کھائیں گے، ان کی امی نے انھیں منع کیا ہے۔"



ماں

کلیم اللہ خاں

ماں کے کردار پر دو بہترین کہانیاں آپ اگلے صفحات میں پڑھیں گے۔ دیکھئے دنیا کے نامور مصنفین نے ماں کو کس طرح محسوس کیا ہے۔ دونوں کہانیوں کے پلاٹ الگ الگ ہیں مگر ماں ایک ہی ہے،

موپاسان نے بہت کم عمر پائی وہ ۴۳ سال کی عمر میں ۱۸۹۳ء میں انتقال کر گئے۔ اس مختصر وقت میں انہوں نے ایسی خوبصورت شاہکار کہانیاں لکھی ہیں جنہوں نے ساری دُنیا کو متاثر کیا ہے دُنیا کی شاید ہی کوئی ایسی زبان رہ گئی ہو جس میں موپاسان کی کہانیوں کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔

موپاسان نے بڑی اُداس اور محرومی زندگی گزاری۔ ان کی کہانیوں کا موضوع انسانوں کی محرومیاں، تلخیاں، بے بسیاں، سماجی جبر، مظلومیت اور اس کا اندازہ ہے، موپاسان انسان کے اندر کے عکاس ہیں یہاں جو کہانی شائع کی جا رہی ہے اس میں ماں کو کسی اور رنگ اور زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد آپ سمرسٹ مام کی کہانی پڑھئے



پہلی ماں کی کہانی

اُس کی ماں کو اپنے بیٹے کی کسی چیز سے اگر کوئی نفرت تھی تو وہ اس کا ہرجائی پن تھا۔ بیٹے کی شکل و صورت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اس کے حسن اور مردانہ وجاہت کی تعریفیں کیا کرتے۔ عورتیں جب اس کا نام لیتیں تو ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ مرد اس سے حسد کرتے اور جن عورتوں کو وہ چاہتا ان پر دوسری عورتیں رشک کرتی تھیں لیکن اس کی محبت میں پائیداری نہ تھی۔ وہ تو بس حُسن کا متوالا تھا جہاں کہیں نظر آتا، جھوٹی محبت کے پھندے ڈال کر جب اس پر قابو پاتا تو اُسے خوب جی بھر کے پامال کرتا اور پھر کسی اس سے بھی زیادہ حسین چہرے کی طرف راغب ہو جاتا۔ جو عورتیں اس کی بے وفائی کا شکار ہوتیں وہ اُسے زندگی بھر یاد رکھتیں۔ ماں کا دردمند دل اپنے بیٹے کی اس قابلِ نفرین سرشت پر خون کے آنسو بہاتا رہتا۔ اس نے بارہا محبت آمیز لہجے میں اپنے بیٹے کو نصیحتیں کیں اور اُسے سمجھایا کہ کچھ بھی ہو اس خطرناک اور اخلاق باختہ کھیل کا انجام اچھا نہ ہوگا، لیکن شباب کی سرمستی اور جوانی کی ترنگ میں نصیحتیں کس نے سنی ہیں اور کس نے ان پر عمل کیا ہے اس کی ماں کو اس بات کا کہاں علم تھا کہ اس کے لاڈلے بیٹے نے حسین لڑکیوں اور دلکش عورتوں کے لئے خطرناک ترین رقیبوں کا مقابلہ کر کے انہیں نیچا دکھایا تھا۔ چنانچہ جب وہ اپنی ماں کے منہ سے بے رنگ اور بے کیف گھسی پٹی نصیحتیں سنتا تو جنس کے میدان میں اپنی کامرانیوں کا تصوّر کر کے بدمست ہو جاتا۔

اس دوران اس کا واسطہ جرمین نامی ایک اداکارہ سے پڑا۔ جرمین اُسے بہت چاہتی تھی اور اس نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ جرمین کے عشق نے جنون کی شکل اختیار کر لی تھی لیکن اس دنیا میں ثبات تو صرف تغیر کو ہے۔ رینے کا جرمین سے بھی جلدی ہی دل بھر گیا اور یہ بھی رینے کی بے وفائی اور سرد مہری کا شکار ہو گئی۔ جرمین کے سارے احتجاجات اور جملہ آہ و زاریاں رینے کے ہرجائی دل پر کوئی اثر نہ کر سکیں۔

کیونکہ اب جرمین کی جگہ اس سے کہیں زیادہ حسین، پرکشش اور گداز جسم کی مالک مادام یونے حاصل کرلی تھی۔ ہر محفل اور ہر مقام پر دونوں یکجا ہوتے۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں چہلیں ہوتیں اور ایک دوسرے میں جذب ہوجانے والا والہانہ انداز ہوتا۔

لیکن جرمین کو بھی اپنی شکست تسلیم نہ تھی۔ جب آہ وزاریاں بیکار ہوگئیں اور خوشامد درآمد نے اپنا اثر کھودیا تو اس کی جگہ جذبۂ انتقام بیدار ہوگیا۔ اب وہ ہر قیمت پر رینے کو اس کی بے وفائیوں کی سزا دینا چاہتی تھی، اسے صرف موقع کی تلاش تھی اور ایک دن یہ موقع بھی اُسے مل گیا۔

رینے اپنی نئی محبوبہ کے ساتھ تھیٹر میں داخل ہوچکا تھا اور جرمین باہر کھڑی اس کی واپسی کی منتظر تھی۔ کھیل ختم ہونے کے بعد جب یہ دونوں باہر نکلے تو جرمین نے خونخوار جانور کی طرح جھپٹ کر اس کے چہرے پر تیزاب کی دھار مار دی۔ یہ کام اتنی تیزی سے ہوا کہ رینے جرمین کی شکل تک نہ دیکھ سکا۔ اس کو اپنے چہرے پر ہزاروں سوئیوں کے چبھنے کی اذیت محسوس ہوئی اور آنِ واحد میں اُس کا خوبصورت چہرہ جھلس کر رہ گیا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور مدد کے لئے لوگوں کو پکارنے لگا۔ لوگوں نے فوراً اس کو طبی امداد پہنچائی اور ڈاکٹروں کی ہر ممکن کوشش کے باوجود بدصورتی اُس کا مقدر بن چکی تھی۔ اس کا چہرہ اس بری طرح مسخ ہوا تھا کہ اب اس پر نظر ڈالنے سے بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ چہرے کی دلکشی کے ساتھ ہی بینائی بھی رخصت ہوچکی تھی۔

رینے کو صحت یاب ہونے میں کافی وقت لگا لیکن جب وہ صحت یاب ہوا تو عبرت کی ایک تصویر بن چکا تھا۔ اب لوگوں کو اس پر نظر ڈالنے سے بھی گھن آتی تھی وہ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا اپنے مسخ شدہ چہرے پر ہاتھ پھیرتا رہتا جب اس کی انگلیاں چہرے کے گڑھوں میں اُتر جاتیں تو دل ہی دل میں اپنی بدصورتی کا احساس کرکے تڑپ جاتا۔ جب وہ شدّت کے ساتھ یہ سوچتا کہ اب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بدصورت اور اندھا ہوچکا ہے اور اب وہ کبھی بھی کسی حسین صورت کو نہ دیکھ سکے گا تو مارے کرب کے اس کی یہ کیفیت ہوتی کہ پوری کائنات مایوسیوں کی لامتناہی تاریکیوں میں ڈوبتی چلی جاتی۔ اور وہ خود ان تاریکیوں کو اپنا مقدّر مان لینے پر مجبور اور بے بس ہوجاتا۔ رومان انگیز ماضی اور مہ وشوں کی صحبتوں میں گزارے ہوئے لمحات اس کے لئے سوہانِ روح بن گئے اور صدموں نے رینے کو گھُلانا شروع کردیا، لیکن ماں کے لئے وہ اب بھی وہی رینے تھا بلکہ اب اس کی محبّت کا اظہار کچھ زیادہ ہی ہونے لگا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی ذہنی اذیتوں اور فکری کرب سے خوب واقف تھی۔ اس لئے وہ اکثر رینے کے پاس بیٹھ کر اسے جھوٹی تسلیاں دیتی رہتی اور وہ رینے کو سمجھاتی کہ "بیٹا! تیرا چہرہ اتنا زیادہ نہیں جھلسا ہے جتنا تو محسوس کر رہا ہے۔ بس تیزاب سے چند دھبّے پڑ گئے ہیں جو اللہ نے چاہا تو دوا علاج سے جلدی ہی دور ہوجائیں گے۔"

رینے اور زیادہ جذباتی ہوجاتا۔ وہ کہتا "ماں! تم میری ماں ہو۔ میں جانتا ہوں تم مجھے دلاسے دے رہی ہو۔ اگر میں تمہارے سامنے اس سے بھی زیادہ بُری شکل لے آؤں تو مجھے یقین ہے کہ تم پھر بھی مجھے پیار کروگی، اس لئے کہ تم میری ماں ہو۔"

رینے میں چھپا ہُوا ہرجائی مرد اب بھی موجود تھا۔ اُس نے پھر سر اٹھایا اور ماں سے کہا "تم کہتی ہو کہ میں کچھ زیادہ بدصورت نہیں ہوا۔ تمہاری اس بات کی تردید یا تصدیق تو کوئی دوسری ہی عورت کرسکتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تصدیق یا تردید جو کچھ ہونا ہے جلدی ہی ہوجائے۔"

ماں چیخ اٹھی "رینے!!"

بے بس رینے کو فوراً احساس ہوگیا کہ اُسے اپنی ماں سے اب ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اس نے افسردہ لہجے میں کہا "ماں! میں معافی چاہتا ہوں، مجھے معاف کردو، میں جانتا ہوں کہ تم مجھے بے حد چاہتی ہو۔ میرے لئے تمہاری محبت اور پیار کا چراغ ہی تو ہے جس سے میری زندگی کی لامتناہی تاریکیاں کسی حد تک چھٹ سکتی ہیں ماں! اگر تم نہ ہوتیں تو یہ زندگی موت سے بدتر ہوتی۔"

اور اندر چھپے ہوئے رینے نے ایک بار پھر اپنی جھلک دکھائی۔ رینے نے آہستہ سے کہا "ماں! اب تم ہی تو میرا سہارا ہو" اور پھر سرد آہ بھرتا ہوا بولا "تمہارے سوا اب مجھے چاہ بھی کون سکتا ہے۔"

ماں سمجھ گئی کہ بیٹا کیا چاہتا ہے اور اس کی کس بات کا کیا مطلب اور اس میں کتنی صداقت ہے۔ وہ خوب سمجھ رہی تھی کہ اس کے رینے کی زندگی بے کیفی سے اکتا گئی ہے اور وہ کسی عورت کا متلاشی ہے۔ چنانچہ اس نے گھر چھوڑ دیا اور اپنے بیٹے کو لے کر ایک گاؤں چلی گئی۔ گاؤں کی کھلی اور تازہ فضائیں انہیں کچھ طمانیت اور سکون سا محسوس ہوا۔ یہاں رینے کو کم از کم یہ اطمینان تو تھا کہ اس کی جاننے والی لڑکیاں اور عورتیں اس کا مذاق نہ اڑا سکیں گی۔ ماں اسے دلچسپ کتابیں سناتی رہتی اور ہر ممکن کوشش سے رینے کے ماضی کو اس کے حافظے سے محو کر دینا چاہتی ——— اپنے اس مقصد کے لئے وہ ہر اس ترکیب کو عمل میں لاتی جس پر عمل کرنا ممکن ہوتا۔ لیکن اپنی ان کوششوں کے آخر میں اسے اپنی ناکامی کا احساس پیدا ہوگیا۔ کیونکہ رینے اب بھی گزرے ہوئے دنوں کی بہ نسبت زیادہ کمزور اور زیادہ زرد ہوتا جارہا تھا۔ اب وہ بالکل زندہ لاش بنتا جا رہا تھا۔ جب وہ چہل قدمی کرتا تو اس کا دُبلا پتلا جسم خم کھاتا محسوس ہوتا۔ اس کی رگ و پے میں دوڑنے والی حسرتیں اور ناکامیاں اس کے عضو عضو سے جھانکنے لگی تھیں ایسا محسوس ہوتا جیسے رینے کو اب صرف موت کا انتظار ہے رینے مرگِ ناگہاں کا منتظر رہنے!! اور یہی شاید اس کے دکھوں کا واحد اور آخری علاج تھا۔

لیکن پھر اس گھر میں ایک تبدیلی ہوگئی۔ ان مایوس اور غمزدہ انسانوں کے ساتھ ایک لڑکی بھی رہنے لگی۔ گھر کی فضا لطیف اور مترنم آوازوں اور قہقہوں سے گونجنے لگی۔ جب پہلی بار یہ آواز اس کے کانوں میں پہنچی تو وہ کچھ حیران ہوا اور پھر یہ حیرانی پریشانی میں تبدیل ہوگئی۔ مایوسی نے اس کے دل پر اس حد تک قبضہ کر لیا تھا کہ اب وہ یہ سوچنے پر آمادہ نہ تھا کہ دنیا کی کوئی بھی عورت اس کے جھلسے ہوئے بدصورت چہرے کو ایک نظر دیکھنا بھی گوارا کرے گی۔

وہ خوب سمجھتا تھا کہ یہ مترنم قہقہے اور سریلی آواز کسی عورت کی ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ عورت رینے کی جھلسی ہوئی شکل کو دیکھ کر نفرت اور بے زاری کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتی۔ لڑکی ہنستی بولتی رہی اور رینے درگزر کرتا رہا۔ ٹالتا رہا لیکن جب ایک مدت گزر گئی تو معلوم ہوا کہ لڑکی کی آواز نے رینے کے دل میں جگہ بنالی ہے اور وہ انتہائی گریز اور شدید کھنچاؤ کے باوجود لڑکی کی ذات سے مغلوب ہوچکا ہے یہ اجنبی لڑکی اس کے دل و دماغ پر چھا چکی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس لڑکی نے اس کے اندر سوئے ہوئے رینے کو پھر بیدار کر دیا ہے۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اس لڑکی کا خیال دل و دماغ پر مسلط رہتا وہ بے بس ہوگیا۔ لڑکی کو جاننے سمجھنے، قریب ہونے اور اس سے باتیں کرنے کی خواہش کروٹیں لینے لگی۔ جو جذبات سو چکے تھے پھر بیدار ہوگئے اور وہ خواہشات جن کا براہ راست جنس سے تعلق تھا۔ سارے جسم میں تناؤ اور کھنچاؤ پیدا کرتے لگیں لیکن



غیر متوازن غذا خرابیٔ ہضم کی ایک بڑی وجہ

کارمینا کی ہاضم ٹکیوں کے استعمال سے اس کا ازالہ کیجئے

غلط غذا کا انتخاب، کھانے میں عجلت، غذا اور دودھ میں ملاوٹ، پُرخوری، خراب پانی، کثیف ہوا، ذہنی الجھاؤ، اعصابی کھچاؤ۔ یہ اور کتنے ہی اور اسباب ہیں جن میں سے کوئی ایک یا کئی مل کر نظام ہضم میں خرابی پیدا کر سکتے ہیں اور ناقص نظام ہضم پورے نظام جسمانی کو مضمحل کر دیتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے معدے کی خرابی سے بچئے۔ کارمینا ہمیشہ اپنے پاس رکھیے۔ بدہضمی، قبض، معدے میں گیس، بھوک کی کمی، سینے کی جلن کھانے کے بعد طبیعت کا گر جانا اور پیٹ پھولنا، یہ سب خرابیٔ ہضم کی واضح علامتیں ہیں۔ کارمینا ان کی اصلاح اور علاج کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔

کارمینا

معدہ اور جگر کی اصلاح کرتی ہے
گیس سے نجات دلاتی ہے۔





ہمدرد دواخانہ (وقف) کراچی - لاہور - راولپنڈی - ڈھاکہ - چٹاگانگ

ہمدرد

Adarts.H.Car/2/71

جس تکلیف اور بے بسی نے ایک مدت سے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ اب بھی رکاوٹ بن رہے تھے۔ ریبنے نے بظاہر بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ماں سے پوچھا۔

ماں! اس لڑکی کا نام کیا ہے؟"

ماں کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ "بیٹے! اسے مارتھا کہتے ہیں!" پھر اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور اس کا تفصیلی تعارف کرانا شروع کر دیا۔ "اس کی عمر بائیس سال ہے، اس کے بال گھنگریالے اور نہایت دلکش ہیں۔ مارتھا جب ہنستی ہے تو اس کے رخساروں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا چہرہ اس کی آواز سے زیادہ پیارا ہے اور اس کا جسم توانائی، دلکشی اور تناسب میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔"

اور ریبنے نے اس تعارف کی مدد سے مارتھا کی خیالی تصویر بنانی شروع کر دی۔ دیر تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ پھر جب ایک دن شام کو وہ اپنے مکان سے ملے ہوئے باغ میں تنہا بیٹھا ہوا گاؤں کی کھلی اور صاف ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا تو اس نے کسی کے آہستہ آہستہ چلنے کی آہٹ محسوس کی۔ یہ آواز کہیں دور سے آ رہی تھی جو رفتہ رفتہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی اس کے پاس آ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بدصورت چہرے کو چھپا لیا۔ وہ دوسروں کو اپنی بدصورت شکل دکھلا کر مکدر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن اس دوران ایک لطیف اور شیریں آواز ریبنے کے کانوں میں رس گھولتی ہوئی دل میں اتر گئی۔ "جناب مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی تنہائیوں میں مخل ہوئی۔ مجھے اس کا قطعی علم نہ تھا کہ آپ یہاں موجود ہیں!"

ریبنے نے اپنے چہرے سے دونوں ہاتھ ہٹا لئے اُس نے پہچان لیا یہ سریلی آواز مارتھا کی تھی۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے دریافت کیا۔ "کیا آپ یہاں پہلے سے موجود ہیں؟"

"ہاں!" میں یہاں چہل قدمی کر رہی تھی۔" مارتھا نے جواب دیا۔

ریبنے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا کہنے لگا۔ "تب تو یہ میرا قصور ہے کہ میں آپ کی چہل قدمی میں مخل ہوا۔ اس کے علاوہ میں جانے ہی والا تھا کہ آپ میرے قریب آ گئیں!"

مارتھا نے اُسے روک لیا۔ "آپ کو جانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی آپ میری چہل قدمی میں مخل ہوئے ہیں۔"

ریبنے کو ایسا محسوس ہوا جیسے مارتھا نے یہ الفاظ شرم و حیا میں ڈوب کر ادا کئے ہیں اور بات کے ختم ہوتے ہوتے اس کے چہرے پر شرم و حیا کی سرخی دوڑ گئی ہو گی۔

ریبنے کی مایوسی پھر عود کر آئی، افسردہ لہجے میں کہا۔ "مارتھا! تمہاری آواز اور تمہارے اس سراپے سے، جو ماں نے کھینچا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نوجوان بھی ہو اور حسین بھی، اور یہ دونوں چیزیں شاید تمہیں بھی اس کی اجازت نہ دیں، کہ میرے جیسے بدصورت اور مکروہ شکل کے انسان کو دیکھو۔"

مارتھا نے نرم لہجے میں جواب دیا "معلوم نہیں۔ تمہیں اپنی بدصورتی کا اتنا شدید احساس کیوں ہے۔ حالانکہ چند معمولی داغ دھبوں سے کسی کی شکل نہیں بگڑ جاتی۔"

ریبنے کو مارتھا کی بات کا یقین نہ آیا۔ اس نے حیرت سے پوچھا "کیا تم میرے جھلسے ہوئے چہرے کو بغور دیکھ چکی ہو؟"

مارتھا نے جواب دیا "ایک بار نہیں۔ کئی بار۔ بارہا جب تم ڈرائنگ روم میں خاموش بیٹھے ہوتے ہو تو میں تمہارے قریب ہی موجود تمہیں دیکھتی رہتی ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ تم میری موجودگی کو آج تک نہ محسوس کر سکے۔"

ریبنے کی مایوسی طمانیت میں بدلنے لگی "کیا سچ مچ تم جو کچھ کہہ رہی ہو درست ہے اور تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے"

"نہیں!" مارتھا چیخ پڑی۔ اس کے لہجے میں اچانک شدت پیدا ہوگئی "میں تم سے اظہارِ افسوس یا اظہارِ ہمدردی ہرگز نہیں کر رہی ہوں۔"

آتنا کہہ کر مارتھا بھاگ گئی لیکن اس کے بعد ریتے ہر روز ہی سیر و تفریح کے لئے اس باغ میں بیٹھنے لگا اور کسی کسی وقت کبھی کبھی یہاں مارتھا سے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ دونوں میں باتیں ہوتیں، ایک دوسرے کی مزاج پرسی کی جاتی۔ پھر یہ اتفاقیہ ملاقاتیں، باقاعدہ ملاقاتوں میں تبدیل ہوگئیں۔ مارتھا کی قربت اور اس کی ہمدردی آمیز طرزِ تکلم نے ریتے کے خفتہ جذبات میں ایک آگ سی لگادی۔ امنگیں بیدار ہوگئیں اور حوصلے پیر نکالنے لگے۔ جھلسی ہوئی شکل کا شدید اور ہمہ وقتی احساس زائل ہونے لگا اور زندگی میں ایک بار پھر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کسی بھی طرح مارتھا کے دل کو ضرور جیتنا چاہیئے۔ وہ ہاتھوں سے ٹٹول کر مارتھا کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن ابھی تک ایسا ممکن نہ ہوا تھا۔ ماں بھی ریتے کی اس تبدیلی کو مسرت آمیز جذبوں سے محسوس کر رہی تھی۔ ماں کو اس بات کی بیحد خوشی تھی کہ ریتے کھانے کی میز پر اب باقاعدگی سے آنے لگا تھا۔ اب مارتھا اس کی محبوبہ بن چکی تھی۔ وہ مارتھا جس نے اسے پہلی بار نہایت محبت آمیز لہجے میں یہ یقین دلایا تھا کہ تم اس حد تک بدشکل نہیں ہو جتنا محسوس کرتے ہو۔

دونوں پروگرام کے مطابق روزانہ شام کو لوگوں کی نظروں سے بچتے بچاتے باغ میں پہنچ جاتے اور آپس میں پیار و محبت کی باتیں کرتے رہتے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ریتے مارتھا کی جدائی کو لمحہ بھر کے لئے بھی برداشت نہ کر سکتا۔ اسے مارتھا سے والہانہ عشق ہوگیا تھا۔ وہ عشق نہیں جس کا دوسرا نام بوالہوسی ہے۔ اس عشق میں خلوص تھا، جنون تھا اور شدت کا کرب اور ریتے جیتنی تھی۔ مارتھا اس کے دل کی دھڑکن اور خیالات کی آخری سہارا بن چکی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اب مارتھا کو اس سے منسوب کر دیا جائے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن ماں پر اس کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے آخر ایک دن اس نے ماں سے کہہ ہی دیا "ماں میں مارتھا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

لیکن ماں نے اس کا کوئی خاص جواب نہ دیا۔ اور دوسرے دن کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی مارتھا اس کے کمرے میں نہیں پہنچی۔ وہ دیر تک ہجر و فراق کی اذیتیں جھیلتا رہا لیکن بات جب برداشت سے باہر ہوگئی تو وہ اٹھا اور راستہ ٹٹولتا ہوا کمرے کے زینے سے نیچے اترا۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اُسے کسی کی سرگوشیاں سنائی دیں۔ آوازیں مانوس تھیں۔ وہ رک گیا اور سرگوشیوں پر اپنے کان لگادیئے۔ یہ آوازیں اس کی ماں اور مارتھا کی تھیں۔ ان دونوں میں کسی مسئلے پر گرماگرم بحث ہو رہی تھی۔ مارتھا کے لہجے میں سختی تھی۔ درشتی اور ریتے مرتی تھی اور ماں کے لہجے میں التجا، لجاجت اور خوشامد تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مارتھا اس کی ماں کو دھمکیاں دے رہی ہو اور ماں خوشامدیں کر رہی ہو۔ ماں کہہ رہی تھی "مارتھا! تم خدا کے لئے مجھے کم از کم ایک ماہ کی مہلت ضرور دو۔"

مارتھا نے سختی سے جواب دیا۔ "نہیں میں اتنی مہلت نہیں دے سکتی۔"

"مارتھا!" ماں نے اور زیادہ خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "تم مجھے اتنا وقت تو دو کہ میں اپنے بیٹے ریتے کو اس صدمۂ جانکاہ سے بچانے کی کوئی تدبیر سوچ سکوں۔ تمہاری سفاکانہ بے رخی اسے پاگل کر دے گی۔ مارتھا تم دولت کی فکر نہ کرو، تمہیں جتنی دولت، جتنا روپیہ درکار ہو مجھے بتاؤ۔ میں دوں گی میں تمہیں مالا مال کر دوں گی، میں اپنے بیٹے کی خوشیاں اور

سکون کسی بھی قیمت پر خریدنے کو تیار ہوں۔ بولو تمہیں کتنی رقم درکار ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں" مارتھا کی آواز لہرائی "میں ایسا کسی قیمت پر نہیں کر سکتی۔ میں لاکھ پیشہ ور بدکار سہی، لیکن میں تیرے مکروہ صورت بیٹے رینے کی دائمی یا ایسی عارضی قربت کا تصوّر تک نہیں کر سکتی جس میں اسے میرے چہرے کے وحشیانہ بوسے لینے کا موقع ملے۔ میں اس سے ہم آغوش ہونے کا خیال تک نہیں کر سکتی۔"

پھر ایسا محسوس ہوا جیسے ماں نے مارتھا کے منہ پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے ہوں۔

"مارتھا! خدا کے لئے چپ ہو جاؤ" ماں کی آواز سنائی دی "میں نے تمہیں تمہاری جن خدمات کا اب تک معاوضہ دیا ہے۔ تمہاری اس جلد بازی سے سارا اکارت جائے گا" پھر دفعتًہ ماں کے لہجے میں درشتی پیدا ہو گئی "میں ایک شریف عورت ہوں۔ میں نے تمہارے غلیظ اور ناپاک وجود کو صرف اس لئے اپنے گھر میں گوارا کیا تھا کہ اس ترکیب سے میرے رینے کی زندگی بچ جائے گی، اس کی مایوسیاں دور ہو جائیں گی اور احساسِ بے چارگی دل سے نکل جائے گا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں تمہیں اپنے گھر میں نہ لاتی۔ تو میرا رینے زندگی کی بے کیفی سے اکتا کر خودکشی ضرور کر لیتا" اور ماں کے لہجے میں پھر التجا اور خوشامد کا عنصر شامل ہو گیا "مارتھا! خدا کے لئے مجھ پر رحم کھاؤ اور مجھے مایوس نہ کرو"

لیکن مارتھا کے پاس ایک ہی جواب تھا "میں مجبور ہوں میں اب کسی قیمت پر بھی اس جھلسی شکل انسان کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے"

ماں نے اپنی التجا میں ذرا سی ترمیم کر دی "اچھا ایک ماہ تک نہیں تو چند دنوں کے لئے تو ٹھہر سکتی ہو؟ مارتھا! اب اور ضد نہ کرنا۔ یہ قیمتی بروچ جو اصلی ہیرے کے ہیں، اور رینے کے باپ کی یادگار ہیں، میں تجھے انعام میں دیتی ہوں بس چند دن اور ٹھہر جاؤ"

مارتھا راضی ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنے عاشق کے کمرے میں داخل ہوئی تو کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُسے کچھ حیرت بھی ہوئی۔ مارتھا نے اندھیرے میں رینے کو مخاطب کیا "رینے! میرے دوست! معاف کرنا مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ کیا تم میرا انتظار کر رہے تھے؟" مارتھا کے لہجے میں بے چینی اور اضطراب تھا۔

لیکن اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ مارتھا اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہوئی رینے کے بستر کی طرف بڑھی لیکن کمرے کے بیچ میں کسی بھاری چیز سے ٹکرا کر لڑکھڑا گئی۔ مارے دہشت کے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ یہ چیخ سن کر ماں بھی دوڑ پڑی۔ ماں نے موم بتی روشن کی اور اس روشنی میں جب ان دونوں کی نظریں فرش پر گئیں تو ایک دلدوز اور خوفناک نظارہ ان کے سامنے تھا۔ رینے کی لاش خون میں لت پت ان کے سامنے تھی۔ اس کی گردن اور شہ رگ پر استرے کے کئی زخم موجود تھے، جن سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور کمرے کا فرش گلنار ہو رہا تھا۔

رینے کی ماں لاش پر گر گئی اور اپنی دلدوز چیخوں سے کمرے کو ہلا دیا۔ عین اس وقت جب وہ اپنے لہولہان بیٹے کی لاش سے چمٹ کر آہ و بکا کے ساتھ ساتھ اس کے بوسے لے رہی تھی۔ مارتھا قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی اطمینان کی انگڑائی لے رہی تھی۔ اس وقت اسے صرف یہ افسوس تھا کہ اندھیرے میں رینے کی لاش سے ٹکرا کر لڑکھڑا جانے سے اس کے کپڑے خراب ہو گئے اور اس کے دلکش لباس کو رینے کے خون نے گندہ کر دیا تھا۔

محمد اسلم شاہ





ولیم سمرسٹ ماہم ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے اور دس سال کی عمر تک پیرس ہی میں رہے کنٹربری کنگ اسکول میں انہوں نے رسمی تعلیم کے بعد ہیڈل برگ یونیورسٹی میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ پھر انہوں نے سینٹ تھامس ہاسپٹل میں دواؤں اور علاج معالجے کا علمی تجربہ حاصل کرلینے کے لئے داخلہ لے لیا لیکن ان کا دل اس پیشے میں نہ لگا۔ ۱۸۹۷ء میں اپنے پہلے ناول کی غیر معمولی کامیابی کے بعد انہوں نے خود کو تحریر کے لئے وقف کردیا۔ ساری عمر ناول افسانے لکھنے میں گزار دی ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۹ء میں دو ناولوں کی بے مثال مقبولیت کے بعد ان کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہونے لگا۔ انہوں نے یادگار ڈرامے لکھے جو لندن کے اسٹیج پر پورے اہتمام کے ساتھ پیش کئے گئے اسی زمانے میں برنارڈ شا کے ڈرامے دھوم مچاتے ہوتے تھے۔

۱۹۲۱ء میں اُن کی مختصر کہانیوں کا پہلا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ ان کی تقریباً تمام کہانیوں کا ترجمہ دنیا کی دوسری زبانوں میں ہوچکا ہے۔

۱۹۶۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ماہم کا قلم انسان کی متنوع اور متضاد نفسی کیفیتوں کی بہت خوب عکاسی کرتا ہے۔ انہوں نے تاثر انگیز کہانیاں لکھی ہیں۔ ایسی کہانیاں جو قاری پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں جنہیں لوگ مدتوں نہیں بھول پاتے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مارچ ۷۱ء کے سب رنگ میں ان کی ایک معرکہ آرا کہانی ناقابل تسخیر شائع ہوئی تھی، اب اس ماہ ان کی ایک اور کہانی شائع کی جا رہی ہے دیکھئے ـــ ماں کے کردار کو انہوں نے کس انداز اور کس تیور سے پیش کیا ہے۔

دوسری ماں کی کہانی

یہ ایک چھوٹی سی دو منزلہ عمارت تھی جس کے چاروں طرف آہنی سلاخوں کا جنگلا بنا ہوا تھا۔ عمارت کے آگے کمپاؤنڈ میں کچھ بچے کھیل میں مصروف تھے، آرام کرسی پر بیٹھا ایک بوڑھا پائپ کے مزے لے رہا تھا۔ بڑے گیٹ پر ادھیڑ عمر کی عورت کسی قلی سے پیسے کے لین دین کے سلسلے میں بحث کر رہی تھی، وہ کچھ زیادہ طلب کر رہا تھا اور وہ مسلسل انکار کر رہی تھی۔ اُوپر کھڑکی سے دو عورتیں تقریباً اپنے نصف جسموں کو باہر نکالے ان کی باتیں سُن رہی تھیں۔ اس عمارت کے مکینوں کی یہی سب سے اچھی اور بُری عادت تھی جہاں وہ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہوتے وہیں بلاتکلف دوسروں کے ذاتی معاملات میں بھی مداخلت سے باز نہ آتے تھے۔

”کیا تم مجھے مزید ایک پینی بھی نہ دو گی؟“ قلی نے تنگ آکر کہا اور پیسے لے کر چلا گیا۔ اس نے جاتے جاتے قلی کو گندی سی گالی دی اور پھر سامان اٹھا کر اپنے فلیٹ میں رکھنے لگی، اس نے آج ہی یہ فلیٹ کرائے پر لیا تھا۔

”صورت کی کیسی منحوس لگتی ہے یہ۔ بالکل قاتلوں کی سی شکل ہے۔“ کھڑکی میں کھڑی ہوئی ایک عورت نے دوسری سے کہا۔ اس وقت ایک نوجوان لڑکی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

”تم نے اسے دیکھا روزالیا؟“ اس کی ماں نے اُوپر ہی سے پوچھا

”میں نے قلی سے پوچھا تو وہ کہہ رہا تھا کہ وہ تمام سامان ٹرانیا سے لایا ہے۔ یہ وہاں لاکیچر اکے نام سے مشہور رہی ہے۔“ روزالیا نے سیڑھیوں پر سے جواب دیا۔

وہ عورت پھر کمرے سے باہر نکلی اور باقی سامان بھی اندر لے گئی

لاکیچرا کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ دُبلی پتلی طویل قامت۔ پتلی پتلی انگلیوں والے ہاتھ جیسے کسی باز کے پنجے، اس کے گال اندر کو پچکے ہوتے تھے اور جھُرّی دار چہرہ خاصا زرد ہو رہا تھا۔ اس کے سیاہ بال اُلجھے ہوتے تھے اور سیاہ آنکھوں کی چمک دیکھ کر خوف آتا تھا۔ اس کی شخصیت کچھ ایسی پُراسرار تھی کہ پڑوسیوں کا تجسّس بڑھتا ہی جاتا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ بہت غریب ہے اس کے لباس ہی سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی۔ وہ روزانہ صبح چھ بجے اپنے فلیٹ سے نکلتی اور رات گئے واپس لوٹتی۔ باوجود کوشش کے وہ لوگ یہ معلوم نہ کر سکے کہ وہ اپنی گزربسر کے لئے پیسے کہاں سے حاصل کرتی ہے۔ انہوں نے ایک شناسا پولیس والے کو بھی اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ لاکیچرا کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔

"جب تک وہ قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتی میں اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا۔" اس نے روکھے پن سے جواب دیا تھا۔

مگر اپنی عادت سے مجبور ان لوگوں نے لاکیچرا کے ماضی کو کرید ہی ڈالا۔ اوپری منزل میں رہنے والے ایک دکاندار نے بتایا کہ لاکیچرا صرف ایک ماہ قبل جیل سے رہا ہوئی تھی جہاں اس نے قتل کے جرم میں سات سال قید کی سزا کاٹی تھی۔ وہ اس عمارت میں آنے سے پہلے ٹریانا میں رہتی تھی۔ محلے کے بچے اسے پاگل سمجھ کر تنگ کرتے تھے اور پتھر مارنے سے بھی باز نہ آتے تھے۔ کبھی کبھار وہ ایک آدھ بچے کی پٹائی بھی کر دیتی تھی۔ بہرحال محلے میں ایک طرح کی بدمزگی پیدا ہو گئی تھی تب اس کے مالکِ مکان نے اسے مکان چھوڑ دینے پر مجبور کیا اور وہ ایک صبح ٹریانا سے غائب ہو گئی تھی۔

"لیکن اس نے قتل کسے کیا تھا؟" روزالیا نے بےچینی سے پوچھا

"لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس کا محبوب تھا۔" دکاندار نے سگریٹ کا دھواں روزالیا کے حسین چہرے پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

"بھلا اسے بھی کوئی پسند کر سکتا ہے؟" روزالیا نے تمکنت سے کہا

"خدا کی پناہ! بوڑھے شخص نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ "اب وہ یہاں کسے قتل کرنے آئی ہے؟"

"میں نے تو پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ اس کی شکل قاتلوں جیسی ہے۔" روزالیا کی ماں نے کہا۔

اسی وقت لاکیچرا دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر واپس لوٹی تو تمام لوگوں پر سکتہ سا ہو گیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے اسے بہت سی آنکھیں گھورتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے ایک نظر ان لوگوں پر ڈالی۔ دکاندار نے کہا۔

"شب بخیر میڈم۔"

"شب بخیر!" وہ رسمی جواب دیتی ہوئی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اندر داخل ہو کر اس نے دروازے کا تالا بھی بند کر دیا۔ اب پھر آہستہ آہستہ سرگوشیاں ہونے لگیں۔

"توبہ ہے، کیسی شیطانی صورت ہے۔" روزالیا نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم قریب ہی رہتے ہو۔" روزالیا کی ماں نے پولیس والے سے مخاطب ہو کر کہا۔

لاکیچرا نے اب تک کوئی مشکل کھڑی نہیں کی تھی، اسے اس عمارت میں رہتے ہوئے خاصے دن ہو گئے تھے اور اب تک حالات معمول کے مطابق تھے۔ نہ تو اس نے ان لوگوں سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی اور نہ ہی ایسی کسی کوشش کی حوصلہ افزائی کی۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے اس میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ لیکن ایک واقعے نے پھر لوگوں کا تجسّس اور دلچسپی تازہ کر دی۔ ایک نوجوان نے عمارت کے گیٹ پر کھڑے ہو کر پہلی منزل کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی موٹی سی خاتون سے کہا۔

"یہاں کوئی انٹونیا سانچس رہتی ہیں؟"

"اس نام کی تو یہاں کوئی بھی خاتون نہیں رہتیں۔"

ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں جب کئی مقرر پُرجوش تقریریں کر چکے تو منتظمین نے نشے میں دُھت مجاز کو مجبور کیا کہ وہ بھی تقریر کریں۔ مجاز نے انکار کیا۔ لوگوں نے انھیں زبردستی کھڑا کر دیا، اور سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا "حضرات! اب آپ کے سامنے مجاز صاحب کچھ ارشاد فرمائیں گے۔"
مجاز نے چند جملوں میں اپنی تقریر ختم کر دی "حضرات! آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے باپ دادا جھونپڑوں میں رہتے تھے اور محلوں کے خواب دیکھتے تھے لیکن اب چونکہ زمانہ بدل چکا ہے اس لیے ہم لوگ محلوں میں رہ کر جھونپڑوں کے خواب دیکھنے لگے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ یہیں رہتی ہیں، لوگ انہیں لاکیچرا کے نام سے جانتے ہیں!" نوجوان نے کہا۔

"اچھا اچھا۔ ارے تم اس کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔" اب روزالیا بھی سیڑھیوں کے قریب پہنچ چکی تھی، اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ "ہاں وہ یہیں رہتی ہے۔ وہ رہا اس کا فلیٹ۔" روزالیا نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اس کی نظریں نوجوان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"شکریہ" نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ اس نے ایک ہی نظر میں روزالیا کے دلکش خدوخال اور شادابی و شگفتگی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ روزالیا اور وہ عورت متجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آخر یہ کون ہوسکتا ہے؟" موٹی عورت نے روزالیا سے پوچھا "لاکیچرا کے پاس اس سے پہلے تو کوئی مرد نہیں آیا تھا۔"

نوجوان نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔

"ماں!۔۔۔ ماں!!" اس نے زور سے کہا۔۔۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔

"کورنیٹو! میری جان" اس نے بڑھ کر نوجوان کو سینے سے لگا لیا اور خوب بھینچ کر پیار کرنے لگی۔ وہ کبھی نوجوان کے ماتھے کا بوسہ لیتی کبھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی۔ روزالیا اور وہ عورت پھٹی پھٹی آنکھوں سے لاکیچرا کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس عورت کے سینے میں بھی محبت کرنے والا دل ہوسکتا ہے۔ وہ اب سسکیاں لینے لگی تھی۔ اس نے اسے کمرے میں گھسیٹ لیا۔

"حیرت ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اتنا شاندار نوجوان اس بدصورت عورت کا بیٹا ہوسکتا ہے!" روزالیا برآمدے میں پہنچ گئی تھی اس کی ماں بھی پہلو میں کھڑی ہوئی تھی۔

کورنیٹو اپنی ماں کی طرح دُبلا پتلا اور طویل قامت تھا۔ اس کا رنگ کافی کھلا ہوا اور بال خوبصورتی سے تراشے ہوتے تھے۔ وہ خاصا خوش لباس اور وجیہہ شخصیت کا نوجوان تھا۔۔۔ اس کی آمد کی خبر عمارت کے تمام مکینوں کو لمحے بھر میں معلوم ہوگئی۔

بالآخر اس کے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور وہ اپنے بیٹے کا بازو تھامے ہوتے باہر نکلی۔

"اگلے اتوار کو پھر آؤ گے نا؟"

"ہاں اگر موقع ملا تو" اس نے خلوص سے جواب دیا اور پھر اس نے دُور کھڑی ہوئی روزالیا پر ایک نظر ڈالی۔ اس نے ماں سے اجازت لینے کے بعد اشارے سے روزالیا کو بھی الوداع کہا۔ روزالیا نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔ لاکیچرا کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہی اس کی مسکراہٹ یکسر غائب ہوگئی۔ لاکیچرا غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔

"کیا وہ تمہارا بیٹا ہے؟" روزالیا کی ماں نے پوچھا۔

"ہاں میرا بیٹا ہے" اس نے حقارت سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے فلیٹ میں چلی گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کے ضبط کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسے کورنیٹو سے بے انتہا محبت تھی۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہ تھی۔

"کیا وجیہہ اور خوش شکل نوجوان ہے!" روزالیا نے کورنیٹو کے

بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور بعد کے دو تین دنوں تک وہ گاہے گاہے اس نوجوان کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔

لاکیچرا کو پوری دُنیا میں اب صرف اپنے بیٹے سے محبّت تھی۔ یہی اس کا واحد سہارا تھا۔ اس کی بے انتہا محبت میں حسد اور رقابت کے جذبے بھی شامل ہو گئے تھے اور وہ کورنیٹو سے بھی ایسی ہی محبّت کی طالب تھی جیسی وہ اس سے کرتی تھی۔ وہ اُسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی مگر اس کی پیشہ ورانہ مصروفیات اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ وہ یہ خیال بھی برداشت نہ کر سکتی تھی کہ کورنیٹو کسی اور شخص یا کسی لڑکی میں دلچسپی لے۔ اس نے کورنیٹو سے بارہا معلوم کیا تھا کہ وہ کسی لڑکی سے محبّت تو نہیں کرتا۔ اس کے مسلسل انکار پر وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ اسے ایک طرح کا سکون میسّر آیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے سے بلا شرکتِ غیرے محبّت کرنا چاہتی تھی۔ اپنی محبت کی اس میراث پر اسے بے حد ناز تھا۔

جب اس نے کورنیٹو کو روزالیا کی طرف زیادہ متوجہ پایا تھا اور روزالیا کے چہرے پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ دیکھی تھی تو اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا تھا۔ اسے اپنے پڑوسیوں سے یوں بھی نفرت تھی۔ وہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے اور انہیں اس کے ماضی کا علم ہو گیا تھا۔ اب وہ اس سے اس کے بیٹے کو چھیننا چاہتے تھے۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب خیالات جنم لے رہے تھے۔ ایک بار پھر ان تلخیوں نے اسے مضطرب کر دیا۔

اگلی اتوار دوپہر ہی سے وہ گیٹ کے قریب ایک کُرسی بچھا کر بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی یہ حرکت نہ کی تھی۔

”تمہیں معلوم ہے کہ وہ وہاں کیوں بیٹھی ہے؟“ روزالیا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ پھر خود ہی جواب بھی دیا۔

”ارے اِس کا لاڈلا آنے والا ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ ہم میں سے کوئی بھی اس سے مل سکے۔“

”شاید وہ پاگل یہ سمجھتی ہے کہ ہم اس کے بیٹے کو کھا لیں گے؟“

فراق گورکھپوری کو ٹرین میں ایک پارسی قدردان ملا، اسے فراق کا کلام بہت پسند تھا۔ جب وہ فراق صاحب سے جدا ہونے لگا تو اس نے فراق صاحب سے ان کا پتا پوچھا ـــــ وہ دوبارہ گھر پر ملنے کا خواہش مند تھا۔

فراق نے اس سے پوچھا ”تمہارا نام کیا ہے؟“

پارسی نوجوان نے جواب دیا ”فیروز مہتہ دارو والا۔“

فراق صاحب نے سنجیدگی سے کہا ”جب تم الٰہ آباد پہنچنا تو اسٹیشن پر کسی کو بھی اپنا نام بتا کر میرا پتا پوچھ لینا، تمہارے نام کا جزو 'دارو والا' تمہیں بہ آسانی میرے گھر تک پہنچا دے گا۔“

روزالیا کی ماں نے کہا ـــــ

جیسے ہی کورنیٹو پہنچا اس کی ماں اسے بازوؤں سے پکڑ کر تیزی سے اپنے کمرے میں لے گئی۔

”یہ تو رقابت والی بات ہوئی جیسے وہ اس کا بیٹا نہیں کوئی ـــ“ موٹی عورت نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ روزالیا نے بند دروازے کی طرف دیکھا اور ایک شوخ قہقہہ بلند کیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھری جیسے اس کے ذہن پر کوئی شرارت سوار ہو۔ اس نے سوچا، کورنیٹو سے بات کرنے میں بڑا مزہ آئے گا۔ اسے لاکیچرا کو تنگ کرنے کے خیال سے مزا آ رہا تھا۔ وہ گیٹ ہی کے قریب ایسی جگہ بیٹھ گئی جہاں سے انہیں اس کے سامنے سے ہو کر گزرنا پڑتا۔ وہ دونوں باہر نکلے۔ لاکیچرا کی نظر جونہی اتفّاقاً روزالیا پر پڑی وہ روزالیا اور کورنیٹو کے درمیان آ گئی ـــ وہ نہیں چاہتی تھی کہ روزالیا کی کوئی نظر کورنیٹو پر پڑے۔ روزالیا نے کاندھے جھٹکے۔

”شکست مجھے کبھی نہیں ہوتی اور میں اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں۔“ روزالیا نے خود سے کہا۔

آئندہ ہفتے جب لاکیچرا نے دوپہر کے وقت گیٹ پر اپنا مورچہ سنبھال لیا تو روزالیا ٹہلتی ہوئی عمارت سے باہر نکلی اور

اس جانب چل دی جہاں سے کوریٹو کے آنے کی توقع تھی۔ کچھ ہی دیر بعد کوریٹو آتا دکھاتی دیا۔ اس نے دانستہ اسے نظر انداز کر دیا۔

"ارے سنو!" اس نے روزالیا کو جھجکتے ہوئے پکارا۔

"کیا ہے — ارے تم — میں تو سمجھتی تھی کہ تم مجھ سے بولتے ہوئے ڈرتے ہو!" روزالیا نے ایک ادا سے کہا۔

"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"جھوٹ — اپنی اماں سے بھی نہیں؟" وہ جملہ کہہ کر آگے بڑھنے لگی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

"تمہیں کیا مطلب — جاؤ تم اپنی ماں کے پاس جاؤ ورنہ وہ تمہیں مارے گی۔ میں نے دیکھا ہے جب وہ تمہارے ساتھ ہوتی ہے تو تمہاری کیا حالت ہوتی ہے۔ تم ایک نظر اِدھر اُدھر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" کوریٹو نے بیزاری سے کہا — روزالیا اس کی طرف توجہ کئے بغیر آگے بڑھ گئی۔

شام کو جب کوریٹو اپنی ماں کے ساتھ باہر نکل رہا تھا تو روزالیا کمپاؤنڈ ہی میں کھڑی ہوئی تھی۔ کوریٹو نے اسے دیکھا تو ٹھٹک کر رُک گیا اور اسے الوداع کہا۔ لاکیچرا غصّے سے سُرخ ہو رہی تھی۔

"چلو کوریٹو" اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "تم رُک کیوں گئے؟"

وہ آگے بڑھ گیا۔ لاکیچرا ایک لمحے کے لئے روزالیا کے آگے ٹھہری جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے بمشکل تمام اپنی زبان پر قابو حاصل کیا اور پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔

کچھ دنوں بعد "سانتو اسردو" کا جشن تھا۔ عمارت کے مکینوں نے اپنے اپنے برآمدوں کے آگے چراغاں کیا۔ گرمیوں کی خاموش راتوں میں جگمگاتے قمقمے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ رات گئے لوگ کمپاؤنڈ میں جمع ہو گئے کرسیاں ایک دائرے کی شکل میں رکھ دی گئیں — عورتیں اپنے بچوں کو بہلا رہی تھیں اور بعض کی زبانیں قینچی کی طرح چل رہی تھیں۔ بوڑھے مرد پائپ سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ نوجوان رقص کی تیاریاں کر رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے جوڑے رقص کرنے لگے۔ موسیقی اپنے زوروں پر تھی تالیوں کی تھاپ پر اب بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں پُرجوش رقص میں مگن تھے۔ وہاں ہر کوئی موجود تھا۔ بس صرف لاکیچرا غیر حاضر تھی۔ اس کے کمرے سے موم بتی کی ہلکی ہلکی روشنی، کھڑکیوں کے دبیز شیشوں سے باہر چھلک رہی تھی۔

"اُس بدنصیب کا بیٹا کہاں ہے؟" ایک پڑوسی نے دوسرے سے پوچھا —

"اندر ہی ہوگا — ابھی ایک گھنٹے پہلے میں نے اسے اندر جاتے دیکھا تھا۔"

"وہ اندر خاصا لُطف اندوز ہو رہا ہوگا" روزالیا نے گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے کہا — اور اندر کمرے میں کوریٹو پیچ و تاب کھا رہا تھا — اس نے اپنی ماں سے کہا۔

"وہ لوگ رقص کر رہے ہیں!" اس نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ روزالیا نے غیر رسمی سا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر غازہ بہت نمایاں تھا۔ اس کے بالوں میں گلاب کا سُرخ پھول لگا ہوا تھا۔ وہ کوئی پری معلوم ہوتی تھی کوریٹو کو اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوتی — شاید اسپین میں لوگوں کو محبت بہت جلد ہو جاتی ہے۔ وہ کئی روز سے اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بے اختیار وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" لاکیچرا نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں ان کا رقص دیکھنا چاہتا ہوں — ابھی آ جاؤں گا!" کوریٹو نے کہا۔

"جھوٹ مت بولو، یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم روزالیا سے ملنے جا رہے ہو۔" اس نے بڑھ کر اس کا راستہ روکنا چاہا مگر وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور رقص دیکھنے والوں کی صف



آج کا دھیان کل کی امان !

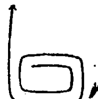
آج کھیل، کل حقیقت ۔ آج کی بے بی، آئندہ نسل کی نگہبان ۔ آئندہ نسل کی امان اسی میں ہے کہ لڑکیاں اچھی تعلیم و تربیت پائیں ۔

روپے کی ضرورت بجا! کیوں نہ بچت کیجئے۔ یو بی ایل میں اکاؤنٹ کھولئے۔

یو بی ایل کی ۵۵۰ سے زائد شاخوں اور جدید ترین سہولتوں کے ساتھ ملکی اور بین الاقوامی بینکاری کے شاندار پیشکش 70's کے دور میں ترقی کی آئینہ دار ہے ۔ وطن اور ہم وطنوں کے لئے خوشحالی کا پیغام ہے ۔

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

مقصد ترقی، منزل ترقی



PROGRESSIVE UBL

UBL. 16. 193. 70-UD.

LINTAS

میں شامل ہوگیا۔ لاکیچرا نے دو قدم آگے بڑھاتے پھر کچھ سوچ کر رُک گئی۔

"تم ڈر تو نہیں رہے؟" روزالیا رقص کرتی ہوئی قریب سے گزری۔ وہ خود کو کسی آزاد تتلی کی طرح سمجھ رہی تھی۔ وہ رقص کرتی رہی جب موسیقار دُھن بدل رہے تھے تو روزالیا، کوریٹو کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔

"تمہیں رقص کرنا آتا ہے؟"

"ہاں۔"

"تو پھر کھڑے کیوں ہو ـــ آؤ میرا ساتھ دو۔" اس نے ہاتھ بڑھایا کوریٹو کچھ ہچکچایا، اس نے پلٹ کر ایک نظر اپنے کمرے پر ڈالی۔ اسے اپنی ماں کا چہرہ غصّے میں دانت پیستا ہوا محسوس ہوا۔ روزالیا نے فوراً اس کی دُکھتی ہوئی رگ کو چھوا "کسی سے ڈر لگ رہا ہے کیا؟"

"مجھے کس کا ڈر ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ رقص کے حلقے میں داخل ہوگیا۔ حاضرین اب زور زور سے تالیاں پیٹ رہے تھے، کوئی بہت تیز دُھن بجائی جا رہی تھی۔ روزالیا کوریٹو کی کمر میں اپنی باہیں ڈالے رقص کرتی رہی۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک دوسرے کے وجود میں محو ہو گئے۔ لاکیچرا تاریکی میں کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کے دانت بھینچے ہوئے تھے۔ اس کی نظریں ان دونوں کے چہروں پر جمی ہوئی تھیں۔ جب رقص ختم ہوا تو روزالیا نے کوریٹو کی بہت تعریف کی۔

لاکیچرا اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کوریٹو نے آ کر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا وہ بڑی دیر تک یونہی کھٹکھٹاتا رہا۔ آخر تھک ہار کر واپس چلا گیا لاکیچرا کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ اب ایک ہفتے بعد ہی اسے اپنے بیٹے کی شکل نظر آئے گی۔ ایک ہفتہ؟ اتنا طویل انتظار ـــ کیا وہ آ جائے گا؟

وہ سو نہ سکی اور ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ صبح وہ کام پر بھی نہ گئی اور روزالیا کی آواز کے انتظار میں لیٹی رہی جونہی اس نے روزالیا کی آواز سنی بجلی کی سُرعت سے دروازہ کھول کر باہر نکلی۔

"آخر تم میرے بیٹے کے پیچھے کیوں پڑی ہو؟"

"کیا مطلب؟" روزالیا کے چہرے پر عجیب و غریب تاثرات تھے۔ وہ اپنی کامیابی پر خوش بھی تھی اور اس غیر متوقع سوال پر حیران بھی ـــ

"تم میرا مطلب خوب جانتی ہو۔ تم اسے مجھ سے چھین لینا چاہتی ہو۔"

"تم سمجھتی ہو کہ مجھے تمہارا بیٹا چاہیئے؟ اسے مجھ سے دُور رکھو اگر وہ خود ہی میرے پیچھے پیچھے آتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے!" وہ چلّائی۔

"اُس سے پوچھ دیکھو۔" روزالیا نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ گھنٹوں میرے انتظار میں کھڑا رہتا ہے۔ تم اسے اپنے پاس روک کر کیوں نہیں رکھتیں؟"

"تم جھوٹی ہو ـــ بہت بڑی جھوٹی ـــ تم خود اس کے راستے میں آتی ہو۔"

"مجھے اگر کسی مرد کی ضرورت ہو تو کسی کے پیچھے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔" روزالیا نے اپنے جسم پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں ایسی بُری بھی نہیں، مجھے بہت سے لوگ قریب لانا چاہتے ہیں، پھر میں کسی قاتلہ کے بیٹے کو کیوں اپنانے لگی؟" یہ سننا تھا کہ لاکیچرا کسی بھوکی شیرنی کی طرح روزالیا پر لپکی۔ اس نے روزالیا کے بال کھینچنے شروع کر دیئے، وہ درد اور خوف کی وجہ سے چیخیں مارنے لگی۔ باہر سے گزرنے والے دو تین راہگیروں نے ان دونوں کو علیحدہ کیا۔

"اگر اب بھی تم نے کوریٹو کا پیچھا نہ چھوڑا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی!" لاکیچرا نے دھمکی دی۔

"تم سمجھتی ہو کہ میں ان دھمکیوں سے ڈر جاؤں گی اگر تم اُسے مجھ سے دور رکھ سکتی ہو تو رکھ لو۔ تمہیں کیا معلوم کہ وہ مجھ سے محبّت کرتا ہے۔ تم سے بھی زیادہ!" روزالیا نے زور دیتے ہوئے کہا، وہ دوبارہ اس کی طرف جھپٹی مگر روزالیا صاف بچ گئی۔ راہگیروں نے اسے گھر بھیج دیا۔ لاکیچرا غصّے میں کانپتی ہوئی باہر گلی میں نکل کھڑی ہوئی۔

کورٹیو اب روزالیا کی محبّت میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ وہ دن بھر اس کے خیالوں میں مگن رہتا۔ وہ راتوں کو چھپ چھپ کر عمارت کے کمپاؤنڈ میں اس سے ملنے آتا اور گھنٹوں جنگلے سے ٹیک لگاتے وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے، انہیں لوہے کی سلاخوں کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوتا ـــ کورٹیو اپنی ماں کے غصّے کی وجہ سے اس سے ملنے نہیں گیا۔ وہ اس کے انتظار میں بُری طرح تڑپتی رہی۔ وہ سوچتی تھی کہ جب وہ آئے گا تو میں اس کے قدموں میں پڑ کر معافی مانگ لوں گی لیکن جب وہ نہ آیا تو پھر یہ محبّت نفرت میں تبدیل ہونے لگی ـــ

اسے کورٹیو سے اتنی شدید محبّت تھی کہ شاید اپنے محبوب سے بھی نہ رہی ہو۔ ایک ہفتہ گزر گیا مگر وہ نہ آیا۔ وہ یہ برداشت نہ کر سکی۔ اس نے ان تمام باتوں کا ذمہ دار روزالیا کو ٹھہرایا۔ آخر ایک روز کورٹیو ہمت کر کے اس سے ملنے آ ہی گیا۔ مگر اب اس کے انتظار کی حد ختم ہو گئی تھی، اس کا چہرہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بیوہ اپنے شوہر کی موت پر یا کوئی جوان عورت اپنے محبوب کی جدائی پر نوحہ خواں ہو۔ وہ جب اس کے ماتھے پر بوسہ دینے آگے بڑھا تو اس نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"تم اتنے دنوں کہاں رہے؟"

"تم نے مجھ پر دروازے بند کر دیئے تھے ... میں یہ سمجھا کہ اب تم مجھے نہیں چاہتیں!"

"کیا تمہارے نہ آنے کی یہی وجہ تھی ـــ کوئی اور وجہ تو نہ تھی؟" اس نے شک اور طنز کے ملے جُلے لہجے میں پوچھا۔

"میں کچھ مصروف تھا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"مصروف؟ تم جیسا شخص اور مصروف ـــ روزالیا سے چوری چھپے ملنے کے لئے آتے وقت تمہاری مصروفیت کہاں چلی جاتی ہے؟"

"تم نے اسے مارا کیوں تھا؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں نے اسے مارا ـــ یقیناً تم اس سے ملتے رہے ہو۔" لاکیچرا کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ "اس نے مجھے قاتل کہا تھا۔"

"تو کیا ہوا؟" کورٹیو نے کہا۔

"جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔" وہ زور زور سے چیخ رہی تھی "تم میرے بیٹے، یہ بات کہہ رہے ہو۔ اگر میں نے قتل کیا بھی تھا تو صرف تمہاری وجہ سے۔ میں نے سانٹی کو قتل کیا تھا کیونکہ وہ تمہیں مار رہا تھا۔ تمہاری وجہ سے میں نے اپنی زندگی جیل میں گزاری۔ بیوقوف تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔"

"تمہارے بتانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے سب معلوم ہے!" کورٹیو کے چہرے پر بلا کا عزم اور اعتماد تھا۔ لاکیچرا کو اس اعتماد سے ٹھیس پہنچی۔ وہ ہکا بکا اسے دیکھتی رہی پھر جیسے سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں میں نے تمہارے لئے کیا نہیں کیا۔ اب تم اس چھوکری کے لئے اپنی ماں کو چھوڑ رہے ہو، کیا تم سمجھتے ہو، میں سانٹی کو پسند کرتی تھی ـــ نہیں ـــ میں صرف تمہاری خاطر اس سے نباہ رہی تھی ـــ میں چاہتی تھی کہ تمہیں اچھا کھانے اور پہننے کو ملتا رہے۔ میں تمہاری وجہ سے اس سے ڈانٹ ڈپٹ سنتی اور اکثر مار بھی کھاتی تھی۔ میں نے اسے تمہاری ہی وجہ سے مار ڈالا ـــ میں صرف تمہارے لئے زندہ رہی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ قسمت یہ دن دکھائے گی تو میں زندگی پر موت کو ترجیح دیتی۔"

"آخر میں اب جوان ہو گیا ہوں۔ میرے بھی جذبات ہیں۔ اگر روزالیا سامنے نہیں ہوتی تو کوئی اور لڑکی ہوتی۔"

"مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم درندے ہو، نکل جاؤ یہاں سے!"
اس نے کوریٹو کو دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ کوریٹو نے پہلے لاپرواتی سے کاندھے جھٹک دیتے اور پھر دروازہ پٹختے ہوئے باہر نکل گیا۔

"تم سمجھتی ہو کہ میں یہاں رُکنا چاہتا ہوں!"

لاکیجرا اپنے کمرے میں ٹہلتی رہی۔ پھر کھڑکی پر کھڑی ہوگئی۔ باہر روزالیا کی ماں اور دوسرے لوگ کسی گفتگو میں مصروف تھے شاید وہ لوگ اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ ان کی طرف دانت پیس کر دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ لاکیجرا ابھی تک کھڑکی میں کھڑی ہوئی تھی۔

بڑے دروازے کو حرکت ہوئی اور روزالیا آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ لاکیجر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی اور روزالیا کے راستے میں کھڑی ہوگئی۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" روزالیا نے بے نیازی سے کہا۔ "میرا راستہ چھوڑو!"

"تم نے میرے بیٹے کو کیا کر دیا ہے؟"

"یہ تم اپنے بیٹے سے پوچھو کہ اسے کیا ہوگیا ہے اور مجھے جانے دو ورنہ میں ابھی چیخ چیخ کر سب کو بلاتی ہوں۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ تم ہر روز رات میں کوریٹو سے ملتی ہو؟"

"ہاں! ہاں!!" روزالیا چلاتی۔

"میں کہتی ہوں جواب دو!"

"خیر۔ اگر تم جواب سننے کے لئے مُصر ہو تو سنو۔ اسے مجھ سے محبت ہے، شدید محبت اور وہ مجھ سے شادی کرنے والا ہے جلد ہی اور ہاں میں بھی اسے چاہتی ہوں بے حد۔ سمجھیں۔"

لاکیجرا سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور روزالیا کہتی رہی "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تم ہم دونوں کے ذاتی معاملات میں کوئی رخنہ ڈال سکو گی۔ یہ تمہارا خیال ہے۔ اب وہ بات نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ وہ تم سے نفرت کرتا ہے۔ اس نے خود مجھ سے کہا کہ اسے تم سے نفرت ہے۔ وہ کہتا ہے کاش تم جیل سے کبھی واپس نہ آتیں۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ وہ یہ کہہ ہی نہیں سکتا۔" لاکیجرا کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے روزالیا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور دل شکستہ انداز میں گردن جھکا لی۔ روزالیا نے اس کی یہ حالت دیکھی تو نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں یقین نہیں آتا کہ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے سانٹی کو قتل کیا ہے اور سات سال جیل کی ہوا بھی کھاتی ہے۔ سننا چاہتی ہو تو سنو۔ وہ تمہارے مرنے کی دعا مانگتا ہے، سمجھیں۔" روزالیا کے لہجے میں تیزی، حقارت اور نفرت تھی۔ اس کی گفتار شعلہ بار تھی۔

"مجھ پر فخر کرو اے بدنصیب عورت کہ میں ایک قاتلہ کے لڑکے سے شادی کرنے پر رضامند ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اوپر جانے لگی۔ اسے جاتا دیکھ کر لاکیجرا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ بے تحاشا روزالیا کی طرف لپکی۔ وہ اس سے لپٹ گئی اور اس کو فرش پر گرا دیا اسی غضب اور طیش کے عالم میں اپنی کمر سے ایک چاقو نکالا اور روزالیا کے گلے کے پار کر دیا۔

"ہاں ۔۔۔ ماں ۔۔۔ بچاؤ ۔۔۔ میں میں۔" وہ کچھ دیر تڑپی اور پھر خاموش ہوگئی۔ خون کی دھار اس کی گردن سے نکل کر اب کمپاؤنڈ تک پہنچ گئی تھی۔ لوگوں نے دروازے کھول کر باہر جھانکا اور مدد کے لئے چلانے لگے۔ کچھ لوگوں نے بڑھ کر لاکیجرا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات نمایاں تھے۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس پہنچ گئی۔ دو سپاہیوں نے اسے ہتھکڑی پہنائی اور باہر لے جانے لگے۔ جب وہ روزالیا کی لاش کے قریب سے گزری تو کچھ دیر کے لئے رُکی، اس نے حقارت کی ایک نظر لاش پر ڈالی۔

"کیا یہ مر چکی ہے؟"

"ہاں۔" کسی نے جواب دیا۔

"خدا کا شکر ہے، میں اب مطمئن ہوں۔" اس نے کہا۔

حسینۂ دکن پربتھال



حسن کی کرشمہ سازیاں دُنیا کے خرمنِ امن پر ہمیشہ بجلی بن کر گرتی رہی ہیں۔ ذیل کا سچا تاریخی واقعہ بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ہندوستان کی مشہور تاریخ "تاریخ فرشتہ" سے اخذ کیا گیا ہے۔ اُردو کے مشہور ادیب مولانا عبدالحلیم شرؔر لکھنوی مرحوم نے اس مضمون کو پہلی دفعہ اپریل ۱۹۱۷ء کے 'دلگداز' میں شائع کیا تھا۔ یہ مولانا کا اپنا رسالہ تھا اور اس کی یہ منفرد خصوصیت تھی کہ رسالے کے سارے مضامین مولانا مرحوم خود لکھا کرتے تھے جنھیں لوگ انتہائی عقیدت و احترام سے پڑھتے تھے۔ زیرِ نظر مضمون "حسینۂ دکن پربتھال" کے رُومانی واقعے کو سپردِ قلم فرماتے ہوئے مولانا شرؔر مرحوم نے بطورِ تمہید لکھا تھا:

"یہاں (ہندوستان) مہ جبینوں کے حُسن کی کرشمہ سازیاں زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں فی الحال خرابی اور دُشواری یہ ہے کہ ہر معاملے میں مذہبی جانبداری اور تعصب پر محمول کر دیا جاتا ہے اور ہم مجبُور ہیں کہ یہاں کے اگلے دَور کی کسی حسینہ کے حالات لکھتے وقت ایسے الزاموں کی طرف سے بے پروا ہو جائیں۔ تاہم مندرجہ ذیل واقعات میں ہم نے اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ 'تاریخ فرشتہ' میں جو کچھ مذکور ہے اسے اپنے الفاظ میں ادا کیے دیتے ہیں۔"

'سبرنگ' کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے پاکستان میں پہلی مرتبہ مولانا شرؔر مرحوم کی 'لندن کی نایاب ڈائری' شائع کرنے کی عزت حاصل کی تھی اور اب ہم مولانا کی دُوسری حسین اور دلچسپ قلمی کاوش پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اساطینِ ادب کے دُرہائے نایاب ہمارے علمی سرمائے کا بیش بہا حصہ ہیں جن کا محفوظ رہنا ازبس ضروری ہے۔

(ادارہ)

دِنوں میں تجھے اس فن میں بے مثل و بے نظیر بنا دوں گا۔ اگر تو نے محنت سے سیکھا تو جس طرح تیری صورت موہنی اور تیری آواز سریلی ہے اسی طرح تیرا گانا بجانا بھی دنیا میں لاجواب ہو جائے گا۔"

پرتھال نے اس فن کے سیکھنے کا بے حد شوق ظاہر کیا۔ برہمن اپنے وعدے کے مطابق وہیں ٹھہر کر اسے گانا بجانا سکھانے لگا، اور ایک ہی سال میں اسے کامل مغنیّہ بنا کے کہا "اب تو اس قابل ہے کہ راجاؤں کے محل میں رہے، سوا کسی بڑے راجا کے اور کسی کا حوصلہ نہیں ہو سکتا کہ تجھے اپنی دلہن بنائے۔" یہ کہہ کے برہمن نے اس خاندان سے رخصت ہو کے اپنے گھر کی راہ لی۔

چند منزلیں قطع کرکے اپنے وطن بیجا نگر میں پہنچا۔ مگر پرتھال کی یاد کسی طرح نہ بھولتی تھی۔ جو ملنے آتا اس سے سب سے پہلے پرتھال کے حسن و جمال اور اس کی خوش گلوئی کی تعریف کرتا۔ اس کی زبان سے نکلتے ہی یہ خبر سارے بیجا نگر میں پھیل گئی اور ہر صحبت میں اس سنار کی بیٹی کی تعریف ہونے لگی۔ ہوتے ہوتے یہ خبر راجا دیو رائے کے کانوں تک پہنچی۔ اور وہ بہ مصداق ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

اس نازنین کے حسن و جمال کا تذکرہ سنتے ہی ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ اسی وقت اس برہمن کو بلا کے لڑکی کے حالات پوچھے برہمن نے ایسے عنوان سے اور ایسے الفاظ میں اس کا ذکر کیا کہ راجا کے عشق میں بے تابی و بے قراری پیدا ہو گئی اور برہمن سے خوشامد کرنے لگا کہ "اس سینے میں تم نے آگ لگائی ہے تو تم ہی اس کو بجھاؤ۔" بہت کچھ زر و جواہر دیا کہ اس کوشش میں صَرف کرو، پھر ایک سونے کا گلوبند دیا کہ اسے لے کے فوراً مدگل جاؤ اور اس کے ماں باپ کو میرا پیام دو، اور جس طرح بنے انھیں راضی کرکے منگنی کے طریقے سے یہ گلوبند اس کے گلے میں پہنا دو، اور یوں نہ مانے تو اسے بیجا نگر کے مندروں اور یہاں کے تیرتھوں کا شوق دلا کے کسی بہانے یہاں لے آؤ۔"

برہمن خوش خوش روانہ ہوا۔ پھر جا کے سنار کے گھر میں اترا۔ اور دو تین روز بعد اچھے عنوان اور دلفریب انداز میں شادی کا پیام دیا۔ پرتھال کے ماں باپ بہت خوش ہوئے۔ فوراً راضی ہو گئے۔ اور یہ سمجھ کے کہ اب پرتھال بھی ضرور راضی ہو جائیگی اس سے تذکرہ کیا۔ لڑکی نے سن کے ماں باپ سے کہا "کیا آپ کو بیجا نگر کے رنواس کا حال نہیں معلوم؟ اس میں ہزاروں عورتیں بھری ہیں اور جو اس میں گئی مر کے نکلی، اس راجا کی رانیاں لونڈیوں سے بدتر ہیں نہ ماں باپ سے مل سکتی ہیں اور نہ اپنے کسی عزیز قریب کی صورت دیکھ سکتی ہیں۔ ایسی زندگی بھر کی قید مجھ سے نہ برداشت ہو سکے گی، چاہے آپ کو میری محبت نہ رہی ہو یا میری طرف سے آپ کا لہو سفید ہو گیا ہو مگر میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

ماں باپ نے لاکھ سمجھایا مگر پرتھال نے منظور نہ کیا۔ آخر خود اس برہمن نے آکے اسے سمجھانا شروع کیا اور باتوں باتوں میں چاہا کہ گلوبند اس کے گلے میں ڈال دے مگر پرتھال نے سر ہٹا لیا اور کہا "گو میں آپ کو باپ سے بڑھ کر مانتی ہوں اور آپ کا ادب کرتی ہوں، مگر اس معاملے میں آپ اصرار نہ کریں میرا معاملہ ایک راز ہے جس کو میں نہ بیان کر سکتی ہوں اور نہ اس بارے میں کسی کے مشورے پر عمل کر سکتی ہوں۔"

یہ جواب سن کے برہمن نے اصرار شروع کیا کہ "جو کچھ راز ہو بتاؤ۔ اور اگر اس راز کے معلوم ہونے کے بعد یہ شادی مناسب نہ معلوم ہوئی تو میں ہرگز یہ صلاح نہ دوں گا کہ تم بیجا نگر کے راجا کی رانی ہو۔ مگر مجھے بتا دو۔"

آخر برہمن کے مجبور کرنے پر پرتھال نے کہا "سنیئے۔ مجھے مدت ہوئی ایک غیب کے فرشتے اور بڑے مہاتما نے خبر دی تھی کہ تو مسلمان ہو کے ملکۂ جہاں بنے گی، اور اپنے ہی ملک میں شان و شوکت سے رہ کے عیش کرے گی۔ وہ بات میرے دل میں جم گئی، مجھے یقین ہے کہ یہ پیش گوئی ضرور پوری ہوگی اور میں صبر و تحمل کے ساتھ بیٹھ کے

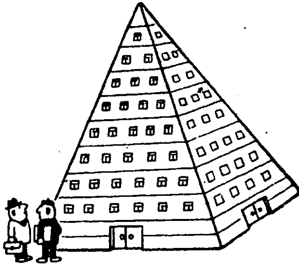
اس کے پورے ہونے کا انتظار کروں گی، مجھ سے جھوٹا وعدہ نہیں کیا گیا ہے، ہو کے رہے گا اور اس کے ہونے تک میں بیجانگر کے محل میں جاکے اپنی زندگی خراب نہ کروں گی۔"

اب برہمن نے پرتھال کے والدین کو بیجانگر کے درشنوں کا شوق دلانا شروع کیا مگر پرتھال ہرگز راضی نہ ہوئی اور اپنی ہی ضد پر اڑی رہی۔ چونکہ اس ملک میں مسلمانوں کی سلطنت تھی اور فیروز شاہ بہمنی کے ایسے پُرسطوت و باجبروت سلطان کا عہد۔ برہمن یا پرتھال کے ماں باپ کو اس کی جرأت نہ ہو سکی کہ اسے جبراً بیجانگر بھیج دیں۔ آخر برہمن نے ناکام و شکستہ دل واپس جاکے راجا سے سارا واقعہ بیان کر دیا اور کہا کہ "افسوس اس پر میرا کچھ زور نہ چل سکا۔"

ناکامی کا یہ جواب سُن کے راجا کی بے قراری و بے تابی نے جنون کی شان اختیار کرلی اور یہ حالت ہوگئی کہ وہ گھر میں چین پاتا نہ اسکا وزراء کے دربار میں دل لگتا تھا۔ آخر جتنی فوج بیجانگر میں موجود تھی اسے ساتھ لے کے شکار کے بہانے کوچ کیا۔ سرحدی دریائے تنگ بھدرا کے کنارے تک سفر کرتا ہوا چلا آیا، آگے دولت بہمنیہ کی قلمرو تھی اس لئے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ اور بغیر اس کے کہ قدیم معاہدوں کا لحاظ کرے یا اپنی حالت و قوت کا اندازہ کرے۔ ایک رات کو پانچ ہزار سوار دریا کے پار اتار دیئے اور باوجودیکہ تمام وزرا اور مشیرانِ سلطنت خلاف تھے، اُن سواروں کو حکم دیا کہ تم دوڑا دوڑ گھوڑے بڑھاتے ہوئے مضافات مدگل کے اس گاؤں تک چلے جاؤ جہاں میری محبوبہ پرتھال رہتی ہے۔ اس کے گھر پر اچانک حملہ کرکے اسے اپنی حراست میں لے لو اور فوراً پلٹ پڑو اور اسے لے کے ایسے اُڑو کہ تنگ بھدرا کے اس پار دم لو۔"

فوج والوں کو کیا عذر ہو سکتا تھا، بغیر اس کے کہ بہمنی سلطان اور اس کے عاملوں کو خبر ہونے پائے لگاتار منزلیں مارتے چلے گئے اور مدگل کے علاقے میں پہنچ کے دم لیا۔

خدا کی قدرت سوارانِ بیجانگر کی اس تاخت کی خبر اُن سے



نیا طرزِ تعمیر ایک کارٹونسٹ کی نظر میں

زیادہ تیز آگے اُڑتی چلی جاتی تھی۔ چنانچہ ان کے پہنچنے سے ایک دن پہلے مدگل کے سارے جوار میں مشہور ہو گیا کہ بیجانگر کے سوار لوٹتے مارتے چلے آتے ہیں۔ اور رعایا کے دل میں ایسی دہشت سمائی کہ وہ سب لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بھاگ گئے سب کے ساتھ پرتھال کا باپ سنار بھی تمام گھر والوں کو لے کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ اور راجا کی فوج نے جس کے ساتھ وہ برہمن بھی تھا بستی کے تمام گھر ڈھونڈ ڈالے مگر اس گل رخسار کا پتا نہ لگا جس کے شوق میں یہ سر دھڑ کا کھیل کھیلا گیا تھا۔ مجبوراً سب کے سب ناکام و نامراد واپس چلے۔ اور چونکہ ناکامی کا غصہ دلوں میں بھرا ہوا تھا اسلئے واپسی میں راستے کی بستیوں کو لوٹتے اور کشت و خون کرتے ہوئے تنگ بھدرا کے کنارے پہنچے۔

اس بے باکانہ تاخت کی خبر مدگل کے حاکم فولاد خاں کو ہوگئی جو سلطان فیروز شاہ کی جانب سے اس علاقے کا عامل تھا۔ اس نے فوراً تھوڑی سی اُس پاس کی فوج لے کے سوارانِ بیجانگر کا تعاقب کیا اور انھیں رگیدتا ہوا دریائے تنگ بھدرا تک چلا گیا جہاں تک پہنچتے پہنچتے دونوں حریفوں میں دو لڑائیاں ہوئیں۔ پہلی لڑائی میں فولاد خاں کو شکست کھا کے پسپا ہونا پڑا مگر دوسری لڑائی میں راجا کی فوج کو شکست ہوئی۔ چنانچہ اپنی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے ان کے بہت سے آدمی کٹ گئے اور وہ نامرادیوں کا رونا

روتے ہوئے دریائے مذکور کے پار اتر گئے۔

اب مخبروں نے اس ہنگامے کی خبر خود سلطان فیروز شاہ بہمنی کو پہنچائی وہ سنتے ہی آگ بگولا ہوگیا، راجا بیجانگر کی بدعہدی پر اُسے سخت غصہ آیا۔ اشتہارِ جنگ دے دیا اور فوراً ایک زبردست لشکر کے ساتھ کوچ کرکے تنگ بھدرا کے پار ہوا اور بیجانگر کی طرف لوٹتا مارتا ہوا چلا۔ راجا کو مزاحمت کی جراءت نہ ہوئی بیجانگر میں قلعہ بند ہوگیا۔ اور فیروز شاہ نے اس کے دارالسلطنت کا محاصرہ کرلیا۔ بہمنی شہر یار نے شہر پر پہنچتے ہی اتنا زبردست حملہ کیا کہ پہلی فصیل میں داخل ہوکے بیجانگر کے بعض محلوں کو لوٹنے لگا۔ لیکن یکایک بیجانگر کے کرناٹکی بہادروں نے اس طرح جان پر کھیل کے حملہ کیا کہ سلطان کی فوج کو فصیل کے پیچھے ڈھکیل دیا اور اس کے بعد شہر پر قبضہ کرنا نہایت ہی دشوار ہوگیا۔

بیجانگر کوئی معمولی شہر نہ تھا۔ علاوہ راجا کی بہادرانہ حمایت اور مدافعت کے قدرت نے اس کی مضبوطی یوں کر رکھی تھی کہ چاروں طرف بڑے بڑے پتھروں کی چٹانیں تھیں جنھوں نے حریف کے لئے راستہ نہایت ہی خطرناک کر دیا تھا۔ حریف جدھر سے یورش کرتا پتھر سدِ راہ ہوتے اور فصیل پر سے تیروں اور پتھروں کی مار اسے بالکل تباہ کر دیتی۔ راجا نے نکل کے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اور ساتھ ہی بہمنی لشکر پر فصیل پر سے تیروں کی بوچھار ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان کا لشکر سخت نقصان اٹھا کے پیچھے ہٹا اور سنگستانی زمین سے ہٹ کر سب نے کھلے میدان میں پڑاؤ ڈالا لیکن محاصرہ اسی طرح قائم رکھا اب راجا اپنا لشکر لے کر میدان میں نہ آتا تھا اور فیروز شاہ کے سپاہی فصیل کی طرف بڑھنے کی جراءت نہ کرسکتے تھے۔

سلطان نے اب دوسری تدبیریں شروع کیں۔ اپنے امیر الامرا احمد خاں خان خاناں کو دس ہزار سوار دے کے حکم دیا کہ بیجانگر کے جنوبی علاقے پر تاخت کرے، اور امیر فضل اللہ انجو شیرازی کو برار کے لشکر کے ساتھ روانہ کیا کہ جاکے قلعۂ بنکاپور کا محاصرہ کرے جو کرناٹک کا ایک زبردست قلعہ تھا۔ اور خود سلطان بیجانگر کا محاصرہ کئے پڑا رہا۔

راجا دیورائے نے یہ حالت دیکھی تو بڑھ بڑھ کے سلطانی لشکر سے مقابلہ شروع کیا چنانچہ چار مہینے میں آٹھ لڑائیاں ہوئیں۔ اور سب میں راجا کو شکست کھاکے جانا پڑا۔ ادھر امیر فضل اللہ نے اتنی مدت میں قلعہ بنکاپور اور اس کا سارا علاقہ فتح کرکے اپنے قبضے میں کرلیا اور وہاں سلطانی عامل چھوڑ کے واپس آیا۔ خانخاناں نے اس سے بھی زیادہ بڑھ کے یہ کارروائی کی کہ کرناٹک کے زیادہ حصے پر قبضہ کرلیا اور سات ہزار لڑکوں اور لڑکیوں کو گرفتار کرلایا جو سلطان کے سامنے پیش کئے گئے۔ اور ایک بہت ہی بڑا جشن سلطانی لشکر گاہ میں منایا گیا اور خوشی کے نعروں کا غلغلہ اہل شہر کے کانوں تک پہنچا۔

راجا نے یہ حالت دیکھ کے اور فتح سے مایوس ہوکے گجرات، خاندیس اور مالوہ وغیرہ کو لکھا کہ اس نازک وقت میں کمک کرو مگر کسی نے خبر نہ لی اور سلطان نے جشن منانے کے بعد — خانخاناں کو راجا کے مقابلے اور بیجانگر کے محاصرے کے لئے یہیں چھوڑ دیا اور خود امیر فضل اللہ کو ساتھ لے کے قلعہ اودنی کی طرف چلا جو اس سرزمین کا سب سے زبردست قلعہ تھا اور سارے کرناٹک کی آزادی اور قوت کا دارومدار اسی قلعہ پر تھا۔ یہ خبر راجا کو پہنچی تو حد سے زیادہ پریشان ہوا اس لئے کہ اودنی کا قلعہ اس کی سلطنت کی ناک تھا صاف نظر آرہا تھا کہ اگر اس قلعے کے بچانے کی پوری کوشش نہ کی گئی تو خود بیجانگر دشمنوں کے قبضے میں ہوجائے گا اور اگر بیجانگر کے محفوظ رکھنے کی تدبیریں کی جائیں تو اودنی کو سلطان فیروز شاہ کا ایسا حملہ آور یقیناً فتح کرے گا۔ آخر راجا دیورائے نے وزراء کو جمع کرکے مشورہ کیا اور سب کی رائے یہ قرار پائی کہ اب فوراً "صلح و اتحاد کی درخواست پیش کر دی جائے۔ جس پر عمل کیا گیا۔ اور قبل اس کے کہ خود سلطان فیروز شاہ قلعہ اودنی کی طرف کوچ کرے راجا دیورائے کے معززینِ دربار ایلچی بن کر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ" اب مہاراج اپنی حرکت پر نادم ہوکے معافی چاہتے ہیں اور حضور کی طرف

ایک بار حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز لوگوں میں سرکاری سیب تقسیم فرما رہے تھے۔ اتنے میں ان کا چھوٹا بچہ بھی آگیا اور اس نے بے تکلفی سے ایک سیب اٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے بڑی سختی سے سیب چھین لیا اور ڈانٹ کر گھر میں بھیج دیا۔

بچہ روتا ہوا اندر پہنچا، ماں نے رونے کا سبب پوچھا اور آزردگی سے، اسی وقت بازار سے سیب منگوا کر بچے کو دے دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز سیب تقسیم فرمانے کے بعد جب اندر پہنچے تو یہاں سیب کی خوشبو محسوس کر کے چونک پڑے اور بیوی سے دریافت کیا۔ "دیکھنا کہیں یہ سرکاری سیب تو نہیں اٹھا لیا؟"

جواب میں بیوی نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور اپنے قلبی دُکھ اور آزردگی کا اظہار کیا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے رقّت زدہ آواز میں جواب دیا۔ "فاطمہ! تم یقین کرو، جب میں نے سختی سے اس کے ہاتھ سے سیب چھینا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا گویا میرے دل کو کسی نے مسل کر رکھ دیا ہے پھر جب میں نے اس کو جھڑک کر اندر بھیجا ہے تو میرا دل رونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میرے دل کو تمہارے دل سے زیادہ اذیت پہنچی تھی لیکن میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ مسلمانوں کے ایک سیب کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں اور میری عاقبت خراب ہو جائے۔"

سے جو شرطیں پیش ہوں گی ان کو قبول کریں گے۔"

سلطان راجا کی بے اعتدالی پر اس قدر برہم تھا کہ اس کی درخواست کو کسی طرح قبول نہ کرتا تھا۔ ایلچیوں نے بار بار التجا کی اور امیر فضل اللہ انجو نے ہر مرتبہ زمین بوس ہو کے سفارش کی۔ آخر اپنے بہادر اور نامور سردار کی سفارش اس نے قبول کی اور ان شرطوں پر راجا کا قصور معاف کرنے کا وعدہ کیا۔

۱ : دیورائے اپنی بیٹی سلطان کی نذر کرے۔

۲ : اس کی سکھپال کے ساتھ دس لاکھ ہن، پانچ من موتی، پچاس کوہ پیکر ہاتھی، دو ہزار لونڈی غلام جو لکھے پڑھے اور رقص و سرود کے فن میں باکمال ہوں پیش کئے جائیں۔

۳ : قلعہ بنکاپور، گو اس پر سلطان ہی کا قبضہ ہے مگر وہ بھی راجکماری کے جہیز میں محسوب کر کے دولت بہمنیہ کی قلمرو میں شامل کر دیا جائے۔

راجگانِ کرناٹک میں سے کسی نے اس وقت تک کسی غیر قوم کے حکمران خصوصاً ایک مسلمان سلطان کو اپنی بیٹی نہیں دی تھی۔ مگر راجا دیو رائے سلطان فیروز شاہ بہمنی کا اس قدر دباؤ مان چکا تھا کہ اسے طوعاً و کرہاً قبول ہی کرنا پڑا، اور جب بیٹی کا دینا اسنے قبول کر لیا تو اور شرطوں کے نامنظور کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔؟

فوراً راج دلاری کے رخصت کرنے کا سامان ہونے لگا اور اسکے لئے راجا نے ایسا اہتمام کیا کہ ایسی دھوم دھام اس سے پہلے کبھی بیجانگر میں نہیں دیکھی گئی تھی۔ سلطان کا خیمہ بیجانگر کے پھاٹک سے سات فرسخ کے فاصلے پر تھا۔ لہٰذا سلطانی خیمہ سے راج محل تک دورویہ بازار لگ گیا اور ایک عظیم الشان میلہ قائم ہو گیا۔ دکانیں بڑے تکلف اور نہایت ہی زیب و زینت سے سجی گئیں جن کی آرائش میں ہندو مسلمان دونوں نے مل کر اپنے کمالات دہنر اور اپنی نفاست مزاجی کا ثبوت دیا۔ یہ میلہ مسلسل چالیس روز تک قائم رہا جس میں جا بجا پری جمال، ماہ وشیں شب و روز رقص و سرود میں مصروف رہتیں اور ایک خلقت ان کے شمع رخسار کا پروانہ بنی رہتی اکثر مقامات پر بازی گر اور مداری تماشا دکھاتے رہتے، رات بھر روشنی ہوتی رہتی۔ اور معلوم ہوتا کہ دونوں حریف قومیں رشتۂ یگانگت قائم ہوتے ہی ساری فکروں کو بھول کے عیش و عشرت میں منہمک ہو گئی ہیں۔

سلطان کی طرف سے اس کے بھائی احمد خان خانخاناں اور امیر فضل اللہ انجو بری کا جوڑا لے کر ایک باشان و شوکت شاہانہ جلوس اور برات کے ساتھ راج محل میں گئے جو ایک ہفتے تک ٹھہرائے گئے اور نہایت ہی عظمت و شان سے ان کی مہمان داری کی گئی ہفتہ گزرنے کے بعد شاہزادی رخصت کی گئی۔ جس کے سکھپال

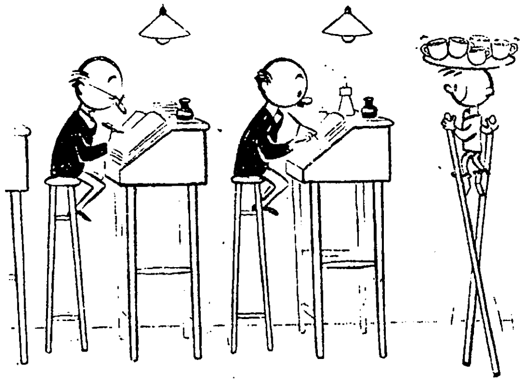
پر سونے چاندی کے پھول لٹاتے ہوئے لشکر گاہ سلطانی میں لائے۔ سلطان کو بھی اپنی اس خوش نصیبی پر جوش آیا۔ دلہن کا ڈولا پہنچتے ہی اس نے خزانے لٹا دیئے۔ اور جس ایثار نفس حسن و ادب اور خلوص و اطاعت سے راجا نے اس رسم کو ادا کیا تھا ویسی ہی فیاضی اور گرم جوشی سے اس کے عزیز ترین ہدیے کو قبول کیا اور بے انتہا مسرور ہوا۔

شادی ہو جانے کے بعد چوتھی کے طور پر راجا نے سلطان کو اپنے محل میں بلایا۔ فیروز شاہ نے اس کی درخواست قبول کی لشکر گاہ کا انتظام خان خانان کے ذمے چھوڑ کے دلہن شہزادی کے ساتھ عظیم الشان جلوس اور اعلیٰ درجے کے کروفر سے بیجانگر میں گیا راجا نے بھی استقبال میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ پھاٹک سے راج محل تک تین فرسخ کی مسافت تھی اس تمام راستے پر اطلس مشجر اور مخمل کا فرش بچھا ہوا تھا اور ادھر ادھر طرح طرح کے قیمتی کپڑوں کے جوڑ لگا کے سارا راستہ گلزار سدا بہار بنا دیا گیا تھا۔ خود راجا پھاٹک تک استقبال کو آیا اور داماد سے بغلگیر ہو کے اسے اپنی مشایعت میں محل تک لایا۔ اس سارے راستے میں راجا کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے جب تک سلطان گزرتا رہا دونوں جانب سے اس پر پری جمال عورتیں اور نازک اندام خوبصورت لڑکے تھالیوں میں بھر بھر کے سونے چاندی کے پھول برساتے اور نچھاور کرتے رہے۔ راستے میں ایک مقام پر بیجانگر کے تمام امراء و معززین نے جن میں مرد عورتیں سب ہی تھے۔ حسب حیثیت روپے اور اشرفیاں نچھاور کیں۔ اس کے بعد ایک میدان پڑتا تھا۔ سلطان کی سواری اس سے آگے بڑھی تو خاص شاہی خاندان کے لوگوں اور اعزائے شاہی کے زن و مرد نے حاضر ہو کے سلطان پر زر و جواہر نچھاور کرنا شروع کئے اور یوں ہی زر و جواہر لٹاتے ہوئے راج محل تک پا پیادہ اس کے ہمراہ آئے۔

اس شان و شوکت اور اس دھوم دھام سے دونوں تاجدار راج محل کے دروازے پر پہنچ کے گھوڑوں سے اترے۔ یہاں ایک مرصع و جواہر نگار سکھپال حاضر تھی سلطان کو اسمیں سوار کرا کے حجلۂ عروسی میں پہنچایا گیا۔ یہ سکھپال سلطان کے ورود کے لئے بنایا اور بڑے اہتمام سے آراستہ کیا گیا۔ تمام امراء اور اعزائے شاہی پا پیادہ سلطانی سکھپال کے جلو میں تھے جن میں خود راجا دیو رائے بھی تھا۔ سلطان کو یہاں تک پہنچانے کے بعد راجا نے واپسی کی اجازت لی۔ اور تمام اعیانِ سلطنت کے ساتھ واپس گیا۔ سلطان اور اس کی مہ جبین دلہن اپنے حجلۂ عیش میں مصروف عیش و عشرت رہے۔ اور تین دن اسی جشن و طرب میں محو رہا۔ جس کے مزے کو سلطان شاید زندگی بھر نہ بھولا ہوگا۔

تیسرے دن سلطان نے واپسی کا ارادہ کیا تو راجا نے حاضر ہو کے اس قدر سامانِ دولت اور اتنا ایک زر و جواہر نذر کیا جو اس سے بدرجہا زیادہ تھا جو سلطان کی شرط کے مطابق شہزادی کے ڈولے کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ اور اسی مناسبت سے اب جو سلطان اور اس کی دلہن کی سکھپال راج محل سے روانہ ہوئی تو اسکی شان و شوکت اور اس کا کروفر پہلے سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ مشایعت کے لئے خود راجا چار فرسخ تک سلطان کے جلو میں گیا اور وہاں سے رخصت ہو کے اپنے شہر میں واپس آیا۔

لیکن باوجود استقبال کا اس قدر اہتمام کرنے کے راجا کے دل میں اپنی بے عزتی و رسوائی کا ایسا گہرا زخم لگا تھا کہ ضبط کرنے پر بھی کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتا جس سے اس کا دلی صدمہ ظاہر ہوتا۔ وہ چھتری نسل کا ایک عظیم الشان راجا تھا جس کے عظمت و جبروت کو سارا ہندوستان مانے ہوئے تھا، چنانچہ سلطان سے رخصت ہوتے وقت اسے غیرت کا کچھ ایسا جوش آگیا کہ اس نے چھتریوں کے اکھڑ پن کے لہجے میں چند باتیں کیں۔ سلطان کو اسکے الفاظ اور اس کا گستاخانہ لہجہ سخت ناگوار ہوا۔ اور راجا کا کیا دھرا سب بے کار ہو گیا۔ چنانچہ راجا کے واپس جاتے ہی سلطان نے امیر فضل اللہ انجو سے جو ہمرکاب تھا اور اسی کی سفارش سے اس نے



یہ صلح قبول کی تھی" غصے کے لہجے میں کہا "شرط تو یہ تھی کہ دیو رائے ہمیں ہمارے خیمے تک پہنچائے گا، یہ راستے میں سے کیوں پلٹ گیا؟" اس کے بعد آپ ہی دل میں کچھ سوچ کے کہا "خیر مضائقہ نہیں۔ سمجھا جائے گا" سلطان کے یہ الفاظ راجا دیورائے کے گوش گزار ہوئے تو طیش میں آکر اور بگڑا اور کچھ اور سخت سست الفاظ زبان پر لایا۔ بہرحال انجام یہ ہوا کہ ایسی قرابت ہو جانے اور مہمانداری و دعوت میں ایسی فیاضی دکھانے پر بھی دونوں تاجداروں کے دل نہ صاف ہوئے۔ مگر ملال صرف دلوں میں رہا۔ اس وقت کوئی اور جھگڑا نہیں پیدا ہوا۔ صلح کے تمام شرائط پر عمل درآمد ہو گیا۔ اور سلطان نے اپنے خیل و حشم اور نئی دلہن کے ساتھ اپنے دارالسلطنت فیروزآباد کی راہ لی۔

چونکہ یہ سب واقعات پرتھال ہی کے حسنِ عالم آشوب کے کرشمے تھے اس لئے ہم نے ان کو تفصیل سے بیان کر دیا۔ اور ان کے بیان میں اس درجہ مصروف ہوئے کہ پرتھال کا خیال ہی ذہن سے اُتر گیا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ لڑائی کی شورش میں راجا دیورائے بھی اسے بھولا ہوا تھا۔ مگر ہمیں افسوس تو اس بات کا ہے کہ اتنا سب ہوا، ہزارہا خلقت کٹ گئی اور راجا دیورائے کی راج دلاری بھی سلطان فیروز شاہ کی دلہن بن گئی مگر دیورائے کی آرزو نہ بر آئی۔ اسے کسی طرح اس مہ پارہ سنارن کا جلوہ دیکھنا نہ نصیب ہوا۔

سلطان کو اثنائے فوج کشی میں معلوم ہو گیا تھا کہ راجا نے بہمنی قلمرو میں ملک گیری کے خیال سے نہیں بلکہ پری جمال پرتھال کے شوقِ وصال میں قدم رکھا تھا جس سے محروم رہا، گھر پہنچ کے اسے شوق ہوا کہ مدگل کے سنار کی اس خوبصورت لڑکی کو دیکھے۔ فوراً ایک سردار تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیجا گیا جو عزت اور بڑی قدر و منزلت کے ساتھ پرتھال اور اس کے ماں باپ کو لے آیا۔ فیروز شاہ نے جو اس کا فرماجرا لڑکی کی صورت دیکھی اور اس کا گانا سنا تو عشق کر گیا۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "فتبارک اللہ احسن الخالقین" اور دیر تک اس کے حسن و جمال کی تعریف کرتا رہا اس کے بعد کہا "میں اب بوڑھا ہوں۔ اس لئے اگر اپنے محل میں رکھوں تو اس پر اور اس کے عدیم المثال حسن و جمال پر ظلم ہو گا۔ اس لڑکی کا ابھی عنفوانِ شباب ہے اور اسی طرح میرے فرزند حسن خاں کی رگوں میں بھی جو نہایت ہی خوش جمال ہے آغازِ جوانی کا پرجوش خون دوڑ رہا ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس لڑکی کی شادی اسی کے ساتھ کر دی جائے۔

یہ تجویز کرتے ہی سلطان نے پرتھال کو اپنی چچی کے حوالے کیا کہ

اس کی شادی کا اہتمام شاہانہ شان و شوکت سے کرے اور عقد
کی تاریخ مقرر کر کے خود حسن خاں کو بڑے کرّوفر اور حشمت و شکوہ
سے دولہا بنا کے چچی کے گھر برات کے ساتھ لے گیا اور مہ جمال
پری تمثال کو سلطنتِ بہمنیہ کی عالی مرتبہ بہو بنا کے بیاہ لایا۔ پری تمثال
کو معلوم ہوا کہ میرے خواب کی یہ تعبیر تھی اور آرزو مندی و مقصد وری
کے ساتھ عالی مرتبہ مسلمان شاہزادیوں کی سی زندگی بسر کرنے لگی۔
جس کی طرف اس کے دل کو پہلے ہی سے رجحان تھا اور خود ہی پردہ کرنے
لگی تھی۔

شاید ایسی عدیم المثال اور بے نظیر دلہن کے ملنے ہی کا نتیجہ تھا
کہ حسن خاں کو بجز عیش و عشرت اور رقص و سرود کے دنیا و مافیہا
سے کوئی سروکار نہ تھا، رات دن محبوبۂ مہ جبین کی آغوش میں بیٹھا
رہتا اور اس کے ناز و ادا کا لطف اٹھایا کرتا۔ نہ سلطنت سے سروکار
تھا نہ حکمرانی کی لیاقت اس میں پیدا ہو سکی۔ فیروز شاہ نے آخر زندگی
میں لاکھ سر مارا اور اسے اپنا ولی عہد بنا دیا مگر سلطنت اس کی
تقدیر میں نہ تھی، فیروز شاہ کا بھائی خان خاناں اس کی زندگی
میں ہی بادشاہ بن گیا۔ بیٹے کی محبت میں بادشاہ بھائی کا دشمن
ہو گیا اور خود فوج لے کے اس کے سامنے صف آرا ہوا۔ فیروز شاہ
ان دنوں سخت بیمار تھا۔ اثنائے جنگ میں اتفاقاً اسے غش آ گیا۔
لشکر میں اس کی موت کی خبر اڑ گئی اور خود اس کی فوج والے اسکا
اور ولی عہد کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کے خان خاناں سے جا ملے۔ ہوا کا
رخ پلٹا دیکھ کے حسن خاں اور دیگر سردار بادشاہ کے میانے کو
قریب کے ایک قلعے میں اٹھا لے گئے اور خان خاناں نے بڑھ کے
اس قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

اب فیروز شاہ کو ہوش آیا اور واقعاتِ جنگ سنے تو اسے اپنی
بے دست و پائی پر افسوس ہوا، اور فرزند سے کہا "بیٹا میں نے بہت
چاہا مگر اس کو کیا کروں کہ سلطنت تمہاری قسمت میں نہیں ہے۔ اب
بھائی سے لڑنا قسمت سے لڑنا ہے۔ قلعے کے پھاٹک کھول دو ـــ اور
خان خاناں سے کہو کہ وہ فاتحانہ شان سے اندر آئے۔ اس حکم پر عمل
کیا گیا اور خان خاناں آ کے صاحبِ تاج و سریر بھائی کے سرہانے
کھڑا ہو گیا۔ بیمار و ناتواں بادشاہ سرکش بھائی کی صورت دیکھتے ہی
زار و قطار رونے لگا اور کہا "یہ تاج و تخت تمہیں مبارک، محبت پدری
کے تقاضے سے میں نے اپنے فرزند کے لئے ولی عہدی کی کوشش کی
مگر چونکہ یہ خدا کو منظور نہ تھا اس لئے ناکام و نامراد رہا۔ بس
اب آج سے تم ہی صاحب تاج و دیہیم ہو اور میں اپنے فرزند اور
ساری رعایا کو تمہارے سپرد کرتا ہوں۔"

اور اسی دن یعنی ۵ شوال ۸۲۵ھ کو خان خاناں نے تاج
شاہی سر پر رکھا اور "احمد شاہ بہمنی" کے لقب سے حکومت کرنے لگا
دس دن بعد یعنی اسی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو فیروز شاہ نے دنیا سے کوچ
کیا اور فیروز شاہ کی وصیت کے مطابق نئے فرماں روا احمد شاہ
بہمنی نے سوچنا شروع کیا کہ وہ بھتیجے یعنی حسن خاں کے ساتھ کیا
سلوک کرے۔ بعض مشیروں نے رائے دی کہ "اس شاہزادے سے
مطمئن نہ رہنا چاہیئے۔ اسے یا تو قتل کرنا چاہیئے یا اس کی آنکھیں
نکلوا ڈالی جائیں۔" مگر احمد شاہ نے اس صلاح کو نہ مانا بلکہ بھتیجے
کو پانصدی عزت سے سرفراز کیا۔ اس کے ساتھ دریائے تنگ بھدرا
کے کنارے قلعہ فیروز آباد بطور جاگیر عطا کیا اور کہا "اس خوش سواد
قلعے میں جس کی فضا میں دریائے تنگ بھدرا نے جان ڈال دی ہے،
بیٹھ کے تم عیش کرو۔ اپنی محبوبہ کے حسن سے لطف اٹھاؤ، قلعہ کے
برجوں سے عالم کی بہار دیکھو۔ سیر و شکار کا شوق ہو تو گرداگرد دو فرسخ
تک جا کے لطفِ شکار اٹھا سکتے ہو۔ اور اس سے زیادہ دور جانے
کو جی چاہے تو مجھ سے اجازت لے لینا۔"

حسن خاں بھی دل سے یہی چاہتا تھا اس خلوت کدۂ عیش
میں بیٹھا تو پھر مر کے وہاں سے نکلا۔ اور ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے بعد
اس کا اور اس کی مہ جبین محبوبہ پری تمثال کا کیا حال ہوا۔



تشنگی کی ایک عبرت انگیز کہانی

ثریا صدیقی

کالی دوستی

وہ قطعی ایسا شخص نہ تھا کہ اس پر کوئی اپنی بیوی کے قتل کا شبہ کر سکے۔

اس کے پاس سب کچھ تھا مگر وہ جو ایک بات زندگی میں مسرت و شادمانی کی ہوتی ہے اس کے ہاں عرصے سے عنقا تھی۔ برسوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔ وہ ایک متمول شخص تھا۔ ایک امن پسند شہری۔ اس نے اب تک نیکی کمائی تھی۔ شہر میں اس کا اپنا ایک دفتر تھا اور پابندی سے چرچ جانا اس کے معمولات میں شامل تھا۔ وہ کھلاڑیوں کے ایک کلب کا ممبر بھی تھا۔ ہر چند کہ وہ اس کلب میں گزشتہ دس سال سے نہیں گیا تھا۔ پچھلے چھبیس سال سے وہ اپنی بیوی آئرین کے ساتھ گزر بسر کر رہا تھا۔ اس عرصے میں اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ البتہ آئرین نے دو چھوٹے چھوٹے کتے پرورش کر کے اپنی توجہ کسی قدر اولاد کے غم سے ہٹالی تھی۔

اس قصباتی گلی میں ان کا مکان جنت نشان کہا جا سکتا تھا۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ وہ دونوں بہت شادماں زندگی

گزار رہے تھے۔ اس کی آمدنی کم تھی۔ لیکن وہ عمدہ طریقے اور رکھ رکھاؤ سے رہتے تھے۔ آئرین کی دلچسپیاں اب اپنے شوہر سے زیادہ کتوں کی جانب معلوم ہوتی تھیں۔ وہ کسی حد تک بے خیالی یعنی خالی الذہن رہنے کے مرض میں بھی مبتلا تھی۔ ہاں اس کا شوہر، ہربرٹ گبسن ان تمام عارضوں سے بچا ہوا تھا۔ ہڈلی بلڈنگ کے کمرہ نمبر ۴۰۸ میں وہ پچیس سالوں سے اپنے پیشے میں مصروف تھا۔ وہ انکم ٹیکس کے مشیر کی حیثیت سے پریکٹس کرتا تھا۔ سادہ سا اس کا دفتر تھا۔ سادگی اس کے مزاج میں تھی۔ خود آئرین بھی گاہے گاہے کام کر لیا کرتی تھی اور اس سے معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔

ہربرٹ کسی طرح بھی اولو العزم شخص نہ تھا۔ کسی نئے منصوبے میں ٹانگ اڑانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر یہ بات تب کی ہے جب اُس کے پڑوس میں روڈنی بزنس مینجمنٹ کا دفتر نہیں کھلا تھا۔ ہربرٹ سے روڈنی کی ملاقات سلام دُعا سے زیادہ نہ تھی۔ اس کی ملاقات اس وقت ہوتی جب ڈاکیا غلطی سے اُن کے خطوط غلط طور پر تقسیم کر جاتا تھا۔ اور پھر ایک دن ملاقات کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ روڈنی اپنا آفس چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا۔ پولیس اس کے فوراً بعد آدھمکی۔ تب اُسے پتا چلا کہ روڈنی نے اپنے گاہکوں سے موٹی موٹی رقمیں وصول کی تھیں۔ اس نے کئی کاروبار پھیلا رکھے تھے اور "خدمات" نام کی کوئی شے کسی کو پیش نہیں کی تھی۔ پولیس کی آمد بھی اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔

اور یہ بات کہ ایک مفرور مجرم سے اس کی سلام دعا تھی ہربرٹ گبسن کے لئے بڑی سنسنی خیز بات تھی۔ چنانچہ ڈنر کے وقت اس نے اپنی بیوی سے اس کا تذکرہ کرنا چاہا جو خود میں الجھی ہوئی تھی۔

"آج دفتر میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔"

آئرین نے اس کے جملے پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس کا چہرہ جو پہلے ہی جذبات سے عاری تھا اب اور سپاٹ ہو گیا پلیٹ میں چمچا ٹپکتے ہوئے وہ بولی "نہ جانے کیوں آج کھانا پکانے کے بعد میں خود کو بہت مضمحل محسوس کر رہی ہوں۔"

ہربرٹ نے ایک اور کوشش کی۔

"مسٹر روڈنی کا دفتر میرے دفتر کی بغل میں تھا....."

"کس قدر سردی پڑ رہی ہے۔ اُف توبہ" آئرین نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"روڈنی والے جعلئے تھے۔ اُن کے کئی کاروبار تھے وہ قلمی دوستی کا بھی کوئی کلب چلاتے تھے۔" ہربرٹ نے بہرحال بات جاری رکھی۔

"اوہ۔" آئرین نے کسمساتے ہوئے کہا "میں کہتی ہوں کمروں میں روغن کب ہوگا؟" آئرین نے مزید بے نیازی سے پوچھا۔

ہربرٹ نے جھنجھلا کر کہا "غالباً وہ لوگوں کو یہ کہہ کر ٹھگ رہا تھا کہ مختلف صنف۔ عادات اور قماش کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لا سکتا ہے اور اس کے لئے وہ بڑی رقمیں وصول کرتا تھا۔"

اس بار آئرین نے اُسے گھور کر دیکھا "تم کیا کہے جا رہے ہو۔ دیکھتے نہیں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

اس کا مطلب تھا آئرین نے اس کی بات سرے سے سنی ہی نہ تھی۔ یہ اس کی عادت بھی تھی گھر میں جب کوئی بات کرنے والا نہ ملا تو ہربرٹ کے ذہن سے سموچی بات نکل گئی۔

اور یہ ہفتے بھر بعد کی بات ہے۔

اس صبح وہ اپنے دفتر کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ اُسی میں اُسے ایک خط نظر آیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

دفترِ قلمی دوستی

محترمی۔ تسلیم

میں یہ خط آپ کے اشتہار کے حوالے سے آپ کو لکھ رہی ہوں۔ ظاہر ہے آپ کا دفتر باعزت شہریوں ہی سے رابطہ قائم کرانا چاہے گا......"

یہاں تک پہنچ کر ہربرٹ کو خیال آیا کہ ضرور ڈاکیا یہ خط اوپر ڈال گیا ہے۔ بہرحال خط ابھی مزید باقی تھا۔ کسی انجانے جذبے کے تحت وہ اُسے پڑھتا رہا۔

"......اور بلاشبہ یہ ایک نیک کام ہے۔ ایک پسندیدہ بات۔ میں ایک باعزت شہری ہوں۔ میری عمر کوئی تیس سے اوپر ہے۔ میں آج تک کہیں باہر سیر و تفریح کے لئے نہیں گئی۔ گھومنے کا مجھے بے حد شوق ہے مگر کوئی پسندیدہ ساتھی نہیں ملتا۔ میرا خیال ہے سفر کا لطف کسی دلچسپ آدمی کے ساتھ ہی آتا ہے۔

آپ نے کوائف زندگی طلب کئے ہیں۔ میں ٹیکس اکاؤنٹنگ کا کام کر کے گزر بسر کرتی ہوں۔ لیکن میں ایک ایسا ساتھی چاہتی ہوں جو کسی اور ہی پیشے سے منسلک ہو۔ مثلاً ادیب، شاعر، وغیرہ، ساتھ ہی ساتھ اُسے گفتگو کرنے کا فن بھی خوب آتا ہو۔ مجھے بور لوگ سخت ناپسند ہیں۔ خوش اطوار و خوش گفتار لوگ میری کمزوری ہیں۔ میرے مطلوبہ شخص کو لازماً سیر و تفریح کا رسیا ہونا چاہیئے۔

مجھے اُمید ہے آپ جلد ہی جواب سے نوازیں گے۔

مخلص

سلویا سیگن۔ بکس ۷۰۱۴۔ شہر...

مزید:۔ میں خوابناک آنکھوں اور گوری رنگت کی عورت ہوں اور لوگوں کے خیال کے مطابق پرکشش کہی جا سکتی ہوں۔"

ہربرٹ کو یہ خط بے حد دلچسپ لگا۔ اس نے سوچا اگر سلویا سیگن بات چیت کرنے کی جویا ہے تو میں خود بھی گفتگو کو ترستا ہوں۔ یقیناً میں اس سے رابطہ قائم کروں گا اور پھر اس کے سامنے تخیل نے آئینہ رکھ دیا۔ ہربرٹ گبن سند یافتہ پبلک اکاؤنٹنٹ، اور تبھی اس کے ذہن میں ایک اور تختی ابھری۔ سلویا سیگن ٹیکس اکاؤنٹنٹ۔ مگر اُسے یاد آیا کہ سلویا سیگن تو کسی اور ہی پیشے سے متعلق شخص کی طالب ہے "میں ایسا ساتھی چاہتی ہوں جو کسی اور ہی پیشے سے منسلک ہو۔ مثلاً ادیب...." ٹھیک ہے، ہربرٹ نے خط دوبارہ پڑھ کر اُسے لفافے میں رکھ دیا "میں اسے بھیجنے والی کو واپس کر دوں گا"

اور اس نے یقیناً خط واپس کر دیا ہوتا اگر اس شام جب وہ گھر لوٹا تھا۔ آئرین کا بھائی نہ آ دھمکا ہوتا۔ وہ بے چارہ ایک مدقوق شخص تھا۔ جب کبھی اُسے پیسوں کی ضرورت ہوتی، وہ اپنی بہن کے گھر پر اجمان ہو جاتا۔

اس نے آئرین کے بھائی کی سمت دیکھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے لینی کو پھر ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔"

"دیکھو۔ میں ایک نئی تصویر لائی ہوں" آئرین نے جواب میں تصویر کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مزید گفتگو لاحاصل تھی۔ وہ کتوں کو لے کر چہل قدمی کے لئے باہر نکل گیا۔ اُسے اپنی بیوی کی یہ لاپروائی بہت بُری لگتی تھی۔ شام کہر آلود تھی۔ وہ ٹہلتا رہا... سوچتا رہا۔

اپنی بے کیف زندگی کے متعلق۔ ان دنوں کے متعلق جو کسی خوشی کے بغیر گزر گئے۔ ان سالوں کے متعلق جن پر خزاں محیط رہی۔ پھر اسے سلویا یاد آ گئی۔ آخر سلویا کیسی ہو گی؟ اور یہ ہے کون؟ اور تب اس کے ذہن میں آپ ہی آپ ایک خط مرتب ہونے لگا۔ اس کے چہرے پر سُرخی آ گئی۔

ڈیئر مس سیگن۔

آپ کا خط قلمی دوستی والوں کی طرف سے مجھے بھیج دیا گیا

ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم دونوں ایک ہی قسم کے انسان ہیں۔ نہیں۔ اس نے سوچا آخری جملہ مناسب نہیں۔ اس نے اپنے ذہن میں ترمیم کی۔

میرا مطلب ہے دونوں ایک ہی رجحان رکھتے ہیں، میں ایک ادیب ہوں۔ بے شک زیادہ شہرت یافتہ نہیں۔ خود میرا یہ عالم ہے کہ آج تک مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس سے ڈھنگ کی کوئی بات کر سکوں۔

سیر و تفریح کے متعلق آپ کے خیالات دلچسپ ہیں اور خوب ہیں۔ میں آپ سے زیادہ تو نہیں مگر گھومنے پھرنے کا کچھ کم شوق نہیں رکھتا۔

مجھے امید ہے کہ آپ جواب سے جلد نوازیں گی

آپ کا اپنا۔ ؟

نام۔ ؟ اس نے سوچا۔ نام کیا لکھوں ؟ پھر یونہی اُس نے دستخط کر دیئے۔

آپ کا اپنا
رابرٹ برٹن

اُسے یہ نام بہت اچھا لگا۔ بلاشبہ یہ ہربرٹ گبسن سے زیادہ رُومانی نام تھا اور پھر اس کے ذہن میں ایک اور بات اُبھری۔

مزید: میری عمر چالیس کے قریب ہے۔ میرے بال قدرے بھورے ہیں۔ آنکھیں نیلی اور جسم کسرتی ہے۔ میں ایتھلیٹ کلب کا ممبر ہوں۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنا پتا ظاہر کرے۔ اس مشکل کے حل کے لئے ایک پوسٹ بکس لینا کوئی دشوار کام نہ ہوگا۔ گھر سے اُسے ہمت دلائی اور لینی نے اُسے فیصلے کی قوت بخش دی۔ کیونکہ جب وہ گھر پہنچا تو لینی ٹیلیویژن پر کشتی دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ چیخ بھی رہا تھا" ٹھیک ہے بے یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا" وہ تصویروں سے مخاطب تھا۔ اس کی حالت پاگلوں کی سی تھی۔ اس کے اطوار بہت ناشائستہ تھے۔

اور سلویا اور رابرٹ برٹن میں دلکش خط و کتابت چل پڑی "..... آپ کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ آپ انتہائی دلچسپ آدمی ہوں گے۔ مسٹر برٹن میں کہہ نہیں سکتی آپ کا خط پاکر مجھے کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ زندگی میں کم از کم ایک ایسا آدمی تو ملا جسے گفتگو کا فن آتا ہے۔ جس کی تحریر میں جاذبیت ہے، جس کے انداز میں شائستگی ہے۔"

اس خط کے ساتھ ایک فوٹو بھی منسلک تھا لیکن تصویر اتنی دور سے لی گئی تھی کہ نقوش واضح نہ تھے۔

ہربرٹ کی حالت عجیب تھی۔ اُسے اب اپنی زندگی کی بے کیفی کا احساس کچھ سوا ہو گیا تھا۔ میری زندگی واقعی کتنے کرب میں گزری ہے۔ نہ کوئی اُمنگ ہے۔ نہ ارمان۔ نہ ولولہ ہے نہ جوش۔ اب اتفاق سے مجھے ایک خوش ذوق عورت مل گئی ہے۔ وہ جو میرے خوابوں میں آنے لگی ہے۔ وہ جو میرے دل میں دھڑکنے لگی ہے۔ وہ جس نے نئی زندگی کی نوید دی ہے۔ کیا میں اُسے جانے دوں۔ نہیں۔ میں ضرور خط لکھوں گا۔ اس کا ذہن سلویا سگن کی طرف بری طرح مائل ہوا جاتا تھا۔ سو اس نے ایک خط لکھا۔

ڈیر مس سگن

آپ کا خط نرم و لطیف ہوا کے جھونکے کے مانند خوشگوار ہے۔ اس نے میری روح میں تازگی پیدا کی ہے، آپ سے خط و کتابت کر کے میں جو ایک احساس طمانیت و برتری محسوس کرتا ہوں۔ سوچتا ہوں، سفر میں میرے جذبوں کا کیا حال ہوگا۔ یقین کیجئے آپ کے ساتھ سفر کرنے کا تصور ہی بڑا جانفزا ہے۔

ویسے ایک بات پوچھنے کو نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے
آپ نے کبھی شادی بھی کی تھی یا ابھی تک.....؟

آپ کا

رابرٹ

مزید: کیا آپ مجھے اجازت دیں گی کہ آئندہ میں آپ کو "تم" کہہ کر مخاطب کر سکوں۔ آخری جملہ وہ بے اختیاری میں لکھ گیا۔ مگر یہ بات انتہائی مناسب تھی۔

جواب آیا۔

ڈیئر مسٹر برٹن۔

ہاں افسوس ہے۔ میں شادی شدہ ہوں لیکن یہ ایک عذابناک زندگی ہے۔ ایک ایسی زندگی جس میں ویرانیاں ہی ویرانیاں ہیں۔ میں کہتی ہوں اگر دو تشنہ روحیں ایک دوسرے کے قریب آجائیں تو اس میں کیا عیب ہے۔

تمہیں اجازت ہے، جس طرح چاہو، مجھے مخاطب کرو۔

تمہاری

سلویا

پھر اس نے لکھا

ڈیر سلویا!

تمہاری صاف گوئی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں سچائیوں کو پسند کرتا ہوں۔ میں خود دروغ گوئی نہیں کروں گا۔ میں نے تمہارا وہ خط جو "قلمی دوستی" والوں کے پاس آیا تھا، غلطی سے پڑھ لیا تھا۔ وہ دفتر میرے دفتر سے ملا ہوا تھا۔ بہرحال وہ لوگ چلے گئے تھے۔ البتہ ہماری دوستی سوفی صد اصلی ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔

تمہارے ساتھ گھومنے کو کس قدر جی چاہتا ہے۔ میں کس طرح کہوں۔ یقین کرو میں اپنی موجودہ زندگی سے بہت تنگ ہوں

تمہارا رابرٹ

●

یہ ہربرٹ کا پاگل پن تھا۔ وہ اپنے حواس میں کب رہا تھا۔ بھلا آئرین طلاق کب لینے والی تھی۔ اس کی جائیداد مشترک تھی اور یہ طلاق سخت نقصان دہ ثابت ہوتی۔ مگر اسے سلویا کے خط کا انتظار تھا۔ اور اسی الجھن میں سلویا کا جواب ملا۔

ڈیئر رابرٹ!

اُف۔ میں کس قدر خوش نصیب ہوں۔ مجھے ایک سچّا ساتھی مل گیا۔ میں پہلے بڑی خوفزدہ تھی۔ لیکن سچائیاں تمہاری تحریر سے جھلکتی ہیں۔ تمہارا خط تمہارا آئینہ ہے۔ ہم دونوں یقیناً ایک دوسرے کے ساتھ بے حد خوش رہیں گے۔ میرا خیال ہے اب ہمیں جلد ہی کوئی قدم اٹھانا چاہیئے۔ کوئی ایسا قدم جو ہمارے بُرے دنوں میں خوشیاں بکھیر دے۔ میں منتظر ہوں کہ تم کیا کرتے ہو۔ میرے رابرٹ۔ میں تمہارا صدیوں انتظار کر سکتی ہوں.....،

وہ سوچنے لگا۔ آئرین کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔ اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے۔ مگر کس طرح۔ کوئی مصنوعی طریقہ ڈکیتی اور شوٹنگ۔ نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ کیا اُسے سیڑھیوں سے گرا دیا جائے۔ نہیں یہ بھی خطرناک بات ہے۔ ہوسکتا ہے وہ بچ جائے۔ کلہاڑی؟ اوہ۔ نہیں نہیں۔ خون کے تصور ہی سے اُسے لرزہ آگیا۔

وہ اپنی زندگی کی بدترین الجھن میں مبتلا تھا۔
اور اتفاق سے یہ گتھی حل ہوگئی۔ اور وہ خود بھی آئرین ہی کی کوشش سے۔

"روشنیں بے ترتیب ہوگئی ہیں" آئرین نے ایک دن اس سے کہا۔

"تم دن بدن موٹی ہوتی جا رہی ہو۔ آخر تم ورزش کیوں

نہیں کرتیں۔" بے خیالی سے وہ بولا۔

"گلابوں پر دھبے پڑ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے تم مجھے سنکھیا خرید کر لا دو تاکہ میں انہیں بچا سکوں۔" وہ سخت غصے میں بول رہی تھی۔

ہربرٹ نے کان لگا دیئے۔

"اور سنو۔ واپسی پر شراب کی ایک بوتل لیتے آنا۔ کل لینسی کی سالگرہ ہے۔" آئرین نے کہا۔

"شراب؟"

"ہاں" آئرین نے کہا "بے چارے کی سالگرہ ہے۔ کچھ تو ہونا ہی چاہیئے۔"

سنکھیا اور شراب۔ شاید قسمت ہربرٹ کے ساتھ تھی گویا سارا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اُسے "آئل آف کلوو" کی ایک شیشی مل گئی اور یہی اُسے چاہیئے بھی تھی۔ پھر وہ باغبانی کی دکان پر پہنچا وہاں سے اس نے سنکھیا کا عرق خریدا اور دفتر پہنچ کر اس نے احتیاط سے اسمیں کا کچھ حصّہ دانت کی دوا کی خالی شیشی میں انڈیل دیا۔ اس نے احتیاط کی تھی کہ سنکھیا کی شیشی پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہ بننے پائیں۔ واپسی پر اس نے شیشی آئرین کو تھما دی۔

اُسے اپنے منصوبے کی کامیابی کا اب مکمل یقین تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ یہ کیس خودکشی کا کیس سمجھا جائے گا۔ اور خصوصًا اس صورت میں جبکہ آئرین اپنی جائیداد کا کچھ حصّہ فروخت کرنے کے لئے ایجنٹ سے بات کر چکی تھی۔ سارے معاملات اپنی جگہ ٹھیک چل رہے تھے۔ اس کے ذہن میں حسین و جمیل شہر گھوم گئے۔ لندن۔ پیرس۔ روم۔ اوہ۔ وہ اور سلویا۔ سلویا جو اس سے متاثر ہے۔ جو خوش ذوق ہے اور اُسے پسند کرتی ہے

سالگرہ کی شام آ پہنچی۔ اور وہ لمحہ آ پہنچا جب ہربرٹ گبسن کی زندگی میں انقلاب آنے والا تھا۔ آئرن نے حسب معمول موم بتیاں جلائیں۔ یہ اس کی عادت تھی۔ شراب کی بوتل کھولنے کے معاملے میں لینسی ماسٹر تھا۔ لہٰذا یہ بھی اس کا کام نہ تھا۔ اور وہاں آئرین کی عادت بار بار میز سے اٹھ کر باورچی خانے جانے کی بھی تھی۔ اور یہ لمحہ ہر کام کے لئے بڑا قیمتی ثابت ہو سکتا ہے، وہ لمحہ جو نیم مُردہ ہربرٹ گبسن کی زندگی میں رنگ بکھیر سکتا تھا۔

جب اس کا کام مکمل ہو گیا اور اس نے اس لمحے سے پروگرام کے مطابق فائدہ اٹھا لیا تو اس نے سوچا۔ آخر یہ سلویا کون ہے جو ایک شریف النفس شخص ہربرٹ گبسن کو قاتل بنا رہی ہے۔ نہیں یہ ہربرٹ نہیں ہے یہ تو رابرٹ برٹن ہے۔ یہ تو رابرٹ ہے۔ رابرٹ برٹن۔ اس کا ذہن اس وقت عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔

"ہربرٹ، ہربرٹ۔ بیٹھ جاؤ۔" اُسے آئرین کی آواز سنائی دی۔ ہربرٹ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ لینسی بوتل سے شراب انڈیل رہا تھا۔

"ٹھہرو" آئرین نے اُسے روکا۔ "یہ گلاس میں کیا ہے"؟ اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھا لیا۔ اپنا نہیں۔ ہربرٹ کا۔

"اوہ۔ اس میں تو دھول لگی ہوئی ہے۔" پھر وہ گلاس لے کر باورچی خانے چلی گئی۔

لینسی متواتر شراب انڈیلے جا رہا تھا۔ اب آئرین کا گلاس لبالب بھر چکا تھا اور تب دفعتہً ہربرٹ گبسن کو محسوس ہوا کہ وہ قتل نہیں کر سکتا۔ رابرٹ برٹن کی جگہ دوبارہ ہربرٹ گبسن نے لے لی تھی۔ اس نے چاہا کہ لپک کر آئرین کا گلاس اٹھا لے مگر آئرین پہنچ چکی تھی۔

اور اسی لمحے اس کے مضطرب ذہن نے ایک دوسری ترکیب سوچی۔

"آخر یہ کتے کہاں ہیں؟ ذرا انہیں بھی تو یہاں لاؤ

وہ اس خوشی میں کیوں نہ شریک ہوں۔" اس نے کہا اور چند لمحوں کے لئے سب کی توجہ ہٹ گئی۔

ہربرٹ گلاس تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور پھر اس نے اچانک یوں گلاس الٹ دیا جیسے اس سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو۔

"ہربرٹ۔ ارے۔ یہ کیا ہوا؟" آئرین نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

مگر ہربرٹ باورچی خانے میں چلا آیا۔ اس نے آئرین کے جملے کی پروا نہ کی۔ وہ قتل کے جرم سے صاف بچ گیا تھا۔ اس نے اس کی بھی پروا نہ کی کہ اب سلویا اسے نہیں مل سکے گی اور جب وہ ہاتھ صاف کر رہا تھا تو اسے فرش پر کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔

جس وقت ڈاکٹر ولیم اور پولیس وہاں پہنچی، ہربرٹ اپنی کرسی پر منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ لینسی بھی وہاں موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں کوئی شے دبی ہوئی تھی۔

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ یہ کیا ہوا؟" وہ سسکیوں کے درمیان بولا۔

"یہ صاف زہر خورانی کا کیس ہے" ایک سپاہی نے کہا "ڈاکٹر نے معائنہ کیا ہے۔ آپ کی بیوی سنکھیا پی کر مری ہے۔"

"مگر۔ مگر میں نے تو......"

ڈاکٹر نے بات کاٹ کر کہا "ہمت رکھو مسٹر گبسن۔ مجھے بڑا تعجب ہے۔ میں آپ دونوں کو جانتا ہوں۔ خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں یہ بات ابھی سارجنٹ سے کہہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کیا وجوہ تھیں، جنہوں نے آپ کی بیوی کو اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔"

"کیسا قدم؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

ڈاکٹر کا چہرہ اچانک سنجیدہ ہوگیا "مسٹر ہربرٹ آپ خوش نصیب ہیں کہ بچ گئے۔ آپ کو نہیں معلوم آئرین نے گلاس میں سنکھیا ملا دی تھی۔ یہ بات ابھی ابھی لینسی نے ہمیں بتائی اُف، آپ ایسی بے رحم موت سے صاف بچ گئے۔ لینسی کا کہنا ہے وہ عرصے سے اس سے سنکھیا لانے کو صاف کہہ رہی تھی۔ شاید وہ اس جرم میں اپنے بھائی ہی پر اعتماد کر سکتی تھی اس رات اسے موقع مل گیا۔ وہ آپ کا گلاس اٹھا کر باورچی خانے میں لے گئی اور وہاں اس نے سنکھیا کا عرق ملا دیا۔ اور جب آپ نے گلاس گرا دیا تو وہ سخت پریشان ہوئی۔ مگر یہ بھی ایک معجزہ ہی ہے۔ نہ جانے کس طرح آئرین سے غلطی ہو گئی۔ خدا جانے کس طرح گلاس تبدیل ہوگیا۔ یعنی سنکھیا والا گلاس خود اس کے ہاتھ میں آگیا جس نے اسی کا کام تمام کر دیا یہ محض ایک غلطی تھی۔ ورنہ زہریلا جام تو آپ کے لئے ہی بنایا گیا تھا۔"

"میرے لئے" اس نے حیرت سے پوچھا "مگر کیوں"۔

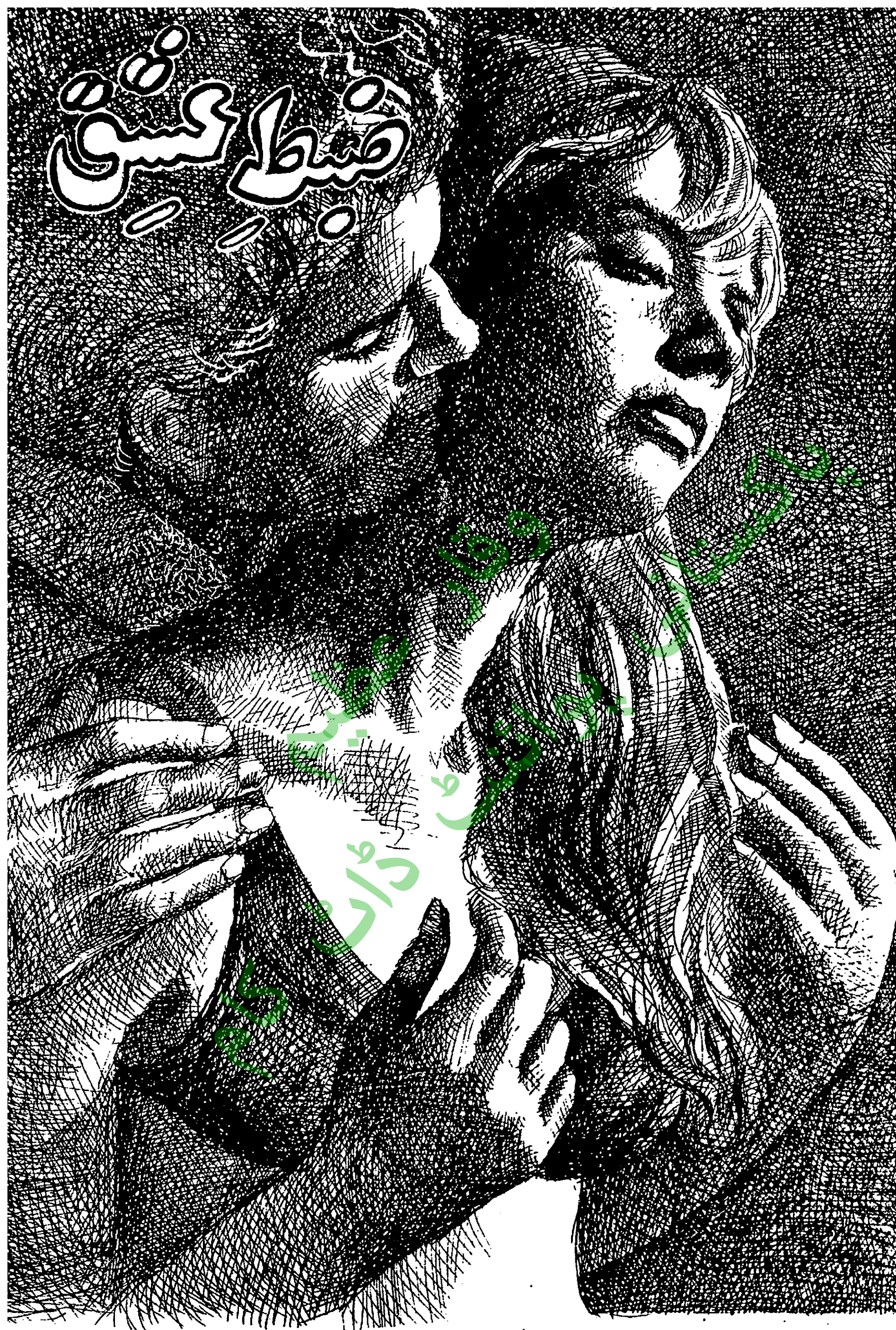
تینوں آدمیوں نے اُسے ترحم کی نظروں سے دیکھا۔ اور تب لینسی نے اپنے ہاتھوں میں دبا ہوا خطوط کا پیکیٹ اس کی گود میں ڈال دیا۔ اور کہا۔

"ہمیں یہ خطوط آئرین کے کمرے سے ملے ہیں۔ انہیں پڑھ لیجئے۔ آپ خود ہی سمجھ جائیں گے کہ اس اقدام کے پیچھے کیا مقصد تھا۔"

مگر ہربرٹ کو ان خطوط کو پڑھنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی۔ لفافوں پر جو پتا تحریر تھا۔ وہی کافی تھا۔ لفافے پر تحریر تھا:

سلویا سیگن

پوسٹ بکس ۱۴۷۔ شہر


ضبطِ عشق

ایک خوبصورت تاثر انگیز کہانی

اثر نعمانی

لوگ کہتے ہیں کہ —— کوئی بھی بات ہو —— عورتیں برداشت نہیں کر سکتیں۔ یہ سراسر ایک بہتان ہے جو ہماری صنف پر لگایا جاتا ہے۔ اور اگر آپ پانچ منٹ میری باتوں پر توجہ دے سکیں تو میں ابھی ثابت کر سکتی ہوں۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ بیان کروں۔ بہتر ہوگا کہ اپنے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتاتی چلوں۔ میرا نام ولما ہے۔ اور میرا تعلق ایک انتہائی معزز اور شریف خاندان سے ہے ...... مگر نہیں۔ بہتر ہوگا کہ میں حقیقت بیانی سے کام لوں۔ اصل میں میرا نام ایلسی اسٹریونز ہے۔ لیکن میں اتنے مختلف نام وقتاً فوقتاً اختیار کرتی رہی ہوں۔ کہ اگر آپ اچانک کسی وقت مجھ سے میرا نام پوچھ بیٹھیں تو مجھے چند لمحے غور کرنا پڑے گا کہ میں اس وقت کس نام سے معروف ہوں۔ جہاں تک اس داستان کا تعلق ہے جو میں آپکو سُنانے والی ہوں تو آپ مجھے ولما ہی سمجھیں۔

جنگ بڑی عجیب چیز کا نام ہے جو زندگی اور اس کے تمام معمولات کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ میں اور کارلوس بھی اس کے تباہ کن اثرات سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ کارلوس میرے مقابلے میں کہیں زیادہ متاثر ہوا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک کسی جائے پناہ کی تلاش میں بھاگ ہی رہا ہوگا۔ مگر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ بات ہو رہی تھی اپنے بارے میں تھوڑی سی تفصیلات بتلانے کی۔ تو میری عمر ۳۲ سال ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ میں حسین ہوں..... بلکہ بیحد حسین ہوں۔ (لوگ ہمیشہ جھوٹ نہیں بولا کرتے) کارلوس کا کہنا ہے کہ میری شخصیت بڑی کشش انگیز ہے نہ صرف دیکھے جانے کے قابل۔ بلکہ مسلسل دیکھے جانے کے قابل۔ قد پانچ فٹ آٹھ انچ۔ چھریرا متناسب جسم۔ دلفریب خدوخال۔ سُریلی آواز۔ اچھے لباس کی بیحد شوقین ہوں۔ اور ہر لباس کو اچھے طریقے سے پہننا جانتی ہوں۔ جہاں تک اخلاقی قدروں کا تعلق ہے مجھے ان سے کبھی بھی زیادہ دل چسپی نہیں رہی۔ میں نے کبھی ایسے مرد کو جسے میں پسند نہیں کرتی۔ پیار کرنے کی اجازت نہیں دی —— یا یوں کہیئے کہ عام طور پر نہیں دی۔ الاّ یہ کہ اس کا بینک بیلنس بھاری بھر کم ہو —— امید ہے اس وضاحت سے آپ مجھے کافی حد تک سمجھ گئے ہوں گے۔

اکتوبر کی ایک صبح کا ذکر ہے کہ میں اپنے معمولی سے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جس عمارت کا یہ کمرہ تھا وہ اس سے بھی زیادہ معمولی تھی۔ اور یہ عمارت جس علاقہ میں واقع تھی وہ —— خیر چھوڑیئے جانے دیجئے —— میں بیٹھی ہوئی اپنی پریشان کن حالت پر غور کر رہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ حادثہ بجائے خود حیرت انگیز تھا خاص طور سے اس صورت میں کہ ٹیلی فون کا بل نہ معلوم کب سے ادا نہیں کیا گیا تھا۔

میں نے ریسیور اٹھایا تو کارلوس بات کر رہا تھا۔ میں یہاں کارلوس کے بارے میں تفصیلات بتا کر آپ کو بور نہیں کروں گی۔ سوائے اس کے کہ وہ بہت تیز آدمی تھا۔ بہت ہوشیار اور ذہین۔ دولت مند بھی تھا۔ اور یہ دولت اس نے عجیب وغریب طریقوں سے جمع کی تھی۔ میں اور کارلوس متعدد مواقع پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے

رہے تھے۔ اور ہمیشہ فائدے میں رہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بہت محتاط آدمی تھا اور پوری طرح پلاننگ کرنے کے بعد ہی کسی کام میں ہاتھ ڈالتا تھا ۔۔۔

" ہیلو ۔ ایلسی ۔۔۔ کیسی گزر رہی ہے ؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

" گزر نہیں رہی ہے۔ گزر چکی ہے ۔" میں نے جواب دیا۔ " تمہیں میرا فون نمبر کہاں سے معلوم ہوا ؟"

" میکس کے بارے۔ یہ بتاؤ کہ آجکل مالی حالات کیسے ہیں ؟"

" مالی ہی نہیں ہے تو حالات کیسے ہوں گے ۔" میں نے کہا " آخری تین چیک کسی بیلنس کے بغیر کاٹے گئے ہیں تمام زیورات گروی پڑے ہیں اور میں سوچ رہی ہوں کہ اس فلیٹ میں کب تک گرفتاری کے خطرے کے بغیر رہا جا سکتا ہے۔ لیکن تمہیں میرے حالات سے دفعتہً اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے ؟"

" اس لئے کہ میں نے ایک اور کام سوچا ہے۔" کارلوس نے جواب دیا۔ " آج رات مجھ سے سیولئے ہوٹل میں ملو۔ ہم کھانا کھاتے ہوئے باتیں بھی کرتے جائیں گے۔ اور ہاں ذرا شاندار لباس پہن کر آنا ۔۔۔ "

" ضرور ۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا " لیکن میں سیولئے ہوٹل تک پہنچوں گی کیسے ۔ بس پر ؟"

" اوہو " کارلوس نے سیٹی بجائی " تو نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں میں کسی کے ہاتھ کچھ رقم پیشگی بھجوانے کا انتظام کرتا ہوں۔ ذرا ٹھاٹ سے آنا۔ پورے ساز و سامان سے لیس ہو کر۔ کسی کو شکار کرنا ہے ۔"

" کیا پھر کوئی رومان وغیرہ کا چکر چلانا ہے ہو ۔" میں نے پوچھا۔ " کون ہے وہ ۔ کوئی گانٹھ کا پورا بزنس مین ہے ؟"

" تم آؤ تو سہی ۔ وہ لاجواب اسکیم سوچی ہے کہ بقول شخصے دولت کی بارش ہو جائے گی ۔"

" کیسی دولت ؟ ۔۔ کتنی دولت ؟" میں نے سوال کیا۔

" دیکھو بے بی ۔ اگر ہم نے ہوشیاری سے کام لیا ۔۔۔ یا زیادہ صحیح الفاظ میں تم نے ہوشیاری سے کام لیا تو بیس ہزار پونڈ کہیں نہیں گئے ہیں ۔ اس میں سے نصف رقم تمہاری ہو گی ۔ بولو کیا کہتی ہو ؟"

" بہت عمدہ ۔" میں نے جلدی سے کہا " میں ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل سیولئے پہنچ جاؤں گی ۔"

کارلوس نے اپنے وعدے کی پابندی کی اور مجھے تین سو پونڈ پیشگی بھجوا دیئے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے واقعی کوئی بہترین اسکیم سوچ رکھی تھی۔ میں نے اس رقم سے اپنے کچھ اچھے زیورات چھڑائے۔ جلدی جلدی کچھ کپڑے اور ضروری چیزیں خریدیں۔ اور اپنے نزدیک پوری طرح بن سنور کر سیولئے ہوٹل پہنچ گئی۔ کارلوس میرا انتظار کر رہا تھا۔ پہلے ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران اس نے کوئی بات نہیں کی۔ میرا مطلب ہے بزنس کی بات۔ پھر جب کھانے کے بعد ویٹر کافی کی ٹرے رکھ کر جا چکا تو اس نے پہلی مرتبہ زبان کھولی :

" میری باتیں غور سے سننا ۔" وہ بولا " اس لئے کہ اسکیم کی کامیابی کا زیادہ انحصار تمہاری بہترین اداکاری پر ہے۔ پارک سائڈ اپارٹمنٹ میں آج ایک آدمی آکر قیام پذیر ہوا ہے۔ اپارٹمنٹ نمبر ۴ پورا کا پورا اس کے پاس ہے۔ اس کا نام جسٹن میکال ہے اور وہ کناڈا کا باشندہ ہے۔ نوجوان آدمی ہے۔ زیادہ سے زیادہ انتیس تیس سال کا۔ اس کے بارے میں چار باتیں بڑی دلچسپ ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ کینیڈین پرچیزنگ مشن کے نمائندے کی حیثیت سے یہاں آیا ہے۔ یہ مشن بڑے بڑے جنگی تجارتی سودے کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ کناڈا کا ذہین ترین بزنس مین ہے۔ تیسری بات یہ کہ وہ اپنی بیوی کو بالکل پسند نہیں کرتا اور اس دورے پر تنہا آیا ہے۔ چوتھی اور آخری بات یہ کہ وہ بہت محتاط اور اپنے آپ کو لئے دیئے رہنے والا آدمی ہے صرف ایک ہی قسم کی عورتیں اسے متاثر کر سکتی ہیں ۔۔۔ جیسی کہ تم ہو ۔"

"خوب" میں نے ایک گہری سانس لی۔" اب میں کچھ کچھ سمجھنے لگی ہوں۔"

" میکال گزشتہ دو سال سے اپنی بیوی کو طلاق پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر وہ راضی نہیں ہوتی۔ اس کا یہ طرزِ عمل میکال کو اور زیادہ محتاط رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ کم سے کم کناڈا میں۔ مگر یہاں حالات مختلف ہو سکتے ہیں۔"

" ابھی تک تم نے بیس ہزار پونڈ کی کوئی بات نہیں کی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ بھی سُن لو" کارلوس نے جواب دیا" میرا خیال ہے کہ اگر تم میکال کو واقعی پھانسنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ تو وہ اس حقیقت کو راز رکھنے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کر سکتا ہے۔ خاص طور سے موجودہ حالات میں جبکہ وہ ایک بڑے سودے کی تکمیل کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا ہے۔ یہ معاہدہ کناڈا۔ امریکہ اور اس ملک کی حکومتوں کے درمیان ہونے والا ہے۔ ایسے موقع پر میکال اپنے خلاف کوئی اسکینڈل برداشت نہیں کر سکتا۔ اور پھر ایسی صورت میں جبکہ تم شادی شدہ عورت ہو۔"

" مگر میں شادی شدہ تو نہیں ہوں۔"

" درست ہے۔ لیکن یہ بات اسے کس طرح معلوم ہو سکتی ہے اس کے لئے تو تم میری بیوی ہو گی۔ مسز کارلوس وین۔ میرا مطلب ہے صرف دکھانے کی حد تک۔"

" یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔" میں تڑاخ سے بولی۔" اس سے پہلے کہ مجھے کبھی سچ مچ تم سے شادی کرنے کا خیال آئے میں اپنے آپ کو کسی زہریلے سانپ سے ڈسوانا زیادہ پسند کروں گی۔"

" میں سمجھتا ہوں بے بی۔" کارلوس نے سر ہلایا" اور اب ذرا تفصیل سے سُن لو کہ میری اسکیم کیا ہے، اور تمہیں کیا کچھ اور کس طرح کرنا ہوگا۔"

اس کے بعد کارلوس نے بڑے چچے تلے الفاظ میں بتایا کہ میکال کل سات بجے کسی بڑے آدمی کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے، کھانے کے بعد وہ سیدھا پارک سائڈ اپارٹمنٹ واپس جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں آٹھ بجے یا کچھ پہلے اس کی واپسی متوقع ہو گی کارلوس نے میرے لئے اسی اپارٹمنٹ کی دوسری منزل پر ایک کشادہ فلیٹ کا انتظام کر دیا ہے۔ جہاں ضرورت کے مطابق ہر چیز موجود ملے گی۔ جیسے ہی وہ واپس آئے مجھے اس پر جال پھینکنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ آجکل ہٹلر بلاناغہ روز شام کو آٹھ بجے کے قریب ہوائی حملے کرا رہا ہے۔ میں چاہوں تو اس صورتِ حال سے بھی خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکتی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ بس پھر ایک مرتبہ میری اس سے بات ہو جائے اس کے بعد کس طرح کیا کرنا ہے اس کا فیصلہ میں خود بہتر کر سکتی ہوں۔ مگر یہ کہ اسے حالات سے باخبر رکھا جائے۔

آٹھ بجنے میں بیس منٹ پہلے سے میں میکال کے استقبال کے لئے پوری طرح تیار بیٹھی تھی۔

کارلوس نے مجھے میکال کا حلیہ بتا دیا تھا۔ مگر وہ اتنا مبہم تھا کہ میں ذہنی طور پر اس کا کوئی تصور قائم کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن جب میں نے اس چھ فٹ لمبے تندرست جسم والے نوجوان کو بہترین سوٹ میں ملبوس کوریڈور میں آتے دیکھا۔ تو پہلی نظر میں ہی وہ مجھے بیحد پسند آیا۔ خاص طور سے اس کی مونچھیں جو اسی اسٹائل کی تھیں جیسی کہ میں پسند کرتی تھی۔ میں نے ایک نظر ڈالتے ہی اندازہ کر لیا کہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا کچھ ایسا مشکل ثابت نہیں ہو گا۔

اور پھر ٹھیک اسی لمحے ہوائی حملہ کا سائرن بجنے لگا۔ سائرن کی آواز کے ساتھ ہی ہائڈ پارک کی توپیں بھی گرجنے لگیں۔ میں نے صرف اتنی دیر انتظار کیا کہ وہ اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچ جائے۔ اور پھر میں کسی گھبرائی ہوئی دہشت زدہ ہرنی کی طرح کوریڈور میں نکل آئی۔ بالکل حواس باختہ انداز میں چند قدم بھاگی اور پھر ایک بلکی

دولت کا راز

محکمۂ انکم ٹیکس کے عملے نے پل ہگز نامی ایک شخص کو قابل ٹیکس آمدنی پر ٹیکس ادا نہ کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گرفتار ہونے پر اس پچاس سالہ ملازم نے بتایا کہ اس نے اپنی اسّی پونڈ ماہانہ آمدنی میں سے چھ ہزار پونڈ جمع کئے ہیں، کسی ناجائز طریقے سے نہیں۔ بلکہ اس طرح کہ اس نے کبھی مٹھائی نہیں چکھی، تمباکو نوشی سے ہمیشہ دور رہا، شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا، عورتوں کے ساتھ کبھی تفریح کے لئے نہیں گیا، شیو ہمیشہ اپنے بھائی کے بلیڈ سے بنایا۔ دادی کو جو رقم قرض دی اس پر بارہ فی صد سالانہ سود وصول کیا۔ دن اور رات دو ڈیوٹیاں انجام دیں۔ تیرہ سال تک کوئی سوٹ نہیں سلوایا۔ رات کو کام پر جاتے وقت اپنے باپ کے جوتے استعمال کرتا تھا، کبھی ایک پھول خریدنے پر بھی پیسہ صرف نہیں کیا۔ زندگی میں صرف ایک مرتبہ فلم دیکھی، دسترخوان پر جو چیز بھی آ گئی کھالیتا تھا۔ اپنے تمام کپڑوں کو جوڑ لگا لگا کر اور خود ہی سلائی کر کے پہنتا تھا یہاں تک کہ زیر جامے میں بھی پیوند لگے ہوئے تھے میں چھٹیاں گزارنے کبھی ایسے مقام پر نہیں گیا جہاں تین شلنگ گیارہ پینس سے زیادہ خرچ ہوں۔

کراہ کے ساتھ عین میکال کے سامنے قالین پر ڈھیر ہو گئی۔ یہ اداکاری میں نے اتنے بھر پور تاثر اور حقیقی انداز میں کی تھی کہ ہالی ووڈ کا کوئی بھی پروڈیوسر مجھے اپنی فلم میں لیڈنگ رول میں کاسٹ کر سکتا تھا بشرطیکہ میرے پاس ہالی ووڈ تک پہنچنے کا کرایہ ہوتا۔

میکال نے وہی کیا جو ایک نوجوان کو ان حالات میں کرنا چاہیئے اس نے جھک کر مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور دروازہ کھول کر اپنے فلیٹ میں لے گیا۔ کوئی شک نہیں کہ آدمی طاقتور بھی تھا۔ اس نے اسی آسانی سے مجھے اٹھایا جس طرح کوئی آٹھ دس سالہ بچی کو گود میں لے لے۔ اس وقت جیسا کہ آپ کو معلوم ہے آٹھ بجے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ نے لوگوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا۔ لوگوں کو قریب کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن جنگ نے مجھے اور میکال کو ایک دوسرے کے قریب ضرور کر دیا تھا کیونکہ جب میں اس کے فلیٹ سے باہر آئی ہوں تو دس بج رہے تھے۔ میں نے میکال کو بتایا تھا کہ مجھے ہوائی حملوں سے بے حد خوف آتا ہے، اس کی وجہ وہ بمباری ہے جو جرمنوں نے بارسلونا پر کی تھی۔ ان دنوں میں وہیں تھی۔ اس نے مجھے ہر طرح تسلی دی۔ سمجھایا۔ اور اپنی بہترین برانڈی پینے کو دی۔ پھر جب میں اس کے فلیٹ سے نکل کر کوریڈور میں چلتی ہوئی اپنے فلیٹ کی طرف جا رہی تھی تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی نظریں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے فلیٹ میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

میری کامیابی صرف یہیں تک نہیں تھی بلکہ اس نے اگلے دن شام کے آٹھ بجے مجھے اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت بھی دے دی تھی۔ آٹھ بجے اس لئے کہ اگر کل بھی ہوائی حملہ ہو تو وہ میری تسلی و تشفی کے لئے ساتھ ہی موجود رہے۔ یہاں مجھے آپ سے یہ اعتراف بھی کر لینا چاہیئے کہ اگلا دن اور اس کے بعد آنے والے دو دن تک میکال کے ساتھ میرا وقت بہت ہی اچھا گزرا میں حقیقت میں اس کی معیت سے بے حد لطف اندوز ہوئی تھی۔ کارلوس نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا بالکل درست تھا۔ جہاں تک اس کے اپنے کام کا تعلق تھا وہ بہت ہی ہوشیار اور تجربہ کار بزنس مین معلوم ہوتا تھا لیکن جہاں تک عورتوں کے ساتھ تعلقات کا معاملہ تھا وہ حد سے زیادہ سادہ لوح اور بالکل موم کی ناک واقع ہوا تھا۔

چوتھے دن میں دانستہ اس سے نہیں ملی۔ بہانہ یہ کیا کہ مجھے اپنے ایک عزیز سے ملنے جانا ہے۔ وہ اس پر بڑا افسردہ سا ہو گیا۔ کیونکہ ان تین دنوں میں وہ میرے بے حد قریب آ چکا تھا اور ایک طرح سے روزانہ ملنے کا عادی ہو گیا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ عزیز جس سے مجھے ملنے جانا تھا کارلوس کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

"کہو کیا رہا؟" اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"وہ میرے لئے دیوانہ ہو رہا ہے۔" میں نے جواب دیا

"جب بھی وہ میری طرف دیکھتا ہے تو اس کی آنکھوں سے اتنی محبت کا اظہار ہوتا ہے کہ مجھے اس پر رحم آنے لگتا ہے۔ اس نے مجھے اپنی بیوی اپنے کاروبار اور دوسری باتوں کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کروڑ پتی نہیں تو لکھ پتی ضرور ہے۔ کہتا ہے کہ پرچیزنگ مشن کا نمائندہ تو وہ محض ایک مشغلے کے طور سے بنا ہوا ہے ورنہ اسے دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

"میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ بیس ہزار پونڈ تو اس کے لئے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتے۔" کارلوس خوش ہو کر بولا۔

اس کے بعد ہم نے اپنی اسکیم کی کچھ مزید تفصیلات پر گفتگو کی۔ ہم دونوں کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔

اگلی شام میں نے میکال کے ساتھ گزاری۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم پارک سائڈ اپارٹمنٹ واپس آگئے۔ نو بجے کے قریب میں نے اس کے فلیٹ میں اس کے اور اپنے لئے چائے بنائی۔ اور ساڑھے نو بجے میں نے پہلی مرتبہ اسے اپنی داستانِ حیات سنانا شروع کی۔ وہ خاص کہانی جو میں نے اور کارلوس نے مل کر اسے سنانے کے لئے تیار کی تھی۔

دس بجے جبکہ میکال مجھے تسکین پہنچانے کے خیال سے دوسرے کمرے میں شیمپین لینے گیا ہوا تھا میں نے بڑی ہوشیاری سے دروازے کی کنڈی کھول دی۔ سوا دس بجے میں اپنی داستان کا بقیہ حصہ اسے سنا رہی تھی۔ اس وقت داستان کلائمکس پر پہنچی ہوئی تھی۔ میری آواز میں لرزش تھی، ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی صاف جھلک رہی تھی۔ الفاظ رک رک کر اور اٹک اٹک کر میری زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ میری کہانی ہی کچھ ایسی دل گداز تھی کہ بھرپور تاثر پیدا کرنے کیلئے مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑا تھا۔ دس بجکر بیس منٹ پر میں میکال کے بازوؤں میں تھی۔ اور وہ بڑے خلوص و ہمدردی سے مجھے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے ذرا سی فکر نہ کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔

عین اس وقت کارلوس بڑے ڈرامائی انداز میں فلیٹ کے اندر داخل ہوا۔ وہ بھی کچھ کم ماہر نہیں تھا اداکاری میں' اس وقت وہ اپنے ہر ہر انداز سے ایک ایسا شوہر نظر آرہا تھا جس نے اپنی بیوی پر پورا اعتماد کیا ہو مگر اس کی بیوی اس کو دھوکا دے کر اپنے دوستوں کے ساتھ دادِ عیش دیتی ہوئی پکڑی گئی ہو۔

"تو آخر کار میرا شبہ درست نکلا۔" اس نے برف جیسی سرد آواز میں کہا۔ "میں گزشتہ کئی دن سے تمہاری حرکات و سکنات کی نگرانی کر رہا ہوں۔ تم آوارہ بدمعاش ہرجائی ...."

"ایک منٹ۔" میکال نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ "یہ کون آدمی ہے ولما؟"

میری نظریں فرش کی جانب جھک گئیں۔ آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل کر قالین میں جذب ہو گئے۔ "جسٹن۔" بھرائی ہوئی آواز میں میرے منہ سے نکلا "کاش میں نے تمہیں بتا دیا ہوتا۔ یہ کارلوس وین ہے۔ میرا شوہر۔"

اتنا کہہ کر میں نے کارلوس کی طرف دیکھا۔ دفعتہً میری آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں برسنے لگیں۔

"اُف میرے خدا میں تم سے کتنی شدید نفرت کرتی ہوں۔" میں تیز چیختی ہوئی آواز میں بولی۔

"ضرور کرتی ہوگی" کارلوس نے سر ہلایا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میری بیوی ہوتے ہوئے دُوسروں کا پہلو گرم کرتی پھرو۔"

اس نے میکال کی طرف دیکھا۔

"مسٹر میکال یہ بات حد درجہ افسوسناک ہے مگر ظاہر ہے کہ ہمیں دُنیا کے سامنے تماشا نہیں بننا چاہیئے۔ میں عدالت میں اپنی بیوی کے خلاف طلاق کا مقدمہ دائر کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جس میں تمہیں طلاق کی بنیادی وجہ ظاہر و ثابت کیا جائیگا اگر تمہیں اس مسئلے پر کچھ گفتگو کرنا ہو تو کل صبح گیارہ بجے کر سکتے ہو۔"

"بہت خوب۔" میکال نے بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا "میں تمہارا انتظار کرونگا۔"

میں نے یہ موقع مناسب جانا اور چپ چاپ فلیٹ سے باہر آ گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کارلوس کے جانے کے بعد مجھے میکال کے سوالات کے جوابات دینا پڑیں۔ نصف گھنٹے کے بعد کارلوس نے مجھے فون کیا۔

"بے بی تمہاری اداکاری لاجواب تھی۔" وہ کہہ رہا تھا "میرا خیال ہے کہ کیوں نہ رقم میں پانچ ہزار پونڈ کا اضافہ کر دیا جائے۔"

ریسیور واپس کریڈل پر رکھنے کے بعد میں خاموشی سے بستر پر بیٹھ گئی۔ میں اس موقع پر آپ لوگوں کے سامنے ایک اور اعتراف کرنا چاہتی ہوں کسی نامعلوم وجہ سے میں اپنی کامیابی پر خوش ہونے کے بجائے کچھ مضطرب اور پریشان سی تھی۔ نامعلوم کیوں اب میکال سے بیس ہزار پونڈ کی خطیر رقم وصول کرنے اور اس کا نصف حصہ پانے کے تصور میں کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ میں کوئی جذباتی عورت نہیں ہوں بلکہ اس کے برعکس مجھے اپنے ٹھنڈے دل و دماغ پر ہمیشہ ناز رہا ہے۔ لیکن اس وقت میں کچھ دوسری ہی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر شراب کا ایک گلاس پیتے ہوئے اپنے جذبات کا جائزہ لیا۔ کیا مجھ سے کہیں کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ اور پھر یکبارگی ایک زبردست جذباتی صدمے کیساتھ حقیقتِ حال مجھ پر واضح ہوگئی۔ اپنی زندگی میں پہلی اور شاید آخری مرتبہ میں سچ مچ کسی مرد کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔

مجھے میکال سے محبت ہوگئی تھی۔ میں ایک اضطراب کے عالم میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور بیتابی کے ساتھ کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ ٹہلتی رہی۔ سوچتی رہی۔ یہاں تک کہ پورا ایک گھنٹا مجھے اس جذباتی کشمکش میں گزر گیا کہ اب میرا آئندہ اقدام کیا ہونا چاہیئے۔ آخر کار میں ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گئی۔ اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ مجھے سب کچھ میکال کو بتا دینا چاہیئے خواہ اس کے نتیجہ میں کارلوس کتنا ہی بگڑے اور خفا ہو یا آئندہ مجھے اپنی کسی اسکیم میں شریک نہ کرے۔ خواہ مجھے پھر اسی مفلسی کی حالت میں کیوں نہ واپس جانا پڑے۔ مجھے اب کسی بات کی کوئی پروا نہ تھی۔

آدھی رات کو میں نے اپنا قیمتی لباس اتار کر ایک سادہ سا سیاہ رنگ کا سوٹ پہن لیا۔ پھر اپنی تمام چیزیں پیک کیں۔ اس سے فارغ ہو کر فلیٹ سے باہر نکلی اور میکال کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پہ ایک ہلکی ہمدردانہ مسکراہٹ آگئی۔

"جسٹن۔" میں نے آہستہ مگر مضبوط لہجے میں کہا "میں تم سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔ میں پندرہ منٹ سے زیادہ تمہارا وقت نہیں لوں گی۔ اس کے بعد غالباً تم مجھے دھکے دیکر اپنے فلیٹ سے باہر نکال دوگے۔ لیکن جب تم ایسا کروگے تو سچ جانو میں اس وقت کے مقابلے میں کہیں زیادہ مسرور و مطمئن ہوں گی۔ خدا کیلئے اسے کوئی مذاق مت سمجھنا۔"

"ڈارلنگ میں بھلا تمہاری کسی بات کا مذاق اُڑا سکتا ہوں!" میکال نے بڑی محبت سے جواب دیا "اندر آجاؤ۔ میں خود تمہارے بارے میں بیحد فکرمند اور پریشان ہوں..... اور..... یہ تم نے کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں!"

"اس کی ایک وجہ ہے" میں نے اندر آتے ہوئے کہا "تم سے گفتگو کرنے کے بعد میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے رخصت ہو رہی ہوں۔"

"نہیں۔ تم کہیں نہیں جا سکتیں۔" میکال نے بڑی خوداعتمادی سے کہا اور پھر ہوٹل کی روم سروس کو فون کر کے بہترین قسم کی چائے بھیجنے کے لئے کہا۔ چائے آئی اور پی گئی۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ میں نسبتہً کچھ پُرسکون حالت میں ہوں تو سگریٹ سلگاتے ہوئے مجھ سے اپنی بات سنانے کے لئے کہا۔ اس وقت وہ مجھ سے تین یا چار فٹ کے فاصلے پہ ایک آرام کرسی کے ہتھے پہ بیٹھا ہوا میری طرف



دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے اتنی پُر کشش سحر انگیز مسکراہٹ پہلے کبھی کسی اور کے ہونٹوں پر دیکھی ہو۔

میں نے شروع سے آخر تک پوری کہانی حرف بحرف سنادی۔ اپنے بارے میں۔ کارلوس کے بارے میں سب کچھ پوری تفصیل سے کہہ سُنایا۔ وہ بڑے اطمینان اور دلچسپی سے میری باتیں سنتا رہا۔

"اب جبکہ تم ساری حقیقت سے واقف ہو چکے ہو بتاؤ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" میں نے آخر میں پوچھا "آیا تم مجھ پر احسان کرتے ہوئے مجھے صرف یہاں سے نکل جانے کا حکم دو گے یا پھر پولیس کو فون کر کے مجھے گرفتار کرانے کا ارادہ ہے۔؟"

"میں یہ کچھ بھی نہیں کروں گا" میکال نے جواب دیا "تمہیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکیں اب جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسے توجہ سے سنو۔ میرے خیال میں تم ایک بہت ذہین اور ہوشیار عورت ہو۔۔۔ کارلوس بھی خاصا عقلمند آدمی ہے، لیکن تم دونوں ایک اہم بات نظر انداز کر گئے۔ تم میں سے کسی نے یہ نہیں سوچا کہ میری جیسی ذمہ دار پوزیشن پر کوئی آدمی اس لئے نہیں پہنچتا کہ وہ اوّل درجہ کا احمق اور سادہ لوح ہے۔ تمہیں یہ سُن کر حیرت نہیں ہونا چاہیئے کہ میں شروع سے ہی تمہاری اور کارلوس کی حقیقت سے واقف تھا تم سے پہلے کناڈا اور امریکہ میں بھی مختلف عورتوں نے مختلف مقاصد کے لئے مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کی ہے۔ جس سے عام طور پر ان کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ ان معاہدے اور سودے کی تفصیلات سے واقف ہو سکیں جس پر میں اس وقت کام کر رہا ہوتا ہوں۔ چنانچہ میرا یہ معمول ہے کہ جب بھی کوئی خوبصورت مگر اجنبی عورت میرے راستے میں آتی ہے تو میں اس کے بارے میں اپنے طور پر ضروری معلومات ضرور حاصل کر لیتا ہوں۔"

"اوہ میرے خدا!!" بے اختیار میرے منھ سے نکل گیا۔

"لیکن اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا" میکال نے اپنی گفت گو جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے نزدیک جس بات کی واقعی اہمیت ہے وہ یہ ہے کہ تم خود چل کر میرے پاس آئیں اور کسی جبر و کراہ کے بغیر اپنی مرضی سے ساری بات سچ سچ بیان کر دی۔ تمہیں یقین تھا کہ اس کے بعد میری نظروں میں تمہاری کوئی عزت نہیں رہے گی۔ تم جانتی تھیں کہ اگر میں نے بہت شرافت سے کام لیا تو تمہیں فلیٹ سے نکال باہر کروں گا ورنہ دوسری صورت میں میں تمہیں پولیس کی حراست میں بھی دے سکتا ہوں، صرف یہی ایک بات یہ ظاہر کرتی ہے کہ تمہیں مجھ سے کتنی بے پایاں محبت ہے۔ یہاں تک کہ تم اس محبت کی خاطر کارلوس کی دشمنی اور گرفتاری کا خطرہ تک مول لینے کے لئے تیار ہو گئیں صرف اس لئے کہ اپنے نزدیک مجھے بلیک میل ہونے سے بچا سکو۔ اور میرے نزدیک یہ بڑی اہم بات ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لئے مائی ڈارلنگ کہ میں تم سے شادی کرنے والا ہوں۔" میکال نے جواب دیا۔ میں ایک سکتے کے عالم میں اسکی صورت دیکھے جا رہی تھی۔ بولنے کی کوشش کرنے کے باوجود میرے منھ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"میرے بارے میں کارلوس کی معلومات بڑی حد تک دُرست تھیں۔" میکال نے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "لیکن میری بیوی کے متعلق وہ ایک بات میں دھوکا کھا گیا۔ میں اور میری بیوی برسوں سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ میری تمام تر

کوشش کے باوجود وہ طلاق لینے پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے دو ماہ پیشتر وہ کسی دوسرے آدمی کی محبت میں مبتلا ہوگئی۔ اس کے بعد وہ خود مجھ سے آکر ملی اور ہم بڑی خاموشی سے ایک دوسرے کو طلاق دینے پر آمادہ ہوگئے۔ اس نے نیویارک کی ایک عدالت میں طلاق کی درخواست دیدی ہے۔ نیویارک کی عدالت سے منظور کردہ طلاق کی ڈگری کناڈا میں بھی تسلیم کی جاتی ہے۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے اندر میں اس کے بوجھ سے آزاد ہو جاؤں گا اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا اس کے بعد تم مسز جسٹن میکال بننا پسند کروگی؟"

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آیا اور مجھے شانوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے ہونٹ میرے بالوں کو چوم رہے تھے۔ میرے منہ سے ایک بات بھی نہ نکل سکی اور پیچھے کہنے کے لئے کوئی بات اب تھی بھی کہاں؟ میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہانے کے علاوہ اور کچھ بھی نہ کرسکی۔ لیکن یہ کیفیت دس پندرہ منٹ تک ہی رہی۔ پھر جیسے میرے ذہن نے دوبارہ کام کرنا شروع کردیا۔ میں چونک کر اس سے علیحدہ ہوگئی۔

"ایک بات اب بھی مجھے پریشان کر رہی ہے۔" میں نے میکال سے کہا۔

"وہ کیا ہے؟"

"کارلوس" میں نے جواب دیا۔ "کیا یہ کوئی اچھی بات ہوگی کہ تم مجھ سے شادی کرلو اور کارلوس ساری دنیا میں یہ کہتا پھرے کہ تمہاری بیوی ایک آوارہ اور دھوکے باز عورت ہے جسے اس نے تمہیں بلیک میل کرنے کے لئے اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔ تم نے اس پر بھی غور کیا ہے؟"

"تم یہ سب باتیں مجھ پر چھوڑ دو۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں خود بھی کارلوس کو کوئی اچھا آدمی نہیں سمجھتا اور مجھے اس بارے میں تم سے قطعی اتفاق ہے کہ اس کا منہ بند کرنے کا کوئی انتظام ہونا ضروری ہے۔ اب تم نے ذکر کیا ہے تو میں بتاتا ہوں کہ میں اس سلسلہ میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

میں بڑی دلچسپی سے میکال کی باتیں سن رہی تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے یقین ہوتا جارہا تھا کہ جسٹن میکال کارلوس سے کہیں زیادہ عقلمند اور ذہین انسان ہے۔

"کارلوس کل صبح گیارہ بجے میرے پاس آرہا ہے" میکال کہہ رہا تھا "ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا کہ ہم سب کی بھلائی اسی میں ہے کہ میں اسے بیس ہزار پونڈ ادا کردوں۔ یہ رقم لیکر وہ چلا جائیگا اور پھر کبھی مجھے پریشان کرنے نہیں آئے گا۔ میں اسکی یہ پیشکش منظور کر لینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہاں بھی بینکوں میں بیشمار روپیہ کمیشن کے اکاؤنٹ میں موجود ہے جسے تصرف میں لانے کا مجھے پورا اختیار حاصل ہے۔ میں اسے بیس ہزار پونڈ کا بیئرر چیک دیدوں گا۔ وہ چیک بنک سے کیش کرالے گا۔ تم اس معاملے میں کارلوس کے پارٹنر کی حیثیت سے شامل ہوئی تھیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری ذات سے تمہارے پارٹنر کو کوئی نقصان پہنچے۔ چنانچہ صرف تمہاری خاطر میں اسے بیس ہزار پونڈ کی رقم لیکر چپ چاپ نکل جانے کا موقع دیدوں گا۔ لیکن آئندہ اگر کبھی اس نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو بس میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ خدا اسکی حالت پر رحم کرے۔"

میں نے چونک کر میکال کی طرف دیکھا۔ اور اس وقت مجھے اس کی آنکھوں میں جو چمک نظر آئی اسے دیکھ کر میرا دل کانپ گیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ کم سے کم میں کبھی اس شخص کی جگہ لینا پسند نہیں کرونگی جسے بزعم خود جسٹن میکال کی دشمنی کا دعویٰ ہو ـــــ

اس کے بعد میکال نے مجھے تسلی دیتے ہوئے بڑی محبت سے اپنے فلیٹ میں واپس جانے کے لئے کہا۔ اتنا ہی نہیں اس

نے مجھے سو پونڈ کا ایک نوٹ دیا کہ میں کارلوس کے دیئے ہوئے ملبوسات واپس کر کے اس رقم سے اپنے لئے دوسرے کپڑے خرید لوں۔ وہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں دیکھنا چاہتا تھا جس کا تعلق کارلوس سے ہو۔ اس کے بعد اس نے کل شام ساڑھے سات بجے سیوائے میں اپنے ہمراہ ڈنر کھانے کی دعوت دیتے ہوئے مجھے رخصت کر دیا۔

دوسرے دن میری آنکھ کھلی تو صبح کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ آنکھ کھلنے کے بعد بھی میں دیر تک بستر میں لیٹی ہوئی کچھ سوچتی رہی۔ میں کوئی ایسا طریقہ سوچ رہی تھی جس سے میکال پر اپنی بے پناہ محبت کا بھرپور اظہار کر سکوں اچانک مجھے ایک انوکھا خیال سوجھ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ آج صبح گیارہ بجے میکال نے اپنے کہنے کے مطابق کارلوس کو بیس ہزار پونڈ کا بیئرر چیک دے دیا ہوگا اور یقینی بات ہے کہ اس نے کارلوس کو میرے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا ہوگا۔ کارلوس اب بھی مجھے اپنا پارٹنر ہی سمجھ رہا ہوگا۔ چنانچہ میں کسی خطرے کے بغیر اس سے اپنے حصے کے دس ہزار پونڈ وصول کر سکتی ہوں۔ پھر اس سے رقم لیکر میکال کو واپس کر دوں گی۔ اس طرح کم سے کم میں اس کے نقصان کو بقدر نصف کم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گی۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے کارلوس کو فون کیا اور پھر اس کا پہلا فقرہ سنتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے بتایا کہ میکال نے اسے بیس ہزار پونڈ کا بیئرر چیک دیدیا تھا جسے اس نے بڑی آسانی سے کیش بھی کرا لیا ہے اور یہ کہ میں جب چاہوں اپنے دس ہزار پونڈ نفی تین سو پونڈ جو اس نے بطور پیشگی دیئے تھے اس سے وصول کر سکتی ہوں۔

میں نصف گھنٹے میں تیار ہو کر کارلوس کے پاس جا پہنچی اور اس سے نو ہزار سات سو پونڈ وصول کر لئے۔ انہیں ایک لفافے میں بند کیا اور پارک سائڈ اپارٹمنٹ واپس آئی۔ دوسری منزل پر جاکر میکال کے دروازے پر دستک دی اور جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا وہ لفافہ اس کے ہاتھ میں دیدیا۔

"میں تم سے شام کو ملوں گی ڈارلنگ۔" میں نے کسی نوعمر لڑکی کی طرح شرماتے ہوئے کہا اور اپنے فلیٹ کی طرف بھاگ گئی۔

اس شام کے ڈنر کی تیاری میں نے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ کی تھی۔ ایک بیوٹی شاپ میں جا کر بالکل نئے انداز اور نئے اسٹائل سے بال بنوائے۔ بہترین اور اپنی انتہائی پسندیدہ فراک اور دوسری ضروری چیزیں بازار سے خریدیں اور ٹھیک ساڑھے سات بجے بن ٹھن کر سیوائے ہوٹل پہنچ گئی۔ ابھی تک میکال نہیں آیا تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ کارلوس موجود تھا۔ وہ ایک کونے کی میز پر بیٹھا ہوا برانڈی پی رہا تھا ـــــ اور اتنا بجھا ہوا بلکہ پریشان اور خوفزدہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس سے پہلے کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی میز پر بلا لیا۔

"بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

میں اس کے الفاظ سے زیادہ اس کی حالت پر حیران تھی، سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کارلوس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ میں نے دیکھا کہ لائٹر جلاتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔

"سنو بے بی۔" اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا "میری اور تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس جگہ سے رخصت ہو جائیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم کس مقام کو اپنے لئے محفوظ خیال کرو گی لیکن میرا ارادہ کچھ وقت اسکاٹ لینڈ کے جنگلات میں گزارنے کا ہے۔"

"یہ تم کیا بے تکی باتیں کر رہے ہو؟" میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

"غور سے سنو ایلسی۔ آج دوپہر جب تم اپنے حصے کی رقم لیکر

جا چکی تھیں تو میکال نے مجھے فون کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب صبح گیارہ بجے میں اس سے بیس ہزار پونڈ وصول کرنے آیا تو برابر کے کمرے میں اس کا وکیل اور دو اور گواہ موجود تھے جنہوں نے مائکروفون پر میرے اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ صرف سُنی ہے بلکہ ریکارڈ بھی کرلی ہے۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ یا تو میں چُپ چاپ رقم واپس کردوں یا پھر وہ پولیس کو میری گرفتاری کیلئے بھیجتا ہے۔"

کارلوس نے بے بسی کے انداز میں شانے جھٹکے۔

"اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے ٹھیک وہی کرنیکا ارادہ بھی رکھتا ہے۔ اس حالت میں میرے پاس دس ہزار پونڈ واپس کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے اسے رقم واپس کردی اور کہا کہ باقی دس ہزار تم لیکر جا چکی ہو۔ اس پر وہ بولا کہ تم پہلے ہی اپنی رقم اس کے حوالے کرچکی ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اب تک میری سمجھ میں خاک نہیں آیا تھا کہ آخر وہ اتنا خوفزدہ کیوں ہے؟

"اس کے بعد میں اپنے فلیٹ واپس آگیا۔" کارلوس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہاں ایک کیبل میرے نام آیا رکھا تھا یہ میرے کناڈا کے ایک دوست نے بھیجا تھا۔ وہی دوست جس نے ابتدا میں مجھے میکال کی آمد اور اس کی موجودگی کے مقصد سے آگاہ کیا تھا۔ یہ ہے وہ کیبل۔ تم خود ہی پڑھ لو۔"

کارلوس نے اپنی جیب سے ایک تار نکال کر میرے سامنے ڈال دیا۔ میں نے اٹھا کر پڑھا۔ لکھا تھا:

"جسٹن میکال ابھی کناڈا سے روانہ ہی نہیں ہوا۔
بالکل ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ وہ آدمی جسے میں نے غلطی سے میکال سمجھ لیا تھا ولی میک ہے۔
ایک شاطر بدمعاش جو لندن میں خود کو جسٹن میکال ظاہر کرکے کوئی ذاتی فائدہ اٹھانے کی اسکیم بنا رہا ہے۔
ہوشیار رہنا۔"

میں نے کیبل واپس میز پر رکھ دیا۔

"اوہ میرے خدا!" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا" اور میں اسے ایک شریف آدمی سمجھ کر اس کی محبت کا دم بھرنے لگی تھی۔" غصہ سے میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

"بہرحال جو ہونا تھا وہ ہوا۔" کارلوس بولا۔ "اس نے ہمیں اچھی طرح بیوقوف بنایا ہے۔ مگر میں اب یہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا۔"

"یہ تم بار بار بھاگنے کی بات کیا کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا "وہ بدمعاش ہمارے خلاف کیا کرسکتا ہے؟"

"کیا تم اب بھی نہیں سمجھ سکیں کہ ہم نے کتنی بڑی حماقت کی ہے۔" کارلوس نے مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیوقوف لڑکی ہم نے ایک جعلی چیک کیش کروایا ہے جو اس بدمعاش ولی میک نے مجھے لکھ کر دیا تھا۔ بینک نے اسے اصلی تصور کرتے ہوئے حقیقی جسٹن میکال کے اکاؤنٹ سے کیش کردیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اس جعلسازی میں ولی میک کے ساتھی قرار دیئے جائینگے۔ اب بھی سمجھ میں آیا یا نہیں؟"

"آگیا۔ بالکل سمجھ میں آگیا" میں نے انتہائی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تم میرے لئے برانڈی اور سوڈا منگوا رہے ہو یا نہیں۔"

"منگوا لو۔ مگر میری جیب میں کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔" کارلوس نے منہ بنایا ——— "اور یہ کہ میں اس کے بعد مزید ایک سیکنڈ بھی رُکنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔"

میرا خیال ہے کہ میری رُوداد پڑھنے کے بعد اب تو آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ عورتیں کتنی قوتِ برداشت کی مالک ہوتی ہیں۔ زندگی کی پہلی اور آخری محبت کی شکست اور ناکامی کا صدمہ کم نہیں ہوتا!! ——— جان لیوا، جانگسل اور کربناک، لیکن میں اس کو برداشت کرچکی ہوں۔

••

ممکن ہے ایسا واقعہ آپ نے پہلے نہ پڑھا ہو



سب رنگ کا سب سے **مقبول** سلسلہ



ایک **پُراسرار** آپ بیتی

گزشتہ قسطوں کے **مکمل خلاصے** کے ساتھ

جمیل احمد خان

رام دیال سے میری دوستی زیادہ پرانی نہ تھی لیکن وہ اور اس کی ماں پردیس میں میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ البتہ رام دیال کی ماں مجھے کچھ عجیب اور ناقابلِ فہم معلوم ہوتی تھی۔ اس کا آئے دن برت رکھنا۔ آدھی آدھی رات کو مرگھٹ جانا اور پجاری پنڈتوں سے گھنٹوں بیٹھ کر سرگوشیاں کرنا، اُسکے یہ تمام مشاغل میری سمجھ میں نہیں آتے تھے! ایک روز رام دیال کی ماں نے اپنی شفیق آواز میں کہا کہ اگر میں اس کے بتائے ہوئے منتر پڑھ ڈالوں تو میری دنیا بدل سکتی ہے، میں انکا کو اپنے قبضے میں کرکے تمام عمر عیش کرسکتا ہوں۔ مجھے ان لغویات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے میں نے رام دیال کی ماں کی بات پر کان نہ دھرے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد رام دیال کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ رات کو میں اس کے کریاکرم میں شرکت کرنے مرگھٹ گیا میری واپسی رات گئے ہوئی، صبح جب میں دفتر جارہا تھا تو اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ہلکی پھلکی چیز میرے سر پر آن گری ہو۔ میں نے سر کو بار بار جھٹکا،



انگلیوں سے بالوں میں کنگھی بھی کی لیکن بے سود، کوئی پُراسرار شے میرے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ میں اپنے سر میں باریک باریک پنجوں کی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ اس پُراسرار وجود نے، جسے میرے ذہن نے ایک خوبصورت اور نازک اندام لڑکی کی شکل دے رکھی تھی مجھے اپنا نام "انکا" بتایا اور کہا کہ اگر میں اس کے اشارے پر چلتا رہا تو بہت جلد بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ انکا نے اپنی نوازشوں کے عوض میں مجھ سے اپنے احکام کی تعمیل کا عہد بھی لے لیا تھا۔

تقریباً بیس روز ہوئے تھے کہ میں انکا کی حیرت انگیز قوتوں سے خاصا آسودہ حال بن گیا اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگا۔ ایک روز کا ذکر ہے، میں حسب معمول شام کو پارک میں بیٹھا اپنی محبوبہ نرگس اصفہانی کو پُرشوق نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ جمشید نامی ایک شخص اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ انکا نے جب یہ بتایا کہ جمشید نرگس کا منگیتر ہے تو رقابت کا ایک شدید جذبہ میں نے اپنے اندر محسوس کیا۔ پھر جب انکا نے مجھے حکم دیا کہ میں جمشید کو قتل کر ڈالوں تو میں انکار نہ کر سکا۔ مجھے مجبوراً انکا کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اسے انسانی خون فراہم کرنا پڑا، مگر دوسرے دن جب جمشید کی لاش کی تفصیل اخبارات میں چھپی تو میں گرفتاری کے خوف سے اور نرگس کے مشورے پر بمبئی بھاگ گیا۔ بمبئی میں انکا کی پُراسرار قوت نے مجھے لاکھوں روپے کا مالک بنا دیا۔ گاڑی، بنگلا، نوکروں کی فوج۔ میں دن میں ریس کھیلتا اور رات کو میری خوابگاہ کسی حسین دوشیزہ کی خوشبو سے معطر ہوتی، شراب و شباب کی سرمستیوں میں، میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ انکا مجھ سے ایک خطرناک عہد لے چکی ہے۔ بہر حال ایک روز دوسری بار انکا کے کہنے پر مجھے طوعاً و کرہاً کملا نامی ایک خوبصورت لڑکی کو قتل کرنا پڑا۔ انکا نے اس بدنصیب لڑکی کا سارا خون بھی اپنے وجود کو تقویت بخشنے کی خاطر پی ڈالا۔

کملا کی موت کی خبر چھپی نہ رہ سکی، میں نے پولیس کو ڈیڑھ لاکھ روپے کی خطیر رقم دے کر کسی نہ کسی طرح گلوخلاصی حاصل کر لی مگر عدالتوں اور تھانوں کے چکر نے میرے اوسان خطا کر دیئے۔ میں نے انکا سے درخواست کی کہ وہ اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے کوئی اور ذریعہ تلاش کرے تو وہ مجھ سے خفا ہو گئی۔ لیکن میرے سر سے چپکی رہی۔ اس عرصے میں نرگس اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر بمبئی آ گئی۔ میں نے اس سے شادی کر لی اور بُری عادتوں کو چھوڑ کر نرگس میں گم ہو جانا چاہا، انکا نے اپنی ناراضگی کا انتقام یوں لیا کہ میرے برطرف شدہ ملازم کو ایک بدنام شخص کلن خاں کے ہاتھوں قتل کرا دیا اور کلن خاں سے عدالت میں یہ بیان دلوا دیا کہ اس نے ایک لمبی رقم کے عوض میرے ایماء پر قتل کیا ہے۔ میں نے ہر چند اپنی بے گناہی کا یقین دلایا اور عدالت کو بتایا کہ ایک پُراسرار عورت میرے سر پر سوار ہو گئی ہے جس کے حکم کا میں تابع ہوں اور جو کچھ میں نے کیا ہے اس کے اشارے پر کیا ہے، لیکن کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ کملا اور رحمت علی کے قتل کے جرم میں مجھے چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔

قید خانے میں جب میں خوفناک مجرموں جیسی دی جانے والی سزائیں بھگت رہا تھا تو کچھ دنوں بعد میں نے انکا کو ایک بار پھر اپنے سر پر محسوس کیا، انکا نے مجھ سے کہا کہ اگر میں ہر ماہ کے بجائے چار ماہ میں بھی اس کے لئے انسانی خون فراہم کرنے پر آمادہ ہو جاؤں تو وہ اپنی پُراسرار قوت کے ذریعے مجھے چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ میں نے نرگس کی پریشانیوں کی خاطر اس کی بات مان لی اور اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے جیلر نے بتایا کہ کلن خاں اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہو گیا ہے۔ تحریری طور پر اس نے میرے ملازم بلکہ کملا کے قتل کا بھی اقرار کر لیا ہے اور میری بیوی نے عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی ہے۔ کلن خاں کے منحرف بیان اور نرگس کی اپیل کے بعد مجھے باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔ میری گرفتاری اور رہائی کا یہ سارا کھیل انکا کی پُراسرار قوت کا کرشمہ تھا۔ مگر میں نے دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اپنے سر پر قابض اس خطرناک وجود سے چھٹکارا پانے کی پوری کوشش کروں گا چاہے اس کا انجام کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو۔ مگر میں اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا میں نے انکا سے فرار حاصل کرنا چاہا لیکن انکا میرے سر پر مسلط رہی، وہ نرگس سے بھی ناراض ہو گئی کیونکہ اُسنے مجھے انکا سے نجات دلانے کے لئے شولاپور میں کسی بزرگ کی درگاہ کا رُخ کیا تھا۔ اسکے بعد مجھے نہ جانے کتنے معصوم انسانوں کو انکا کے ایماء پر موت کے گھاٹ اُتارنا پڑا، کتنے لوگ مر گئے ——— میں جب انکا سے ناراض ہوا تو اس نے بھیانک انتقام لیا، ہماری ہر ترکیب ہر کوشش ناکام ہو گئی، انکا کو دیر سے سہی مگر ہر بات کا پتا چل جاتا۔ جیل کا ظالم سنتری شہباز قتل ہوا، کلن خاں بھی انکا کا شکار ہو گیا۔ میرے منیجر کو اس نے نرگس کے ہاتھوں قتل کروا ڈالا۔ اس نے ہر بار مجھے عبرتناک سزا دی اور مجھے اپنے ننھے وجود کی پراسراریت سے ڈرایا دھمکایا۔ وہ مجھے کسی نہ کسی جُرم میں پھنساتی اور رہا کراتی رہی، میری زندگی تلخ ہو چکی تھی، دولت مجھے اب بے کار معلوم ہوتی۔ نرگس نے میرے ساتھ سکھ کا کوئی

دن نہیں گزارا تھا، کوئی صورت ایسی نہیں بنتی تھی کہ انکا میرے سر سے ہٹ جائے۔ کبھی کبھی وہ میرے سر سے چلی جاتی جب اسے میرے خلاف یا میرے حق میں دوسرے کسی شخص سے کوئی کام کرانا ہوتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں، میں اور نرگس پروگرام بناتے مگر اسے سب معلوم ہوجاتا تھا اور آتے ہی وہ کسی نئی مصیبت میں مجھے مبتلا کر دیتی۔ میں چونکہ کمبئی میں مشکوک ہو چکا تھا لہٰذا چند دنوں کے لئے دہلی آگیا۔ یہاں نرگس نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دینے اور انکا کے چنگل سے میری نجات کی دعا مانگنے کی کوشش کی۔ مگر راستے ہی میں انکا میرے سر پر سوار ہوگئی اور اس نے ہماری اس کوشش کو بھی ناکام بنا دیا۔ نرگس کو اس کی اس جرأت پر ایک ناقابلِ بیان صورتحال سے دوچار کر دیا۔ نرگس مجھے اچانک چھوڑ کر چلی گئی اور میری آنکھوں نے اسے شارع عام پر ایک اجنبی شخص کے ساتھ شرمناک حالت میں دیکھا، نرگس نے مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ مجبوراً میں نے پھر انکا سے مفاہمت کا رویہ اختیار کیا۔ اس سے معافی مانگی۔ انکا نے میری التجا پر نرگس کو واپس کرنے کا وعدہ کر لیا۔ رات کو بارہ بجے اس نے مجھے ایڈورڈ پارک بھیجا جہاں سناٹے میں ایک شخص نرگس سے دست درازی میں مصروف تھا اور نرگس آہ و زاری کر رہی تھی۔ میں یہ شرمناک منظر دیکھ کر اپنے آپے میں نہ رہ سکا میں نے اسے مار دیا اور نرگس کو ساتھ لے آیا۔ ایک اور قتل ہو چکا تھا، انکا نے میری غیرت کے چیتھڑے بکھیر کر مجھ سے ہولناک انتقام لیا تھا۔ وہ جو چاہتی کر سکتی تھی۔

بہت دیر میں نرگس کے اوسان بحال ہوئے، اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ اس عرصے میں کہاں اور کس کے ساتھ رہی۔ اب یہی مناسب تھا کہ میں دلی چھوڑ کر بمبئی کا رُخ کروں جہاں میرا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ اس عرصے میں انکا میرے سر سے غائب رہی۔ بمبئی میں جب میں اپنے مقتول منیجر کے گھر والوں کو تسلی تشفی دے کر واپس آرہا تھا کہ انکا میرے سر پر وارد ہوگئی اور مجھے پھر تاؤ آگیا، غصّے کی شدّت نے مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا۔ میں انکا سے لڑ پڑا، اس نے نرگس کے ساتھ بہت دل سوز مذاق کیا تھا، میں نے اسے دھمکیاں بھی دیں۔ انکا نے مجھے حسبِ معمول تنبیہہ کی کہ اس بار وہ مجھے پہلے سے زیادہ ہولناک مصائب سے دوچار کر دے گی۔ مگر میں نرگس کی بے عزتی یاد کر کے اور بپھر گیا، میں اسے بُرا بھلا کہتا رہا۔ اس کے پنجوں کی چبھن میرے سر پر تیز ہوگئی، اسٹیرنگ پر میرے ہاتھ کانپنے لگے اور فضا میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔

مجھ سے ایک خطرناک ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا جس میں چار آدمی ہلاک ہو چکے تھے اور میرا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔ میں اپاہج ہوگیا۔ نرگس اگر نہ ہوتی تو میں خودکشی کر لیتا۔ جب میری طبیعت سنبھلی تو مجھے چار آدمیوں کو ہلاک کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا، لیکن یہاں بھی انکا نے ایک اور تماشا کیا۔ وہ تفتیش کرنے والے انسپکٹر کے سر پر چڑھ گئی اور اس نے عدالت میں اس کی زبانی ایسے ناقابلِ یقین بیانات دلوائے کہ پورے کیس کی نوعیت بدل گئی۔ ڈی۔ ایس۔ پی منوہر لال کو اپنی پوزیشن کا ناجائز استعمال اور عدالت کو دھوکا دینے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ انکا نے ناممکن کو ممکن بنا کر مجھ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ کس قسم کی پُراسرار عورت ہے۔ اس کے بعد انکا حسبِ معمول میرے سر پر آگئی اور میں نے حسبِ معمول اس سے تلخ رویہ اختیار کیا۔ مگر اس بار انکا اداس تھی۔ کچھ بجھی بجھی سی۔ اس عرصے میں ہوا یہ کہ نرگس کے والد اصفہانی صاحب بھی اپنے گھر لے گئے انکا میرے سر پر تھی اور اب وہ بہت خاموش خاموش رہا کرتی تھی۔ اس سے ناراضگی اور نفرت کے باوجود مجھ سے اس کی اُداسی نہ دیکھی گئی ــ آخر اس سے میری وابستگی پُرانی تھی۔ میں نے اس سے اس کی اُداسی کا سبب پوچھا تو اس نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا "دنیا کی تمام قوتیں بھی اگر مل کر مجھے پریشان کریں تو میں تنہا ان کا مقابلہ کر سکتی ہوں لیکن ایک طاقت ایسی ہے جس پر میرا زور نہیں" انکا نے بتایا کہ اسے قابو میں کرنے کیلئے کٹھن جاپ کرنا پڑتا ہے، یہ جاپ ایک شخص نے اسی شہر میں شروع کر دیا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہوگیا تو انکا اس کی غلام بن جائے گی اور اس کی مرضی کی تابع ہوگی۔ اگر اس کے جاپ میں ذراسی چوک ہوگئی تو وہ انکا کی غذا بن جائے گا۔ انکا سے یہ خبر وحشت اثر سن کر میں پریشان ہوگیا ــ گویا انکا مجھ سے چھن جائے گی۔

کچھ بھی ہو وہ میری مونس و غمگسار رہی تھی۔ میں نے پچھلی تمام باتیں بھلا دیں اور انکا سے کہا کہ اگر تمہیں انسانی خون کی ضرورت ہے تو میں تمہیں فراہم کر دوں گا۔ اگر تمہیں اس پنڈت سے ڈر ہے تو میں اسے جہنم رسید کر دوں گا۔ بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کروں۔ انکا میری بات سُن کر مسکرائی اور کہنے لگی "کاش ہم دونوں زندگی بھر ایک ساتھ رہ سکتے"۔ پنڈت کا جاپ مکمل ہونے میں اٹھارہ بیس روز باقی رہ گئے تھے۔ انکا نے مجھے بتایا کہ جب تک وہ منڈل میں ہے کوئی اس کا بال بیکا بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس عرصے میں انکا کی افسردگی دُور کرنے کا ایک موقع ہاتھ آگیا ــ میرے

خسر اصفہانی صاحب کو ایک ٹھیکیدار نے پریشان کر رکھا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے انکا سے کہا اور دوسرے دن بڑی خاموشی سے میں نے انکا کی مدد سے اسے ختم کر دیا، انکا کو اس کی غذا مل گئی اور اصفہانی صاحب کی راہ کی رکاوٹ دُور ہو گئی۔ اس واردات کے دوران ایک حسین و جمیل عورت نازلی سامنے آئی۔ انکا نے مجھے بتایا کہ نازلی میرے خسر کی داشتہ ہے جسے انھوں نے ایک مجسٹریٹ کو دھوکا دے کر حاصل کیا ہے۔ میں اصفہانی صاحب کو بہت پارسا شخص سمجھتا تھا۔ بہر حال جب اس نازنین اور پری پیکر لڑکی کو میں نے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا، مجھ سے برداشت نہ ہو سکا میں اس سے ملا اور میں نے اس کے قدموں پر دولت نچھاور کر دی۔ اس کے عوض مجھے اس کی گداز قربت ملی۔

مگر پھر وہی بات کہ پنڈت کے جاپ کے دن پورے ہو رہے تھے، وہ اپنے جاپ میں اب تک کامیاب تھا۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو انکا میرے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں انکا کے مشورے سے ایک ملنگ کے پاس گیا مگر اس نے اُلٹی سیدھی باتیں کیں۔ چار و ناچار کچھ سوچے سمجھے بغیر، یوں کہیئے کہ جذبات کی رَو میں بہہ کر میں سیدھا مرگھٹ کی طرف چل پڑا جہاں وہ منحوس پنڈت اپنے جاپ میں مصروف تھا۔

ملنگ کی بے سرو پا باتوں سے میرا دماغ بُری طرح پراگندہ ہو گیا تھا اور مجھے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ میں ہی تھا جو انکا سے پیچھا چھڑانے کے لیئے تمام حربے آزما چکا تھا۔ انکا جب جانے لگی تو مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور میں نے طے کیا کہ ابھی اور اسی وقت اس پنڈت کے منصوبے کو خاک میں ملا دوں جو انکا کو اپنے قبضے میں کرنے کی خاطر جاپ کر رہا تھا۔ جو کل ہونا ہے وہ آج ہی کیوں نہ ہو جائے۔ میں مرگھٹ کی طرف چل پڑا۔ مرگھٹ کے پراسرار ماحول سے بے نیاز ہو کر، کچھ سوچے سمجھے بغیر۔

مگر میں دیکھ رہا تھا کہ انکا میری وحشت سے خوش نہیں ہے۔ اس کے حسین چہرے پر اُلجھنوں کی تہیں اور دبیز ہو گئی تھیں۔ آنکھوں سے اس کی ناامیدی اور مایوسی مترشح تھی، انکا جیسی پُراسرار طاقت پنڈت کے اس خطرناک عمل سے خوفزدہ تھی۔ اس منڈل میں انکا بھی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ تو پھر میں کیا تھا۔ میرے لیئے تو یہ کام انتہائی جان جوکھم کا تھا۔ مگر اس وقت میرے اوپر دیوانگی طاری تھی۔ میں ہر قیمت پر پنڈت کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اب انکا سے جُدائی کا تصوّر ہی بہت شاق گزرتا تھا۔

میں اور انکا دونوں اپنے اپنے خیالوں میں محو تھے آبادی سے دُور نکل کر جب میں مرگھٹ والے ویران راستے پر پہنچا تو انکا نے ایک سرد آہ بھر کر مجھ سے کہا۔

”جمیل۔ میری بات مانو۔ یہیں سے واپس چلے چلو۔“

”کیوں۔؟“ میں نے ناراضی سے پوچھا ”کیا تم اتنی نااُمید ہو۔“

”ہاں! تم پنڈت کے منڈل میں نہیں داخل ہو سکتے۔ اور جب تک وہ منڈل کے اندر ہے کوئی طاقت اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔“

”مگر مجھے کوشش تو کرنے دو۔ میں اس مردُود کو منڈل سے باہر نکالنے کے لیئے اپنی جیسی کوشش تو کر لوں۔“

”بہت مشکل ہے جمیل۔“ انکا نے مایوسانہ لہجے میں کہا ”پنڈت کا جاپ پورا ہونے میں اب صرف آٹھ دس روز اور باقی رہ گئے ہیں۔ اب وہ اپنے منڈل سے نکلنے کی حماقت کبھی نہیں کر سکتا۔“

”خیر۔ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔“ میں لاپرواہی سے بولا میں نے محسوس کیا کہ انکا ٹکٹکی باندھے مجھے والہانہ نظروں سے تک رہی ہے۔ پھر وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور میرے سر پر چہل قدمی کرنے لگی۔ جوں جوں مرگھٹ قریب آتا جا رہا تھا انکا کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب میں مرگھٹ سے ایک

فرلانگ کے فاصلے پر پہنچا تو انکا نے ایک بار پھر مجھے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"جمیل تم میرے لئے اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو میں یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں کہہ سکتی مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اگر تم اپنے مقصد میں ناکام ہوئے اور پنڈت نے اپنا جاپ پورا کر لیا تو ——— !"

"تو کیا ہوگا۔؟" انکا نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا تھا اس لئے میں نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"تو۔!" انکا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر درد بھرے لہجے میں جواب دیا "تم برباد ہوسکتے ہو۔ تمہارے اوپر ایسی تباہی آسکتی ہے جس کا اندازہ تم اس وقت نہیں کر سکتے۔"

"مجھے سب کچھ منظور ہے انکا، لیکن اب میں تمہیں جدا کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔ تم دل کی باتیں جانتی ہو، اور تمہیں معلوم ہوگا یہ میں کسی لالچ میں نہیں کہہ رہا۔"

"میں جانتی ہوں جمیل۔ میرے جمیل۔" انکا کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ میں نے عالم تصوّر میں دیکھا۔ اس کی ڈبڈبائی نظروں میں محبت کی بے شمار قندیلیں روشن تھیں۔ وہ مجھے اس انداز سے دیکھتی رہی پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

"جمیل۔ میں سوچتی ہوں۔ میں نے تم پر بہت ظلم کئے ہیں۔ سچ پوچھو تو میں شرمندہ ہوں کہ تمہیں میری وجہ سے اپنا ایک ہاتھ ضائع کرنا پڑا۔"

"کچھ مت سوچو میری جان۔" میں نے تمام تر محبتوں سے کہا۔ "تمہاری خاطر میں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

"مگر پہلے تو تم ایسے نہ تھے۔ پہلے تو تم مجھ سے زیادہ تر ناراض رہا کرتے تھے۔ مجھ سے بولتے بھی نہیں تھے۔ یہ تمہیں اچانک کیا ہوگیا؟"

"پہلے میں نے تمہیں سمجھا ہی نہ تھا۔ لیکن اب۔ اب انکا مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ حالانکہ لوگ تمہاری طلب کے لئے تو کیا کیا نہ کرتے ہوں گے۔"

"اوہ۔ جمیل۔ اتنی محبت کا اظہار نہ کرو۔" انکا نے اپنی آنکھیں آہستہ سے بند کر لیں۔ اس کی بھیگی بھیگی پلکیں نہ جانے کیوں لرز رہی تھیں۔ "کاش میں نرگس ہوتی اور بس تمہاری ہوتی اور کوئی میری طلب نہ کرتا۔ اور میں سب کچھ ہوتے بھی مجبور نہ ہوتی۔"

میں نے انکا کی دیگر باتیں سن کر مرگھٹ کی سمت اپنی رفتار تیز کر دی۔ راستہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ رام دیال کی ماں کے کریا کرم کے وقت میں اس طرف آچکا تھا، لیکن وہاں مجھے وہ مردود پنڈت کہیں نظر نہ آیا۔ انکا بدستور الجھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں مرگھٹ تک پہنچ گیا۔ میں نے پہلی بار انکا کے چہرے پر خوف دیکھا۔

"یہاں تو کوئی پنڈت پجاری دور دور تک نظر نہیں آ رہا۔" میں نے انکا کو مخاطب کیا تو اس نے آنکھیں کھول دیں ایک لمحے تک مجھے حسرت بھری نگاہوں سے تکتی رہی پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

"جمیل۔ اب بھی وقت ہے۔ میرا کہا مانو تو ——"

"ناممکن" میں نے انکا کا جملہ درمیان سے اچکتے ہوئے ٹھوس آواز میں کہا۔ "اب جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا، لیکن ایک بار قدم آگے بڑھا کر پیچھے ہٹ جانا مردوں کی شان نہیں۔ تم مجھے پنڈت تک پہنچا دو پھر میں اسے منڈل سے باہر نکالنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور تلاش کر لوں گا۔"

انکا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند ثانیوں تک وہ خاموش رہی پھر انگلی سے ایک سمت اشارہ کر کے بولی۔ "وہ سامنے جو مندر نظر آرہا ہے اس کے پیچھے جھاڑیاں ہیں۔ ان جھاڑیوں کے پیچھے تمہیں وہ نامراد بیٹھا ہوا مل جائے گا۔"

انکا کا اشارہ پا کر میں بائیں سمت چل پڑا۔ مندر بالکل
ویران پڑا تھا۔ مندر سے کوئی بیس گز دور خاردار جھاڑیاں
موجود تھیں۔ میں قدم بڑھاتا جھاڑیوں کے قریب پہنچا پھر ایک
لمبا چکر کاٹ کر دوسری طرف پہنچ گیا اور پھر اچانک میری آنکھوں
سے نفرت کی چنگاریاں اڑنے لگیں۔ میں جھاڑیوں کے کنارے
ٹھٹھک کر رک گیا۔ میری نگاہیں اس پنڈت پر جم کر رہ گئیں
جو برگد کے ایک تناور درخت کے نیچے آلتی پالتی مارے بیٹھا
آنکھ بند کئے اپنے گیان دھیان میں مست تھا۔ پنڈت کے جسم
پر سوائے ایک لنگوٹی کے کوئی اور لباس نہ تھا۔ سر کے بال
بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ الجھی ہوئی داڑھی کے بال کشادہ
سینے پر لہرا رہے تھے۔ جسامت کے اعتبار سے وہ خاصا ہٹا کٹا
نظر آ رہا تھا۔ پورے جسم پر اس نے بھبھوت مل رکھا تھا۔ جس
جگہ وہ بیٹھا جاپ کر رہا تھا وہاں سے چار گز دور کے فاصلے
پر چاروں طرف چونے سے دائرہ کھینچا ہوا تھا۔ میں اپنی جگہ
کھڑا پنڈت کو خونیں نظروں سے گھورتا رہا پھر میں نے عالم تصور
میں انکا پر نظر ڈالی تو بے چین ہو گیا۔ انکا جو کچھ دیر پہلے
قندھاری انار کی طرح سرخ ہو رہی تھی اس وقت بالکل زرد
نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی کا تسلط تھا۔ اور
چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ انکا میں یہ تبدیلی کسطرح
آ گئی یہ بات میرے لئے حیران کن تھی۔ وہ اس وقت مجھے
برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی اور پھٹی پھٹی نظروں سے پنڈت
کو گھورے جا رہی تھی۔

"انکا۔ سنو" میں نے اسے آہستہ سے مخاطب کیا۔

"کیا یہی وہ ذلیل پنڈت ہے جو تمہیں حاصل کرنے کے خواب
دیکھ رہا ہے؟"

"ہاں۔" انکا نے چونکتے ہوئے جواب دیا پھر سہمے
ہوئے بولی "واپس چلو جمیل۔ مجھے اندازہ ہے تم اس کا کچھ
بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ مفت کی پریشانیاں تمہارا مقدر بن جائیں گی"۔

"انکا موت کی تلخی مجھے تمہاری جدائی سے زیادہ عزیز ہے"
میں نے پرعزم لہجے میں جواب دیا پھر قدم بڑھاتا پنڈت کی
طرف گیا اور منڈل سے تھوڑے فاصلے پر رک گیا۔ پنڈت
آنکھیں بند کئے اپنے جاپ میں مگن تھا۔ اسے غالباً وہاں
میری موجودگی کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ کچھ توقف کے بعد میں
نے اسے دبنگ آواز میں للکارتے ہوئے کہا۔

"او نابکار۔ آنکھیں کھول اور دیکھ تیری موت تیرے
سر پر کھڑی ہے۔"

پنڈت نے ہڑبڑا کر یوں آنکھیں کھول دیں۔ جیسے کچی
نیند میں کوئی بھیانک خواب دیکھ کر ڈر گیا ہو۔ لیکن اس کی یہ
کیفیت لمحوں میں بدل گئی۔ جلد ہی وہ مطمئن نظر آنے لگا۔
اس کے ہونٹ متحرک تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے منتر کے
ورد میں لگا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کے انہماک کو کسی طرح
بھی توڑنے کی خاطر میں نے اسے دوبارہ نفرت سے مخاطب کیا

"مردود۔ کمینے! میری طرف آنکھیں پھاڑے کیا دیکھ
رہا ہے۔ یہ تو کیا کر رہا ہے۔ تو اس تپسیا میں سپھل نہیں ہو سکتا
میں تجھے ابھی کشٹ دیتا ہوں"

پنڈت میری طرف سرخ سرخ نظروں سے دیکھا کیا۔
اس بار بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹ تیزی
سے ہل رہے تھے۔ جیسے وہ میری مداخلت کے دفاع میں اپنے
ذہن کا سارا زور صرف کر رہا ہو۔۔ اور میں اسے کسی نہ کسی
طرح اس کی توجہ کے ارتکاز میں رخنہ ڈالنا چاہتا تھا۔ میں
کچھ دیر تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر ایک ترکیب
میرے ذہن میں آئی۔ میں نے لپک کر زمین سے ایک بڑا پتھر
اٹھایا اور ہاتھ تولتے ہوئے بگڑے ہوئے تیور سے بولا۔

"سیدھی طرح راہِ راست پر آتا ہے یا پتھر مار کر تیرا

سر پھاڑ دوں۔"

جواب میں پنڈت کے آنکھوں کی سُرخی اور گہری ہو گئی اس نے سیدھا ہاتھ اٹھا کر زور زور سے جھٹکنا شروع کر دیا وہ ہاتھ جھٹک جھٹک کر مجھے وہاں سے بھاگ جانے کا اشارہ کر رہا تھا مجھے اس کی حرکت گراں گزری۔ چنانچہ میں نے پتھر کو ہاتھ میں تولا اور پوری طاقت سے اُسے پنڈت کے سر کا نشانہ لے کر پھینک مارا لیکن دوسرے ہی لمحے اس پتھر کا جو انجام ہُوا اُسے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ منڈل کے اندر داخل ہوتے ہی وزنی پتھر موم کی طرح پگھل کر پانی پانی ہو گیا۔ پنڈت کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ نے میرے جنون کو اور بھڑکا دیا۔ میں منڈل کے اندر داخل ہونے کے ارادے سے آگے بڑھا ہی تھا کہ انکا نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

"جمیل۔ اس نشان کو پار کرنے کی حماقت مت کرنا ورنہ جل کر بھسم ہو جاؤ گے۔"

"ہش۔" میں نے انکا کو جوش میں ٹالتے ہوئے کہا۔ پھر دوبارہ آگے بڑھنے لگا۔

میں نے طے کر لیا تھا کہ منڈل میں داخل ہو کر پنڈت سے دو دو ہاتھ کر لوں گا، لیکن جیسے ہی میں نے منڈل میں پہلا قدم رکھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا ہو۔ میں اپنے دونوں شانوں اور گردن پر کسی ان دیکھی قوت کی گرفت محسوس کر رہا تھا۔ پھر اچانک میرے کانوں سے بھیانک آوازیں ٹکرانے لگیں۔ یوں جیسے سینکڑوں درندے مجھ پر ٹوٹ پڑے ہوں۔ میں نے عالم تصوّر میں اپنے سر پر نظر ڈالی تو انکا وہاں موجود نہ تھی۔ شاید وہ منڈل میں مجھے داخل ہوتا دیکھ کر ہی میرے سر سے کود گئی تھی۔ بہر حال میں نے خود پر قابو پایا اور اچھل کر چونے کی لکیر سے باہر نکل آیا۔ دوسرے ہی لمحے غیر مرئی طاقت در ہاتھ اور بھیانک آوازوں کا وجود ختم ہو گیا۔ میرا سارا وجود پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑا اس پنڈت کو دیکھ رہا تھا جو اپنے جاپ میں پورے اعتماد اور سکون سے مصروف تھا۔ معاً مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے انکا دوبارہ میرے سر پر آ گئی ہو۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میں انکا کو دوبارہ اپنے سر پر محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت بیحد گھبرائی نظر آ رہی تھی۔ اس کا ننھا وجود بید مجنوں کے مانند لرز رہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انکا کو پریشان دیکھ کر مجھے دوبارہ اس پنڈت پر تاؤ آ گیا جو مجھ سے میری انکا کو چھین لینا چاہتا تھا چنانچہ ایک بار پھر مجھ پر جنون کا دورہ پڑ گیا۔ میں قریب پڑے ہوئے پتھروں کو اٹھا اٹھا کر پنڈت کی سمت پھینکنے لگا لیکن پنڈت میرے ہر وار سے محفوظ تھا۔ پتھر منڈل میں پہنچتے ہی پگھل کر گر جاتا۔ جب میں تھک کر ہانپنے لگا تو انکا نے مجھ سے کہا۔

"جمیل۔ چھوڑو۔ اب گھر چلو۔ میں نے پہلے ہی منع کیا تھا لیکن تم نہ مانے۔ بیکار کیوں اپنی جان ہلکان کر رہے ہو۔ جب تک پنڈت اپنے منڈل کے اندر ہے دنیا کی کوئی طاقت اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ اُسے دن بہت گزر چکے ہیں۔ اور بہت ہمت والے پجاری ہی مجھے حاصل کرنے کے لئے ایسا خطرناک جاپ کرتے ہیں یہ پجاری بہت پرانا اور تجربہ کار ہے۔ اس میں برداشت کی قوت بہت ہے۔ یہ جاپ میں مصروف رہے گا چاہے تم اُسے کتنا ہی ورغلاؤ۔"

"لیکن اگر اس کم بخت کو منڈل سے باہر نہ نکالا گیا تو یہ ضرور اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔" میں نے جھلّا کر کہا۔ "کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں اس موذی کے قبضے میں چلا جانے دوں۔"

"ایسی بات کیوں کر رہے ہو جمیل۔" انکا نے اداسی سے کہا۔ "میں تو خود مجبور ہو کر رہ گئی ہوں۔"

"پھر۔ تمہارا کیا مشورہ ہے؟" میں نے نرم پڑتے ہوئے دریافت کیا تو انکا روہانسی ہو کر بولی۔

"جلد بازی سے کام نہ لو جمیل۔ ابھی اس کا جاپ مکمل ہونے میں آٹھ دس روز باقی ہیں۔ اس عرصے میں کوئی ایسی ترکیب سوچو جو کارگر ثابت ہو۔"

"تمہارے کہنے پر تو میں اس بدحواس چرسی ملنگ سے بھی مل چکا ہوں لیکن کیا حاصل ہوا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"فی الحال تم گھر واپس چلو جمیل۔ اس بلا سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ترکیب کرنا ہی پڑے گی۔"

میں نے انکا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ جب تک پنڈت اپنے حصار میں موجود ہے اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا۔ حصار میں داخل ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں نے ہٹے کٹے پنڈت کو آخری بار نفرت سے دیکھا۔ پھر ناکام و نامراد گھر کی جانب پلٹ پڑا۔ پنڈت کے مقابلے میں خود کو بے بس محسوس کر کے میں بڑی اذیت محسوس کر رہا تھا۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ میرے لئے ایک ایک لمحہ بڑا جاں گسل تھا لیکن خون کے گھونٹ پینے کے سوا میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اور اندر ہی اندر سلگتا ہوا گھر کی طرف واپس لوٹ رہا تھا۔ انکا بڑے اُداس انداز میں میرے سر پر بالوں کے درمیان خاموش بیٹھی نہ جانے کس سوچ میں غرق تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے تک ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہ ہوئی پھر دفعتہً میں نے انکا کو تیزی سے اٹھ کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس کی ویران نگاہوں میں مجھے ایک عجیب چمک نظر آئی۔ میرے دریافت کرنے سے پہلے انکا نے کہا۔۔۔۔۔

"جمیل۔ ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔ تم اگر اس پر عمل کرو تو شاید ہمیں اس پنڈت سے نجات مل جائے۔"

"جلدی بتاؤ۔" میں نے بہ عجلت تمام پوچھا۔ "تمہیں پتا نہیں مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔"

"تمہیں رام دیال کی ماں سے ملنے جلنے والے پنڈتوں میں ایک پنڈت بھگوان پرشاد سے ملنا ہو گا۔ وہ اگر تمہاری مدد کرنے کو آمادہ ہو جائے تو تم اُس پنڈت کو منڈل سے باہر نکال سکتے ہو۔ اس کے بعد میں خود اُسے ٹھکانے لگا دوں گی۔"

"کیا تمہیں اُمید ہے کہ بھگوان پرشاد میری مدد پر آمادہ ہو جائے گا؟"

"کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔" انکا بولی "ایک بار وہ بھی مجھے حاصل کرنے کے سپنے دیکھ چکا ہے۔ لیکن میں نے بر وقت اس کا دماغ پلٹ دیا تھا۔"

"کیا اس کے پاس کوئی ایسی طاقت موجود ہے، جو پنڈت کو حصار سے باہر آنے پر مجبور کر سکتی ہے؟"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی جمیل۔ لیکن ایک منتر کا توڑ کوئی دوسرا منتر ہی کر سکتا ہے۔ مجھے یہ بات معلوم ہے کہ بھگوان پرشاد کالے جادو کا ماہر ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی ایسا جادو کرے جو پنڈت کو بوکھلا کر منڈل سے باہر آنے پر مجبور کر دے۔"

انکا کے چہرے پر اُمید کی کرن دیکھ کر میں نے سوچا کہ پنڈت بھگوان پرشاد کو بھی آزما لیا جائے۔ میں وقت ضائع کئے بغیر اسی وقت انکا کی رہبری میں اس کے گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔ انکا کے مشورے نے کسی حد تک میری پریشانی اور بے چینی کو کم ضرور کر دیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کی جُدائی کا خیال اب بھی میرے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ گو انکا ہی کی بدولت میں اپنا ایک ہاتھ گنوا بیٹھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اگر میں چاہتا تو اس کے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتا تھا۔

انکا میرے جسم کا جزو بن چکی تھی۔ وہ میری ضرورت تھی۔

میں اپنے خیالات میں کھویا کھویا تیز قدم اٹھاتا رہا۔ نصف گھنٹے بعد میں اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ ہندوؤں کی بستی میں بھگوان پرشاد کا مکان عین وسط میں واقع تھا۔ مکان کیا تھا اچھی خاصی حویلی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور مضطرب نگاہوں سے کسی کی آمد کا منتظر رہا۔ دو منٹ بعد جس شخص نے دروازہ کھولا وہ میرے خیال میں بھگوان پرشاد کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اسے ایک دو بار رام دیال کی ماں کے ساتھ بھی دیکھ چکا تھا پھر بھی اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر میں نے اس سے پوچھا۔

"مہاشے۔ کیا آپ ہی کا شبھ نام پنڈت بھگوان پرشاد ہے؟"

دوہرے بدن اور لانبے قد والے پنڈت نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک منٹ تک وہ مجھے تیکھی نظروں سے گھورتا رہا پھر اس کے چہرے پر بکھری ہوئی کرختگی بتدریج کم ہونے لگی۔

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو میں تمہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔" پنڈت نے بے نیازی سے کہا "تم رام دیال کے متر (دوست) جمیل تو نہیں ہو؟"

"ہاں مہاراج۔ میں وہی ہوں۔" میں نے بھگوان پرشاد کو چڑھانے کی خاطر مہاراج کے خطاب سے نوازتے ہوئے کہا وہ مسکرا کر بولا۔

"کیا میرے استھان پر آنے کا کوئی خاص کارن ہے؟"

"ہاں مہاراج! میں ضرورت کے تحت آپ کے چرنوں تک پہنچا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے نراش نہیں کریں گے۔"

"اندر آجاؤ۔"

میں پنڈت بھگوان پرشاد کے ساتھ حویلی میں داخل ہو گیا۔ بڑے کمرے میں پہنچ کر جہاں دیوی دیوتاؤں کے بت جگہ جگہ موجود تھے۔ بھگوان پرشاد ایک تخت پر بیٹھ گیا۔ پھر مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ بھگوان پرشاد میری مدد پر آمادہ ہو جائے۔ کچھ دیر تک کمرے میں سکوت طاری رہا۔ اس عرصے میں بھگوان پرشاد برابر میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے پہل نہیں کی۔ پانچ منٹ بعد بھگوان پرشاد نے مہر سکوت توڑی۔

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ میں تمہاری کیا سہائتا کر سکتا ہوں؟" اس نے خالص ہندو پنڈتوں کے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

"مہاراج۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "پہلے مجھے وچن دیجیے کہ آپ میری مدد ضرور کریں گے۔"

"یہ تو بچوں والی بات ہوئی میاں پہلے مجھے بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو! اگر میرے بس میں ہوا تو میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔"

میں نے ایک سہمی ہوئی نظر بھگوان پرشاد کے چہرے پر ڈالی پھر اپنے آنے کا مدعا بیان کر دیا لیکن اس بات کو میں نے پوشیدہ رکھا کہ میں اس پنڈت کو منڈل سے باہر کیوں نکالنا چاہتا ہوں۔ انکا کا تذکرہ بھی میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ بھگوان پرشاد نے میری بات بڑے غور سے سنی۔ ایک ثانیے تک کچھ سمجھنے والے انداز میں میرے جسم کو تولتا رہا۔ پھر کچھ جز بز ہو کر الجھے ہوئے لہجے میں اس نے پوچھا۔

"کیا تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم اس مہان پنڈت کو اس کے منڈل سے باہر کیوں لانا چاہتے ہو؟"

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے مہاراج۔!" میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "آپ بس اتنا جان لیں کہ وہ مہان پنڈت مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اگر وہ اپنا جاپ

پورا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔"

بھگوان پرشاد ابھی تک میرے چہرے پر معنی خیز نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ میرا جملہ ختم ہوا تو اس نے ایک بار چھت کی طرف نظر اٹھائی پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دس منٹ تک وہ اسی طرح آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"بچہ۔ کیا تم جانتے ہو کہ تربینی داس پنڈت کا نام تھا جو الکا کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا کیسا جاپ کر رہا ہے؟"

"ہاں مہاراج!" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"وہ میرے دل کا سکون برباد کرنا چاہتا ہے۔"

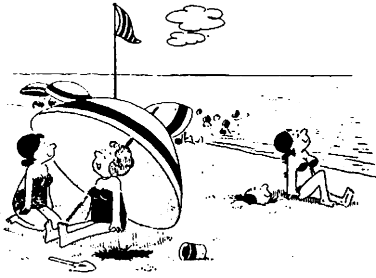
"تمہارے دل کا سکون؟ بھگوان پرشاد نے حیرت سے کہا "تو کیا تم بھی الکا کے سپنے دیکھ رہے ہو۔"

میں کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ الکا نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"جمیل۔ اب اس سے کچھ چھپانا بے کار ہے۔ تم اس سے سب کچھ صاف صاف کہہ دو۔ میرے سلسلے میں صرف اتنا ہی بتانا کہ میں کبھی کبھی اپنی مرضی سے تمہارے سر پر آجاتی ہوں اور تربینی کے بارے میں بھی تمہیں میری زبانی معلوم ہوا ہے۔"

الکا کے مشورے پر میں نے بھگوان پرشاد کو کھل کر صورتحال سے آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات نمایاں ہو گئے۔ اس کی آنکھوں سے بے یقینی مترشح تھی۔ وہ منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ بولا۔

"جمیل میاں! کیا تم سچ کہہ رہے ہو کہ الکا تمہارے سر پر آتی رہتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ الکا کون ہے۔ کیوں مجھ سے



مذاق کرتے ہو؟"

"میں آپ سے مذاق نہیں کر رہا مہاراج۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے آپ سچ سمجھیں اور میری مشکل کا کوئی حل ڈھونڈیں" میں نے کہا۔

"بالک۔ الکا کا نام لیتے ہو۔ الکا کے بارے میں کچھ سنا بھی ہے۔ الکا کو حاصل کرنیوالے بڑے بھاگیہ والے ہوتے ہیں الکا کی شکتی جانتے ہو۔" پنڈت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ٹھیک اسی وقت الکا نے میرے کان میں پھر ایک بات کہی چنانچہ میں نے بے دھڑک جواب دیا۔

"مہاراج میری بات پر یقین کرو۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ وشواس کرو، اس وقت بھی وہ میرے سر پر براجمان ہے۔"

"بالک کیا تم اس کا کوئی ثبوت دے سکتے ہو۔ بتاؤ کیسی ہے الکا؟" بھگوان پرشاد نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا مگر اس کی نگاہوں میں اب تک تجسس تھا۔

"آپ کو کس قسم کا ثبوت درکار ہے مہاراج؟" میں نے الکا کے اشارے پر پوچھا۔

"سنو میاں جمیل۔ الکا ایک ایسی پُراسرار اور مہان شکتی کا نام ہے جسے اپنانے کے لئے منش کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ تربینی بھی اسی شکتی کے کارن منڈل میں دھونی

رمائے بیٹھا ہے پھر میں کیسے وشواس کرلوں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ٹھیک ہے۔"

"مہاراج۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حرف بحرف ٹھیک ہے۔" میں نے انکا کے کہے ہوئے جملوں کو دہراتے ہوئے کہا۔ "آپ کو اگر میری زبان پر وشواس نہیں تو آزما کر دیکھ لیجئے۔ لیکن آپ کو اس بات کا وچن دینا ہوگا کہ اگر امتحان میں میں پورا اترا تو آپ تربینی کو اس کے منڈل سے باہر نکالنے میں میری مدد ضرور کریں گے۔"

"پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو۔ مجھے بتاؤ کہ انکا کس روپ میں تمہارے سر پر آتی ہے؟" بھگوان پرشاد نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں نہیں مہاراج۔" اس بار میں نے مسکرا کر کہا۔ "انکا کا روپ سندر ناریوں جیسا ہے۔ وہ سب سے سندر ہے وہ تو کوئی دیوی ہے۔"

"تم نے کبھی اسے بھوجن کرتے بھی دیکھا ہے؟"

"دیکھا ہے مہاراج۔" میں بولا "انکا اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیئے انسانی خون پیتی ہے۔"

"اور۔ اور اس سمے وہ تمہارے سر پر براجمان ہے"

بھگوان پرشاد اب بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"کیا اب بھی آپ کو میری بات کا وشواس نہیں ہے؟" میں نے چڑ کر پوچھا۔

"وشواس کا کیول ایک ہی طریقہ ہے جمیل احمد۔ اگر انکا کی شکتی سندر ناریوں کے روپ میں تمہارے سر پر موجود ہے تو اس سے کہو کہ وہ مجھے اپنی شکتی کا کوئی تماشا دکھلائے۔"

میرے جواب دینے سے پیشتر ہی انکا کسی چھلاوے کی طرح اچھل کر میرے سر سے اتر گئی۔ بھگوان پرشاد مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ انکا کے سر سے اتر جانے کی وجہ سے میں کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ لیکن میری پریشانی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔

بھگوان پرشاد کے رویے میں اچانک تبدیلی آگئی تھی۔ وہ یوں مسرور نظر آنے لگا جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ الفاظ اس کے منہ سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہہ رہا تھا۔

"میاں جی جمیل۔ تم تو مہان ہو۔ میاں جی مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں غلط سمجھا۔ انکا تمہارے پاس آتی ہے تم سب سے خوش قسمت آدمی ہو۔ میاں جی! مجھے بتاؤ میں تمہارا کیا کام کرسکتا ہوں۔ پرنتو تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

بھگوان پرشاد کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

"وہ کیا؟"

"ابھی تم صرف مجھے زبان دے دو۔" بھگوان پرشاد نے مسکرا کر کہا۔ "جب تم اپنے کام میں سپھل ہو جاؤ گے پھر میں تمہیں اپنا کام بتاؤں گا۔"

"مجھے منظور ہے مہاراج۔" میں نے بغیر سوچے سمجھے وعدہ کرلیا۔

"تم یہیں پدھارو۔ میں ابھی واپس لوٹتا ہوں۔"

بھگوان پرشاد تیزی سے اٹھ کر اندر چلا گیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ انکا ابھی تک میرے سر پر واپس نہیں آئی تھی ویسے میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ اس وقت بھگوان پرشاد کے سر پر ہوگی اور اسی نے اسے مجھے میری مدد کرنے پر آمادہ کیا ہوگا۔ بہرحال اب مجھے امید کی ایک کرن پھوٹتی نظر آرہی تھی میں اس دروازے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ جس دروازے سے ہو کر بھگوان پرشاد اندر گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بڑے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اس وقت بھی کسی اندرونی خوشی کے جذبے کے تحت کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ جس وقت

وہ اپنے تخت پر بیٹھا ٹھیک اسی وقت اَنکا دوبارہ میرے سر پر واپس آ گئی۔ میں نے کنکھیوں سے اَنکا کی طرف دیکھا تو وہ بھی خوش خوش دکھائی دے رہی تھی۔ شاید اسے بھی اپنے بچاؤ کی امید ہو چلی تھی۔ اسی کے اشارے پر میں نے بھگوان پرشاد کو مخاطب کیا۔

"مہاراج۔ اگر تم تربینی کو اس کے منڈل سے نکالنے کا کوئی اوپائے کر دو تو میں تمام زندگی تمہارا احسان مند رہوں گا اور جو کچھ بھی مجھ سے ہو سکا تمہارے لئے ضرور کروں گا۔"

"تم قسمت کے دھنی ہو میاں جمیل، جو بغیر کسی جاپ کے اَنکا جیسی مہان شکتی کو پا گئے ہو۔" بھگوان پرشاد نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ پرنتو اس کے لئے تمہیں ابھی ایک ہفتے اور انتظار کرنا ہوگا۔"

"ایک ہفتے۔" میں نے پریشان ہو کر کہا تو بھگوان پرشاد بولا۔

"کوئی چنتا نہ کرو میاں جمیل، مجھے خبر ہے کہ تربینی کا جاپ مکمل ہونے میں کیول آٹھ نو دن باقی رہ گئے ہیں۔ پرنتو میں تم کو جو چیز دان کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے ابھی سمے پورا نہیں ہے۔ تمہیں ایک ہفتے تک انتظار کرنا ہوگا۔"

"کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے مہاراج کہ میں تربینی کو ایک دو روز میں منڈل سے باہر دیکھ سکوں۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم اَنکا دیوی کی وجہ سے بہت بیاکل ہو لیکن دھیرج سے کام لو میاں جی۔"

"کیا میں تربینی کو اس کے ارادوں سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا؟"

"کل کیا ہونے والا ہے۔ یہ کیول پرماتما ہی جانتا ہے پر مجھے وشواس ہے کہ تم تربینی کو منڈل سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ پرنتو اگر ایسا نہ ہوا تو۔"

جب گوا پر پرتگالیوں کا قبضہ مستقل ہو گیا تو وہاں پرتگالی حکومت کی طرف سے نظم و نسق چلانے کے لئے باقاعدہ دفاتر قائم ہوئے اور پرتگال کی طرف سے وائسرائے کا تقرر ہونے لگا۔ جب وائسرائے ہاؤس تعمیر ہوا تو اس کی ایک محراب پر برکت کے لئے سینٹ (ولی) کی تصویر بنائی گئی۔ اس تصویر میں ایک ہندوستانی کو منہ کے بل زمین پر پڑے ہوئے دکھایا گیا ہے، سینٹ (ولی) اس طرح کھڑا ہے کہ اس کا مقدس قدم مظلوم ہندوستانی کی گردن پر ہے اور دستِ مبارک کی ننگی تلوار کی نوک ہندوستانی کی طرف ہے۔ بابائے اردو نے جب اس تصویر کو دیکھا تو کہا۔
"خوب! جن کے ولی ایسے ہیں ان کے شیطان کیسے ہوں گے!"

بھگوان پرشاد اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر سراسیمہ ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک تاثر آتا تھا ایک جاتا تھا وہ کسی کشمکش سے دوچار تھا۔ اس لئے میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اگر میں کامیاب نہ ہوا تو کیا ہوگا مہاراج؟"

"تمہارا کچھ نہیں ہوگا پر۔ پر۔" بھگوان پرشاد نے ایک بار پھر اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بات بدل کر بولا۔ "ابھی تم جاؤ میاں جی جمیل...... آج سے ٹھیک سات روز بعد پورنماشی کی رات ہوگی۔ تم اس رات پورے بارہ بجے میرے پاس آ جانا۔ میں تمہیں ایک ایسی چیز دوں گا، جس کی شکتی تربینی کو اس کے منڈل سے اوشئیہ باہر گھسیٹ لائے گی۔"

بھگوان پرشاد نے جس وقت یہ کہا اس وقت بھی اس کی نظروں میں ایک نامعلوم سی الجھن طاری تھی، لیکن میں نے دیدہ دانستہ اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور اٹھ کر خاموشی سے باہر آ گیا۔ ہندوؤں کی بستی کو عبور کر کے جب

میں اپنی رہائش کی طرف چلا تو انکا نے مجھ سے کہا۔
"جمیل۔ بھگوان پرشاد تمہاری مدد ضرور کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جو چیز تمہیں دے وہ ہماری پریشانیوں کے خاتمے کا سبب بن سکے۔"
"کیا تم میرے سر سے اتر کر اسی کے سر پر چلی گئی تھیں؟"
"ہاں ۔" انکا نے اس بار مسکراتے ہوئے کہا "جانتے ہو وہ تربینی کا معاملہ نپٹانے کے بعد تم سے کیا کام لینا چاہتا ہے ۔؟"
"مجھے بھلا کیا علم؟"
"تم بھگوان پرشاد کو نہیں جانتے۔ بہت مکار اور عیار آدمی ہے۔ اس کا کاٹا ہوا تو پانی بھی نہیں مانگتا لیکن تم سے وہ کسی دھوکے سے کام نہیں لے گا۔ اس لئے کہ وہ ایک پرانے خزانے کے راز جاننے کے چکر میں ہے۔ اسی وجہ سے اس نے مجھے بھی قبضے میں کرنے کے خواب دیکھے تھے"
"جہنم میں گیا خزانہ" میں نے بے دلی سے کہا "تم یہ بتاؤ کہ بھگوان پرشاد کچھ کہتے کہتے رک کیوں گیا تھا۔ اگر وہ حقیقتہً کالے جادو کا ماہر ہے تو پھر اسے فکر کس بات کی ہے"
"جلدی کیا ہے۔ پورنماشی کی رات آ لینے دو۔ جو بات بھی ہو گی سامنے آ جائے گی۔"
"کیا تمہیں بھی اس کا علم نہیں ہے؟" میں نے انکا سے چبھتا ہوا سوال کیا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ گمان ہو رہا تھا کہ انکا بھگوان پرشاد کی الجھن کی وجہ جانتی ہے لیکن مجھ سے اس وجہ کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔
ایک دو بار جب میں نے اپنے سوال کو گھما پھرا کر پوچھا تو وہ مجھے ٹال گئی۔ پھر جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو انکا نے ملول ہو کر کہا۔
"سنو جمیل۔ اب جبکہ تم نہیں مانتے تو سنو۔ میں تم سے کچھ پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ تربینی کا انجام کیا ہو گا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اگر بھگوان پرشاد کا جادو بھی منڈل کے اندر بیکار ثابت ہوا تو بات بہت بگڑ جائے گی۔ تم سے دُور ہونا ہی پڑے گا۔"
بات بگڑنے سے تمہاری مراد کیا ہے؟ صاف صاف کہو"
"جمیل۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہارے اوپر کوئی آنچ آئے۔ لیکن کالے جادو کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ناکام ہونے کی صورت میں ضرور پلٹتا ہے اور یا تو جادو کرنے والے کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے یا پھر اس شخص کی بربادی کا باعث بن جاتا ہے جو جادو کراتا ہے۔"
"گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تربینی کے بچ جانے کی صورت میں میرے یا بھگوان پرشاد میں سے کسی ایک کی تباہی لازم ہے ۔ کیوں ۔"
"جمیل ۔" انکا آبدیدہ ہو کر بولی "کیا یہ ممکن نہیں کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور خود کو ان بکھیڑوں میں نہ ڈالو"۔ میں نے محسوس کیا اس کی حسین آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اس کا لہجہ کچھ اس قدر درد انگیز تھا کہ میرا جی بھر آیا اور میں فیصلہ کن لہجے میں بولا۔
"انکا۔ اگر تم مجھے اپنا سچا ہمدرد اور دوست سمجھتی ہو تو اب یہ بات زبان پر نہ لانا۔ اگر میری قسمت میں بربادی درج ہے تو تربینی کی راہ چھوڑ دوں تب بھی نہیں بچ سکوں گا اور اگر قسمت میرے اوپر مہربان ہے تو تربینی اور اس کے تمام دیوی دیوتا مل کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"
انکا نے عقیدت مندانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا، ان نگاہوں میں اظہارِ تشکر کے علاوہ محبت کے بے پناہ جذبات موجزن تھے۔ راستے بھر ہمارے درمیان پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ انکا آلتی پالتی مارے افسردہ اور خاموش بیٹھی رہی۔

دوسری طرف میں نے اٹل فیصلہ کر لیا تھا کہ انکا کے پُراسرار وجود کو ہر قیمت پر اپنائے رکھوں گا۔ اپنے خیالوں میں الجھا الجھا میں گھر پہنچا تو نرگس نے مجھے ایک نئی اطلاع سنائی۔

"کچھ سُنا آپ نے کہ نازلی پر کیا گزری؟"

"کیا ہو گیا؟" میں نے لاپرواہی سے اپنے بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

"صابر علی صاحب نے اُسے اسمگلنگ کے چکر میں پھنسوا دیا ہے۔ آج صبح پولیس نے نازلی کے گھر پہ چھاپا مار کر اسے گرفتار کر لیا۔ بہت ساری اسمگلنگ کی ہوئی اشیاء بھی ملی ہیں لیکن ڈیڈی کا خیال ہے کہ صابر علی نے اپنی اس روز کی بے عزتی کا انتقام لینے کی خاطر نازلی کے گرد جال بُنا ہے۔"

"تمہارے ڈیڈی کو آخر نازلی سے اس قدر ہمدردی کیوں ہے؟" میں جلدی میں کہہ گیا پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیئے تھی۔ "میرا مطلب ہے کہ نازلی جانے اور صابر علی صاحب۔ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ دوسروں کے معاملے میں دخل دیں۔"

"کچھ بھی سہی لیکن صابر علی صاحب کو ایک عورت کے ساتھ ایسی اوچھی حرکت نہیں کرنی چاہیئے تھی۔" نرگس نے بُرا سامنہ بنا کر کہا۔ "میرا تو خیال ہے کہ اس روز بھی نازلی نے بلاوجہ اُن پر کیچڑ نہیں اچھالی ہوگی۔ دال میں ضرور کچھ کالا رہا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے۔ ویسے مجھے تمہارا یہ مجسٹریٹ بھی کوئی اچھے قماش کا آدمی نہیں لگتا۔" میں نے نرگس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر رازداری کے انداز میں پوچھا۔ "کیا نہیں حقیقتہً نازلی سے بہت ہمدردی محسوس ہو رہی ہے؟"

"ہونی بھی چاہیئے۔" نرگس نے تیزی سے کہا۔ "صابر علی صاحب نے اُسے جس الزام میں پھنسانے کی کوشش کی ہے اگر وہ درست ثابت ہو گیا تو بیچاری کی زندگی برباد ہو جائے گی۔"

"اگر کہو تو میں نازلی کو بچانے کی کوشش کروں؟"

میں نے یہ جملہ نہ جانے کس طرح اور کس لہجے میں کہا تھا کہ نرگس نے پلٹ کر میرے چہرے کو غور سے دیکھا۔ پھر جیسے نازلی کے ساتھ اس کی تمام ہمدردیاں اچانک ختم ہو گئی ہوں۔ وہ بھنویں چڑھا کر بولی۔

"آپ کو کیا ضرورت ہے اسے بچانے کی۔ وہ جانے اور صابر علی صاحب جانیں! آپ آرام سے کپڑے تبدیل کر کے لیٹئے میں ابھی آپ کے لئے کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

نرگس چلی گئی تو میں ایک بار پھر تربینی کے بارے میں سوچنے لگا جو انکا کو مجھ سے چھین لینے کی خاطر جاپ کر رہا تھا۔ انکا بھی اپنے خیالوں میں گم تھی۔ اس لئے میں نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ نرگس نے کافی لا کر دی تو میں نے اپنے بوجھل اعصاب کو سکون دینے کی خاطر جلدی جلدی دو چار لمبے گھونٹ لئے۔ پھر کافی ختم کر کے لیٹ رہا۔ نرگس سے میں نے تاکید کر دی تھی کہ اگر میں خود سے نہ جاگوں تو دوپہر کے کھانے پر مجھے جگانے کی کوشش نہ کرے!

پنڈت بھگوان پرشاد سے ملے مجھے چار روز گزر چکے تھے۔ میں نے یہ چار دن بڑے کرب میں گزارے۔ انکا اس عرصے میں برابر میری ڈھارس بندھاتی رہتی۔ لیکن مجھے کسی پل چین نصیب نہ تھا ہر لمحہ یہی فکر لاحق رہتی کہ اگر تربینی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو میرا کیا ہو گا۔ انکا کی جدائی کا وقت قریب ہوتا جاتا تھا اور اس سے میری محبت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اکثر رات کو جب وہ میرے سرہانے محو خواب ہوتی تو میں جاگتا رہتا اور اسے مسرت

بھری نظروں سے دیکھا کرتا۔ ان چار دنوں میں آنکا بھید جھٹک
گئی تھی خود میرا بھی یہی حال تھا کہ کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔
بھوک پیاس کا ہوش نہ رہتا۔ بس ہر وقت یہی فکر لاحق رہتی کہ
دیکھیں آنے والے لمحات میرے حق میں کیا گل کھلاتے ہیں میری
عزیز شے مجھ سے رخصت ہونے والی تھی۔

نرگس اور اس کے والدین سے اپنی کیفیت چھپانے کی
خاطر میں صبح سویرے ہی صرف چائے پی کر دوستوں سے ملنے
کا بہانہ کر کے چلا جاتا اور رات کے کھانے کے بعد لوٹتا۔ نرگس
کے والدین کو تو کوئی خیال نہ ہوا کہ میرا پروگرام اچانک کیوں تبدیل
ہو گیا۔ البتہ نرگس کے کان ضرور کھڑے ہوگئے۔ چار روز تک تو
وہ چپ رہی لیکن پانچویں روز جب میں رات گئے واپس آیا اور
اپنی خوابگاہ میں داخل ہوا تو نرگس میری منتظر تھی۔ جب تک
میں کپڑے تبدیل کرتا رہا وہ مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی
مگر جب میں بستر پر دراز ہو گیا تو نرگس میرے قریب آگئی اور
بڑے پیار سے بولی۔

"کیا بات ہے۔ آپ آج کل زیادہ تر گھر سے باہر ہی
رہتے ہیں؟"

"کوئی خاص بات نہیں" میں نے ٹالتے ہوئے جواب
دیا۔ "دوستوں سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ وقت اچھا خاصا گزر
جاتا ہے۔"

"ایسا بھی کیا کہ انسان منہ اندھیرے کا نکلا رات ڈھلے
واپس لوٹے۔ نصیبِ دشمناں کہیں آپ کو کوئی پریشانی تو
لاحق نہیں۔"

"پریشانی کیسی؟"

"کھائیے میرے سر کی قسم۔"

میں نے نرگس کو ہر چند ٹالنا چاہا لیکن جب وہ کسی طرح
نہ مانی تو میں نے آنکا کے اشارے پر اُسے بھی مختصراً اپنی پریشانی
کا احوال سنا دیا۔ نرگس میری باتیں سن کر بڑی رنجیدہ ہو گئی
جب تک میں اسے حالات بتاتا رہا وہ حیرت سے مجھے تکتی رہی
میں خاموش ہوا تو وہ بولی۔

"کیا آپ کو قوی امید ہے کہ آپ آنکا کو اس پنڈت سے
نجات دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے؟"

"خیال تو ہے۔ آگے قسمت میں جو لکھا ہے وہی ہوگا"

"جادو وغیرہ کا کھیل بہت برا ہوتا ہے" نرگس نے مجھے
سمجھاتے ہوئے کہا "کہیں ایسا نہ ہو کہ آنکا کو ایک مصیبت سے
نجات دلاتے دلاتے آپ خود کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائیں"

"سب کچھ ممکن ہے نرگس" میں نے بظاہر بڑے عزم
سے جواب دیا "لیکن اب خواہ کچھ ہی ہو میں آنکا کو ضرور اس
موذی پنڈت سے نجات دلا کر ہی دم لوں گا۔ چاہے مجھ پر کتنی
ہی تباہیاں کیوں نہ نازل ہوں"

"کیا آپ کو میرا کوئی خیال نہیں ہے"

"ہے کیوں نہیں مگر آنکا بھی میری محسن ہے۔ اس کے
احسانوں کو فراموش بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس نے میری مدد
نہ کی ہوتی اور امیر کبیر نہ بنایا ہوتا تو میں تمہیں بھی کبھی حاصل
نہ کر سکتا تھا"

"مگر اکثر موقعوں پر اسی آنکا نے آپ کے ساتھ ایسی
حرکتیں بھی کی ہیں جو انتہائی اخلاق سوز تھیں" نرگس نے
نظریں نیچی کئے کہا پھر یکلخت تیز ہو کر بولی "آپ یہ کیوں بھول
رہے ہیں جمیل کہ اسی آنکا کی وجہ سے آپ کا ایک ہاتھ بھی
ضائع ہوا ہے"

"مجھے سب معلوم ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں آنکا کو
ہر قیمت پر پنڈت کے چنگل سے بچانے کی کوشش کروں گا۔
خواہ اس کے لئے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ گنوانی پڑے"

"گویا آنکا آپ کو مجھ سے زیادہ عزیز ہے" نرگس کے

انگلستان میں انتخابات کا دور دورہ تھا جگہ جگہ انتخابی جلسے ہو رہے تھے۔ کنزرویٹو اور لیبر پارٹی میں سخت مقابلہ ہو رہا تھا۔ ایک حلقہ میں کنزرویٹو کا بڑا زور تھا، ان کا جلسہ بہت کامیاب رہا۔ کچھ دنوں بعد اسی جگہ لیبر پارٹی نے جلسہ کیا لیکن لوگوں نے سرد مہری کا اظہار کیا۔ لیبر پارٹی کا ایک پرجوش مقرر اپنی آتش بیانی سے حاضرین جلسہ میں جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن جب ناکام رہا تو اس نے حاضرین سے کہا۔" حاضرین! میں محسوس کرتا ہوں کہ اس جلسے میں کوئی کنزرویٹو موجود ہے۔"

"ایک بوڑھا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اقرار کرتے ہوئے کہا "بجا ارشاد۔ میں ہوں کنزرویٹو، فرمایئے کیا فرماتے ہیں۔"

لیبر پارٹی کے مقرر نے دریافت کیا " میں پوچھتا ہوں۔ آپ کنزرویٹو کیوں ہیں؟"

بوڑھے نے جواب دیا " میں اس لئے کنزرویٹو ہوں کہ میرا باپ کنزرویٹو تھا، میرا دادا کنزرویٹو تھا، میرے اسلاف کنزرویٹو تھے۔"

لیبر مقرر نے چبھتا ہوا سوال کیا " لیکن اگر آپ کے باپ دادا چور اُچکے ہوتے، ڈاکو ہوتے تو؟"

بوڑھے نے جواب دیا " تب پھر میں لیبر پارٹی میں ہوتا۔"

چہرے پر رقابت کی سُرخی پھیل گئی۔

"حماقت کی باتیں کیوں کرتی ہو نرگس" میں جھلّا کر بولا۔" انکا محض ایک تصوّراتی وجود ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہیں اس کے سلسلے میں کسی غلط قسم کے خیال کو ذہن میں جگہ نہیں دینی چاہیئے۔"

نرگس کو غالباً اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ ششدر سی میرا منہ دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ اس کی غزالی آنکھوں میں شکایت بھری ہوئی تھی مجھے اُمید نہیں تھی کہ نرگس انکا سے میری ہمدردی کو غلط رنگ دے گی اور مفت میں بیٹھے بٹھائے میری پریشانیوں میں اضافہ کرے گی۔ بہرحال جب میں نے اس کے تیور بدلے دیکھے تو اور بُرا لگا۔ میں خشک لہجے میں بولا۔

"میرا تو خیال تھا کہ تم پڑھی لکھی ہو۔ وسیع النظر بھی ہو گی، لیکن معلوم ہوا کہ رقابت کے جذبے کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

"مجھے بھی اس بات کا احساس آج پہلی بار ستا رہا ہے کہ آپ میرے مقابلے پر کسی اور کو ترجیح دے سکتے ہیں۔ نرگس نے ہونٹ چباتے ہوئے جلے کٹے لہجے میں جواب دیا تو میں اور بھڑک کر بولا۔

"تم جو چاہو سوچتی رہو۔ لیکن میں انکا کی مدد ضرور کروں گا۔"

نرگس نے بڑے غصے میں منہ کھولا۔ وہ جواب میں یقیناً کوئی سخت بات کہنا چاہتی تھی لیکن پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ مجھے اجنبی نظروں سے دیکھتی ہوئی تیزی سے اٹھی اور لمبے لمبے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر انکا کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں کچھ اس قدر انکا کی وجہ سے پریشان تھا کہ مجھے نرگس کی ناراضی کا بھی کوئی خیال نہ ہوا۔ لیکن نرگس کے بگڑ کر چلے جانے کے بعد انکا نے جو میری اور نرگس کی تمام گفتگو سُن چکی تھی مجھے مخاطب کر کے اداس لہجے میں کہا۔

"جمیل۔ تمہیں میری وجہ سے نرگس کو ناراض نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ تم سے کس قدر محبت کرتی ہے۔"

"اگر اُسے مجھ سے محبت ہوتی تو وہ تمہاری مدد کرنے سے مجھے کبھی منع نہ کرتی۔" میں نے جھلّا کر کہا۔

لپکی۔ لیکن تربینی کے قریب پہنچ کر اس سے ٹکرانے کے بجائے
فضا میں معلق ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے چاروں طرف سے بھیانک
شور وغل کی ایسی آوازیں ابھرنے لگیں جیسے لاتعداد ماورائی شیطانی
قوتیں غصے میں بپھر کر آپس میں ٹکرا گئی ہوں۔ ان آوازوں
کو سن کر مجھ پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ میں ڈر کر کئی قدم پیچھے
ہٹ گیا لیکن میری پھٹی پھٹی نظریں بدستور ہانڈی پر مرکوز تھیں
ٹھیک اسی لمحے اَلکا نے مجھے مخاطب کر کے خوفزدہ لہجے میں کہا
"جمیل۔ کھیل بگڑ گیا ہے! جادو کی ہانڈی اب ضرور
واپس ہو گی۔"

اَلکا کی بات سن کر میں سرتاپا لرز اٹھا۔ میرے ہوش و
حواس جاتے رہے۔ میں نے پلٹ کر بھاگنا چاہا لیکن میرے
پاؤں جیسے زمین پر جکڑ کر رہ گئے تھے۔ میرا سارا جسم خوف کے
مارے تھر تھر کانپ رہا تھا اور پیشانی سے بہنے والا پسینہ پیروں
تک پہنچ رہا تھا۔ میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ میں وہاں
سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن بھاگ نہیں سکتا تھا۔ کسی ان دیکھی طاقت
نے میرے پیروں میں جیسے بیڑیاں ڈال دی تھیں۔

بھیانک آوازوں کا شور وغل ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر
اچانک میرے کانوں سے ایک جانی پہچانی آواز ٹکرائی۔ میں نے
پلٹ کر دیکھا کہ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے
وحشت برس رہی تھی۔ مجھے دیکھے بغیر وہ بھاگتا ہوا منڈل
کے قریب گیا پھر چلا کر بولا۔

"دیا کالی مائی دیا۔ میں وچن دیتا ہوں کہ پھر کبھی سیوک
تیرے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ اس بار مجھے شما کر
دے۔"

بھگوان پرشاد عجیب کرب کی حالت سے دوچار تھا کبھی
وہ کالی مائی سے مخاطب ہو کر گڑگڑانے لگتا اور کبھی زمین پر
گر کر ڈنڈوت کرنے لگتا۔ مٹی کی ہانڈی ابھی تک تربینی کے
سر کے اوپر فضا میں معلق تھی اور شیطانی قوتوں کے شور وغل
کی آوازیں آنی بند ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک منمناتی ہوئی
عورت کی خوفناک آواز ابھری، جسے میں بالکل نہ سمجھ سکا۔
البتہ اس کے جواب میں بھگوان پرشاد نے گڑگڑا کر کہا۔

"مجھے سویکار ہے کہ میں نے تیرے داس کو کشٹ دینا چاہا تھا
مجھے پتا تھا کہ یہ کس شکتی کو پراپت کرنے کے لئے جاپ کر رہا
ہے۔ میرے من میں کھوٹ تھا۔ دیوی میں نے تیرے دشمن کے
ساتھ ملاپ کر کے تجھے دھوکا دیا ہے۔ مجھے شما کر دے دیوی
تیرا سیوک تیرے آگے ہاتھ باندھ کر تجھ سے دیا کی بھکشا مانگتا
ہے۔" بھگوان پرشاد رو رہا تھا اور لرز رہا تھا۔

عورت کی ناقابل فہم آواز دوبارہ ابھری پھر اچانک میری
نظر کوری ہانڈی پر پڑی جو تربینی کی طرف سے واپس آ رہی تھی
منڈل کے اندر اس کی رفتار سست تھی لیکن منڈل سے باہر
آتے ہی وہ بجلی بن کر بھگوان پرشاد پر گری۔ ہانڈی ٹوٹنے
کی آواز کے ساتھ ہی بھگوان پرشاد ایسے کربناک لہجے میں
چیخا کہ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پھر میں نے جو
کچھ دیکھا وہ ناقابل بیان منظر تھا۔ بھگوان پرشاد زمین پر پڑا
چلّا رہا تھا اور اس کے جسم سے بے شمار چھوٹے چھوٹے ناگ
لپٹے ہوئے تھے۔ میرے جسم کی حالت اس پودے کی مانند تھی،
جو زمین سے پھوٹتے ہی طوفان کی زد میں آ گیا ہو۔ میری
نظروں کے سامنے اندھیرے لپک رہے تھے میں نے بھاگنے
کی کوشش کی لیکن چکرا کر زمین پر گر پڑا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اپنی خوابگاہ میں
پایا۔ نرگس اُداس اور غمزدہ میرے سرہانے بیٹھی میری پیشانی
سہلا رہی تھی۔

"میں یہاں کس طرح آ گیا۔" میں نے اپنے حواس
مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

"جس وقت آپ گھر سے روانہ ہوئے تھے۔ میں نے احتیاطاً اپنے ایک ملازم کو آپ کے پیچھے روانہ کر دیا تھا تاکہ اگر آپ پر کوئی افتاد پڑے تو وہ آپ کے کام آسکے۔" نرگس نے مجھے بتایا۔ "وہی آپ کو مرگھٹ کے قریب سے بیہوشی کی حالت میں اٹھا کر لایا ہے۔"

میں نے نرگس کی بات کا جواب دینے کے بجائے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ذہن پر ابھی تک ہلکی ہلکی غنودگی طاری تھی۔ اپنی ناکامی کا صدمہ برداشت کرنا میرے بس سے باہر ہو رہا تھا۔ یہ احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا کہ اب انکا مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گی۔ تربینی کو جاپ مکمل کرنے میں میری معلومات کے مطابق صرف ایک دن اور باقی رہ گیا تھا۔ پھر میں کیا کروں؟ ۔ انکا کو بچانے کی خاطر کیا اقدام کروں؟"

میرا ذہن سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ پھر میرے ذہن پر دھند طاری ہو گئی۔ میں ایک بار پھر بیہوش ہو گیا۔ دوسری بار ہوش آیا تو دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ نرگس بدستور میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اس نے جلدی سے ایک دل آویز مسکراہٹ اپنے سوکھے ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا۔

"جمیل۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ آپ ایک دو روز تک مکمل طور پر رو بصحت ہو جائیں گے۔"

"نرگس۔" میں نے نقاہت سے کہا "کیا تم نے میری بیہوشی کی وجہ اپنے والدین کو تو نہیں بتائی؟"

"نہیں جمیل۔ آپ اس سلسلے میں بالکل فکر مند نہ ہوں۔"

میں نے نرگس کے معصوم چہرے پر نظر ڈالی پھر کچھ کہنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میرے سر پر انکا کے نوکیلے پنجوں کی چبھن تیز ہو گئی۔ میں اپنی بیہوشی کی وجہ سے انکا کو بالکل فراموش کر بیٹھا تھا۔ میں نے عالم تصور میں سر پر نظر ڈالی تو انکا کو بے انتہا مضطرب پایا۔ وہ پریشان پریشان سی کھڑی اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پایا تو بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"جمیل مجھے اجازت دو۔ میں اب تم سے جدا ہو رہی ہوں۔ ہمارا ساتھ اب چھوٹنے والا ہے۔ میں اب تربینی کی غلام بننے والی ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں۔" میں چیخ پڑا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا انکا میں تمہیں بچانے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔"

"اب سب بیکار ہے جمیل۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے سب بگڑ چکا ہے۔ اب کھیل ختم ہوا۔ بس میں کسی بھی لمحے تم سے جدا ہونے والی ہوں۔ میں مجبور ہوں جمیل۔ تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گے۔ میں جا رہی ہوں۔ مجھے مسکراتے ہوئے رخصت کرو۔"

میں نے انکا کے لہجے میں پہلی بار ایسی شدید مایوسی اور بیچارگی کی جھلک محسوس کی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔!!

پھر کیا ہوا؟

کیا انکا کا پر اسرار وجود جمیل احمد خان کے سر سے اتر کر تربینی کے جسم پر چلا گیا؟

جمیل احمد خان پر کیا بیتی؟ ۔ انکا کے پُراسرار وجود کی اس حیرت انگیز کہانی کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ تفصیلات کے لئے گیارھویں قسط ملاحظہ کریں۔



دوپہر کے بعد مجھے بہت سے کام کرنا ہیں!"

میں نے اپنا ہاتھ روک کر آہستگی سے دریافت کیا:

"کیا آج پھر فائرنگ ہوگی؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی کرنا پڑے گا لیکن اسقدر نہیں۔"

میں دوبارہ اس کے چہرے پر برش پھیرنے لگا ــ میرے ہاتھ ایک بار پھر کپکپا گئے جو میرے اندرونی خوف کا اظہار کر رہے تھے لیکن وہ میری کپکپاہٹ بھانپ نہیں سکا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ میری دکان پر نہ آتا تو اچھا ہوتا ــ اسے میرے کچھ ہم خیال ساتھیوں نے میری دکان پر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ لیکن گھر آئے ہوتے دشمن کے ساتھ کچھ اخلاقی بندشیں بھی ہوتی ہیں اس لئے میں بھی اس وقت کچھ ایسی ہی بندشوں میں اُلجھ کر رہ گیا ــ اب مجھے اس کی داڑھی کسی بھی دوسری داڑھی کی طرح بڑی چابکدستی اور احتیاط سے بنانی ہوگی اور خیال رکھنا ہوگا کہ خفیف سا کٹ بھی اُسے نہ لگے!

میں بھی دراصل چھپا ہوا باغی ہوں اور ساتھ ہی ایک باربر بھی! مجھے اپنے اس پیشے ہنرمندی اور مہارت پر ناز ہے اس لئے یہ چار روز کی بڑھی ہوئی داڑھی میرے لئے چیلنج تھی ــ میں نے استرا ہاتھ میں لیا۔ اُسے کھولا پھر ہاتھ کو اچھی طرح تولا اور ایک گال پر اُوپر سے نیچے چلانے لگا۔ استرا تیز تھا اس لئے بڑی روانی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے بال اگرچہ زیادہ لمبے نہ تھے لیکن خاصے گھنے اور سخت تھے ــ دھیرے دھیرے اس کی صاف اور چمکیلی جلد نمایاں ہونے لگی ــ استرا چلتا رہا اور اس سے سرسراہٹ کی وہ آواز نکلتی رہی جو استرے، ملائم جھاگ اور بالوں کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔

میں ایک لمحے کو استرے پر جمع شدہ جھاگ صاف کرنے کے لئے رُک گیا ــ ایک بار پھر میں نے اُسترے کو چمڑے پر گھس کر تیز کیا ــ بات یہ ہے کہ میں اُن باربروں میں سے ہوں جو اپنا کام انتہائی سلیقے سے کرتے ہیں۔ اب اُس نے بھی آنکھیں کھول دیں چادر سے ہاتھ نکال کر اپنے گال پر ہاتھ پھیرا جہاں میں شیو کر چکا تھا۔

"آج شام چھ بجے پھر اسی اسکول کے احاطے میں آجانا۔"

اس نے قدرے تحکمانہ لہجے میں کہا:

"کیا پھر وہی ہولناک منظر دہرایا جائے گا؟"

"ہاں ــ!" اس نے جواب دیا:

"آپ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں لیکن سارا تماشا ہوگا قابل دید!"

"کیا آپ اُن سب کو قتل کریں گے ــ؟"

"بیشک ان سب کو موت کے گھاٹ اتارا جائے گا!"

صابن کے جھاگ اب اس کے چہرے پر سوکھنے لگے تھے اور اسی کی مجھے جلدی تھی۔ میں نے دکان سے باہر ایک نظر ڈالی اور گلی کا جائزہ لیا ــ روزمرّہ کی طرح سڑک پر ویسی ہی چہل پہل تھی۔ سامنے کی دکان پر دو تین گاہک کھڑے تھے۔ پھر میں نے دکان میں ٹنگے ہوئے وال کلاک کی جانب دیکھا ــ دو بج کر بیس منٹ ہوتے تھے میں نے اب دوسرے گال پر استرا چلانا شروع کیا جو رفتہ رفتہ بالوں سے صاف ہو رہا تھا۔ میں سوچنے لگا اگر یہ اپنی داڑھی کو اسی طرح بڑھنے دے جس طرح کچھ شاعر، آرٹسٹ یا پادری وغیرہ بڑھا لیتے ہیں تو وہ اس کے سُرخ و سپید چہرے پر بہت دلکش دکھائی دے گی ــ یہ خیال مجھے اس وقت آیا جب میں اس کی گردن والا حصہ صاف کر رہا تھا جہاں استرے کو بہت احتیاط اور دیکھ بھال کے ساتھ چلانا پڑتا ہے۔ اس کی گردن پر

بال چھوٹی چھوٹی جھونپریوں میں اُگے ہوتے تھے اور کسی قدر خمدار بھی تھے ۔ ہاتھ کی ذراسی لغزش سے جلد کے کٹ جانے کا اندیشہ تھا اور مجھ جیسا باربر اس قسم کی لغزش بالکل برداشت نہیں کرسکتا۔ کم ازکم اپنے خاص گاہکوں کا شیو بناتے وقت میں بے حد محتاط رہتا ہوں اور یہ کپتان تو اول درجے کا گاہک تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو ہم میں سے متعدد لوگوں کے قتل کا حکم دے چکا تھا اور ابھی ہم میں سے کتنوں کے خون کا پیاسا تھا!

بہرحال، اب اس حالت میں یہ سوچنا ہی بیکار تھا۔ کپتان تاریس کو تو اس بات کا علم ہے ہی نہیں کہ میں اس کا دشمن ہوں یہ بھی اچھا ہی ہے کہ میری دشمنی کا علم نہ اس کو ہے اور نہ اس کے ساتھیوں کو! بہت کم لوگ اس راز کو جانتے تھے۔ میں بڑی آسانی سے اپنے ساتھیوں کو خبر دے سکتا تھا کہ کپتان تاریس کیا کر رہا ہے اور آئندہ اس کا کیا پلان ہے، مگر اپنے ساتھیوں کو اس بات کا یقین دلانا اور اپنی صفائی پیش کرنا میرے لئے بہت مشکل تھا کہ وہ میرے قابو میں آیا اور شیو بنوا کر زندہ و سلامت واپس چلا گیا۔

اب اس کا شیو تقریباً بن چکا تھا، وہ پہلے کی نسبت خاصا اسمارٹ اور کم عمر معلوم ہو رہا تھا۔ میرا خیال ہے یہ احساس ان سب لوگوں کو ہوتا ہے جو باربر سے شیو بنواتے ہیں۔ میرے اُسترے کی صفائی سے کپتان تاریس تازہ دم ہو گیا۔ ظاہر ہے اس نے شہر کے مشہور باربر سے شیو بنوایا تھا۔

اب شاید گرمی بڑھتی جا رہی ہے، میرا خیال ہے کپتان کو بھی میری طرح پسینہ آ رہا ہوگا، مگر وہ تو میری طرح گرمی اور پسینے سے بے چین نظر نہیں آتا۔ اور انتہائی پُرسکون انداز میں کرسی پر اپنی پشت لگائے بیٹھا ہے ۔۔۔ اور ایک میں ہوں استرا میرے ہاتھ میں ہے۔ جس کو جبڑے پر بار بار گھس رہا ہوں ۔۔۔ خون پھوٹ نکلنے کے خطرے سے سہما ہوا ہوں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر بیٹھا ہوں۔



میں ایک انقلابی ہوں، متشدد پسند نہیں۔ اس وقت اس شخص کو قتل کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن کیا واقعی؟ کیا یہ ناانصافی نہ ہوگی؟ یہ حق کسی کو نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کی خاطر قتل کرے۔ اس سے کیا حاصل ہے؟ کچھ بھی نہیں! ایک کو قتل کرنے کے بعد اور بھی کتنے قتل کے لائق نظر آنے لگتے ہیں اور پھر ان کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے یہاں تک کہ خون کی ندیاں بہنے لگتی ہیں!

میں پل بھر میں اس کا گلا کاٹ سکتا ہوں، اس پھرتی کے ساتھ کہ اس کو شکایت کا موقع بھی نہ ملے گا! اور یوں بھی اس وقت اس نے اپنی آنکھیں مُوند رکھی ہیں۔ وہ اس وقت میرے اُسترے کی تیز دھار اور میری آنکھوں کی چمک دیکھنے سے قاصر ہے! ۔۔۔ لیکن مجھے یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں تو واقعی ایک بزدل شخص کی طرح کانپ رہا ہوں ۔۔۔!

اس کی گردن سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑے گا اور خون چادر پر، کرسی پر، میرے ہاتھوں پر اور فرش پر پھیل جائے گا ۔۔۔ پھر خون کا نشان مٹانا مشکل ہو جائے گا۔ خون فرش پر بہتا ہوا دکان کے باہر پہنچ جائے گا۔!

مجھے یقین ہے کہ ایک ہی بھرپور ہاتھ اس کا کام تمام کرسکتا ہے، اس کو کسی طرح کی تکلیف بھی نہیں ہوگی لیکن میں اس کی لاش کا کیا کروں گا؟ اس کو کہاں چھپاؤں گا، کیسے چھپاؤں گا؟ یا مجھے اپنا سب کچھ یہاں چھوڑ کر کسی دور دراز علاقے میں فرار ہونا پڑے گا اور فوراً ہی میرا پیچھا کیا جائے گا اور مجھے گرفتار کر لیا جائے گا۔ مجھے کپتان تاریس کا قاتل کہا جائے گا اور لوگ مجھے لعنت ملامت کرینگے

مجھے کمینہ اور بزدل کہیں گے جس نے شیو بنانے کی آڑ میں قتل کر دیا۔

لیکن ہماری جانب سے کیا ہوگا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کے قتل کا انتقام لینے والا کہا جائے گا۔ میرا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روشن ہو جائے گا۔ لوگ کہیں گے کہ وہ تھا تو ایک نائی مگر ہمارے آدرشوں کا پاسبان رہا ــــ قاتل یا ہیرو ؟

میری قسمت اس وقت اُسترے کی تیز دھار سے لکھی جا سکتی ہے۔ اگر میں اُسترے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ کچھ اور تیز کر دوں تو وہ اس کی جلد کو چیرتا ہوا نیچے تک اتر جائے گا اور حجامت شدہ صاف جلد پر تو یہ ایسا چلے گا جیسے ریشم پر چل رہا ہو ــ ! اس کے علاوہ اس اُسترے کی کاٹ کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ یہ میرا بہترین اُسترا ہے !

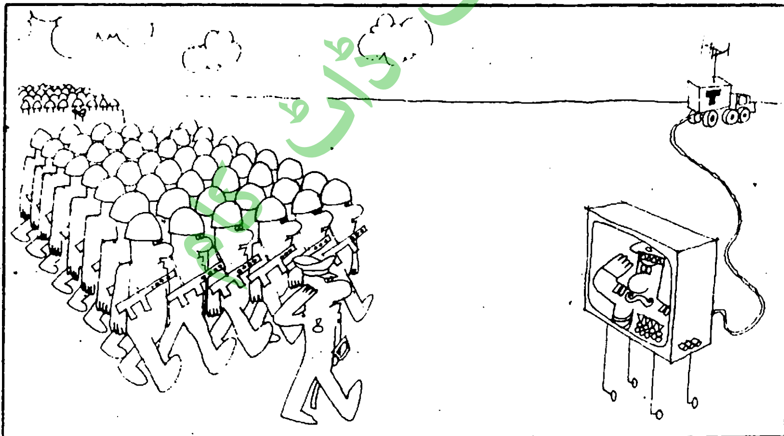
لیکن نہیں ! میں خود کو قاتل نہیں کہلانا چاہتا۔ ہرگز نہیں کسی قیمت پر نہیں ! آپ میرے ہاں شیو بنوانے آتے ہیں اور مجھے اپنا کام انتہائی سلیقے اور ایمانداری سے انجام دینا ہے ــــ میں اپنے ہاتھ کسی کے خون سے رنگنا نہیں چاہتا ــــ ہرگز نہیں، میرا کام تو حجامت بنانا ہے اور بس ! آپ سرکاری احکام جاری کرنے والے اور میں ایک نائی ــــ ! اس دُنیا میں ہر شخص کا الگ الگ رول ہے ــ

اب اس کی ٹھوڑی کے آخری بال بھی صاف ہو چکے تھے وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا ــــ اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ پھر چہرے پر ہاتھ پھیرا ــــ "تھینک یو" کہتے ہوئے وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو اور کھونٹی کی جانب بڑھا ــ اپنی ٹوپی، پستول اور گولیوں کی پیٹی اتاری ــــ ادھر میرا خوف و ہراس کے مارے بُرا حال تھا۔ پسینے سے میری قمیص بالکل تر ہو چکی تھی ــــ !

کپتان ٹارس نے اپنا پستول اور پیٹی باندھی، بٹنوں کے بکسوئے کسے، بالوں کو جھٹک کر سیدھا کیا اور ٹوپی سر پر رکھی پتلوا کی جیب سے کئی چمکتے ہوئے سکے نکالے اور میرے ہاتھ میں تھما کر دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ــــ وہاں پہنچ کر وہ یکایک رُکا اور میری طرف پلٹ کر بولا :

"گویا تم مجھے قتل نہیں کر سکے ــ لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم مجھے قتل کر دوگے اور میں یہی جاننے کے لئے یہاں آیا تھا ــــ اب تم میرے کہنے پر یقین کر لو کہ قتل کرنا کوئی کھیل نہیں ــــ قتل کرنا اتنا آسان نہیں ہے !!"

اور یہ کہہ کر وہ سامنے گلی میں مڑ گیا۔



خوش ذائقہ

بیگم بلقیس جہاں ناصر الدین خان



قیمت
۱۲/۵۰ روپے

ناشر:
ایلیٹ پبلشرز لمیٹڈ

تمام کتب فروش اور النور انٹرپرائزز سیلز آفس ۱۵۴ چندریگر روڈ کراچی